(جلد دوم)

روبرو

علمی، ادبی و عصری مسائل پر نامور ادبا، محققین اور ناقدین سے گفتگو

خوشتر نورانی

ادارۂ فکر اسلامی، دہلی

Rubaroo(Volume:2)
By:Khushtar Noorani
First edition: November 2010
Price:

Idara-e-Fikre Islami,Delhi
Distributed by:Maktaba Jaam-e-Noor
422 Matia Mahal,Jama Masjid,Delhi-6
Phone:011-23281418
email: ifikreislami@gmail.com

انتساب
مولانا یٰسین اختر مصباحی
کے نام
جن کا متوازن تحریری اور صحافتی سفر نئی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہے

فہرست

باسمہ تعالیٰ

اظہاریہ

مسلم صحافت کی تاریخ پونے دوسو سال پرانی ہے، اس طویل عرصے میں اپنی تمام تر جد و جہد اور صحافتی تقاضوں کی تکمیل کے باوجود اسے کبھی بھی وہ عروج حاصل نہیں ہوسکا جو دوسری قوموں کی صحافت کا مقدر ٹھہرا۔ ان پونے دوسو سالوں میں ذرائع ابلاغ کا دائرۂ کار وسیع تر ہوتا گیا، لیکن مسلم صحافت غیر منقسم ہندوستان سے مسلم سماج اور اس کے بعد مسلمانوں کے مذہبی یا اردو پسند حلقوں میں سمٹتی چلی گئی۔ ان گزرے ہوئے سالوں میں کبھی کسی تحریک یا جذبے کے زیر اثر مسلم صحافت کا دائرہ وسیع ہوتا ہوا دکھا بھی تو صرف اس وقت تک جب تک مذکورہ تحریک یا جذبے میں حرارت باقی رہی۔ ان کی یخ بستگی کے ساتھ ہی مسلم صحافت کی یہ وسعت سمٹ کر پھر اپنے محور پر گردش کرنے لگی۔ آگے چل کر مسلم صحافت کے بطن سے ہی مسلمانوں کی مذہبی صحافت نے بھی اپنے بال و پر نکالے، لیکن بہ استثنائے چندان کے ذمہ داران کی صحافتی تقاضوں سے بے خبری مذہبی رسالوں کو طویل زندگی نہیں دے سکی اور اگر وسائل کی فراوانی نے کسی کو لمبی عمر تک زندہ بھی رکھا تو اسے عوام کی جانب سے قبولیت کا خلعت عطا نہیں ہوسکا۔

مذہبی صحافت کی عدم مقبولیت نے ہی شاید مؤرخین کو اس کی مبسوط تاریخ لکھنے سے بے پروا رکھا، ناقدین نے اس کے محاسن و معائب پر گفتگو نہیں کی اور محققین نے اس کے لیے اپنی بساط تحقیق نہیں بچھائی۔ دنیا کی مختلف قوموں اور زبانوں یہاں تک کہ مسلم صحافت

کی تاریخ اور عروج و زوال پر بھی ہمیں کثیر سرمایہ ملتا ہے، جب کہ مذہبی صحافت کی تاریخ، اس کے عناصر و اسالیب، رجحانات اور محاسن و معائب پر مشتمل چند مبسوط علمی و تحقیقی مضامین بھی نہیں ملتے- کسی بھی ترقی یا زوال کے دو بنیادی عناصر ہوتے ہیں: ایک داخلی اور دوسرا خارجی- داخلی عناصر کا تعلق صلاحیت، پیش کش اور طریق کار سے ہوتا ہے، جب کہ خارجی عناصر حالات اور ماحول پر مشتمل ہوتے ہیں- ترقی کا مدار دونوں عناصر کی صحیح تنظیم و ترتیب پر ہے، ان میں سے کسی ایک کی ناہمواری زوال اور نامقبولیت کا باعث بن جاتی ہے- عام مسلم صحافت اور مسلم مذہبی صحافت کی تاریخی کڑیوں کو مختلف ادوار میں جوڑنے کی کوشش کی جائے تو ہر دور میں ذرائع ابلاغ کے ہمہ گیر اثرات کے باوجود دونوں کی نامقبولیت کو مذکورہ نکتے میں دیکھا جاسکتا ہے-

مسلم صحافت کے داخلی عناصر تو ہر دور میں صحیح رہے، لیکن بدقسمتی سے اس کے دائرۂ اثر کو خارجی عناصر نے کبھی وسیع اور ہمہ گیر ہونے کا موقع نہیں دیا، یہ خارجی عناصر مختلف زمانے میں مختلف رہے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱- انگریزی سرکار کی سیاسی قلابازیاں
۲- ۱۸۵۷ء کے المناک حادثے
۳- لسانی تعصب
۴- ہندؤں اور مسلمانوں کا مذہبی اور معاشرتی تناؤ
۵- تقسیم ہند
۶- اردو زبان کا اسلامائزیشن
۷- تقسیم ہند کے بعد اقلیتی اور اکثریتی مفادات پر حکومتوں کا جانب دارانہ رویہ

جب کہ مذہبی صحافت سے عوام کی عدم دلچسپی کا سبب خارجی عناصر کے ساتھ داخلی عناصر بھی رہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱- پیش کش کا روایتی طریق کا
۲- Outdated موضوعات کا انتخاب

۳- عصری مفاہیم اور اسالیب سے بے خبری
۴- صحافتی اصول سے ناآشنائی
۵- فروعی مسائل پر جنگ وجدال
۶- رسائل کی اشاعت میں وقت، محنت اور توجہ کی کمی
۷- صحافت کی اہمیت واثرات سے غفلت

برصغیر میں مسلم صحافت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا دور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۵۷ تک، دوسرا دور ۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۰ء تک، تیسرا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک اور چوتھا دور ۱۹۴۸ء سے تاحال- جبکہ مذہبی صحافت کا آغاز ۱۸۷۰ء سے ہوتا ہے-

مسلم صحافت کے پہلے دور میں مسلمانوں کی مذہبی صحافت کی بات کی جائے، جس میں عموماً مذہبی امور پر مسلمانوں کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے، اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت ہوتی ہے اور مذہبی وملی مسائل کا تاریخی وتجزیاتی مطالعہ ہوتا ہے، مسلم صحافت کے اس پہلے دور میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا- حیرت کی بات ہے کہ انگریزوں نے اپنی طاقت کے ابتدائی مرحلے میں ہی عیسائیت کی تبلیغ کا آغاز مختلف شعبوں سے کر دیا تھا جس میں صحافت بنیادی کردار ادا کر رہی تھی، لیکن مسلمانوں کی جانب سے کوئی مجلّہ یا رسالہ شروع نہیں کیا گیا، حالانکہ ردعمل میں اس کام کا آغاز ناگزیر تھا- اس کے علاوہ ۵۷ء سے پہلے ملک کے سیاسی حالات بھی ایسے نہیں تھے جیسا کہ اس کے بعد ہوئے، مادی انقلاب نے ہندوستان کے دروازے پر دستک بھی نہیں دی تھی اور نہ ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تپش کو کسی ''ازم'' نے ٹھنڈا کیا تھا- یہ سچائی ہے کہ اس وقت مسلمان سیاسی سطح پر جوجھ رہے تھے مگر مسلم دشمنی کی ایک بڑی وجہ ان کے مذہبی اور ایمانی معاملات بھی تھے- انگریزوں کے ذریعے فارسی زبان کے خاتمے کی کوشش اور اسلامی علوم وفنون کو مٹانے کی جدو جہد اسلام دشمنی کے روشن استعارے تھے-

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر دین کی رہنمائی اور اشاعت اس کے علما ہی کرتے ہیں، اسلام

کا استحکام اور تبلیغ بھی علمائے شریعت کے ذریعے ہی ہوتی رہی ہے- حیرت ہے کہ برصغیر میں مسلم صحافت کے آغاز اور عروج میں علما نے ہی کمان سنبھالی، لیکن اپنے پہلے صحافتی دور میں انھوں نے ہی مذہبی صحافت کو بالکل نظر انداز کر دیا، دوسرے لفظوں میں صحافت کے ذریعے اسلام کے استحکام وتبلیغ کی کوشش سے پہلو تہی کی گئی- مسلم صحافت کا آغاز وارتقا اگر علما کے ذریعے نہیں ہوا ہوتا تو یہ شکایت اتنی برمحل نہیں ہوتی جتنی مذکورہ حالت میں ہو جاتی ہے- یہ شکایت اس وقت اور بھی بامعنی ہو جاتی ہے جب یہ تکلیف دہ تاریخ سامنے آتی ہے کہ اس وقت علماء کا ایک بڑا طبقہ منقولات اور دینی وملی ضرورتوں سے صرف نظر کر کے یونانی فلسفے کی درس وتدریس اور عقول عشرہ، خرق والتیام فلک اور جزء الذی لا یتجزیٰ کے رد وابطال میں مصروف تھا- قدیم فلسفے کی تردید پر مشتمل ان لاحاصل مصروفیات کا ایک عظیم دفتر آج بھی بطور یادگار لائبریریوں میں محفوظ ہے- ستم یہ ہے کہ علما کی تدریس کا ایک بڑا حصہ آج بھی ان کے بطلان پر صرف ہو رہا ہے، حالانکہ برصغیر میں نہ اس وقت مذکورہ نظریات کا کوئی پرستار تھا اور نہ آج کوئی ان کا حامی وموید ہے- ایسے میں یہ سوال اپنی پوری توانائی کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے کہ مذہبی حلقے میں یونانی فلسفے کے تردید وابطال کی یہ ہنگامہ آرائیاں کیوں اور کس کے لیے تھیں؟ ہزار کوششوں کے باوجود بھی میں آج تک اس کا کوئی تسلی بخش جواب اپنے آپ کو دے کر مطمئن نہیں کر سکا- یہ بات بھی بڑی حیران کن ہے کہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ہی یوروپ کے اندر برپا ہونے والے جدید سائنسی انقلاب نے یونانی فلسفے کو رد کر دیا تھا اور اس کے بالمقابل ڈارون ازم، مارکسزم اور فرائڈ کے جنسی فلسفے کی بنیاد رکھ دی گئی تھی، جو براہ راست مذہبی افکار وعقائد سے متصادم تھے اور بشمول برصغیر دنیا کے بڑے خطے کے ذہن وفکر کو تہ وبالا کر رہے تھے، مگر یوروپ کا یہ جدید فلسفہ نہ اس وقت علماء کی دلچسپی کا موضوع تھا اور نہ آج ہے- ممکن ہے دو سو سالوں کے بعد جب کسی نئے فلسفے کی بنیاد پڑے تو وہ یوروپ کے مذکورہ نظریات کی تدریس وتردید کی طرف متوجہ ہوں-

مسلم صحافت کے پہلے دور کی طرح دوسرے دور میں بھی مذہبی صحافت کا نام ونشان

نظر نہیں آتا، سوائے اس کے کہ کچھ اخبارات ورسائل کبھی کسی شمارے میں اپنی مضامین شائع کر دیا کرتے تھے- سرسید کے اخبار کے علاوہ دوسرے دور کی پوری مسلم صحافت پہلے پہل صحافت برائے صحافت پر عامل رہی، لیکن اپنے اخیر دور میں اس کی پوری توجہ آزادی وطن کی جد وجہد پر مرکوز ہو گئی- یہ صحیح ہے کہ دوسرے دور میں مسلم صحافت کا مرکزی موضوع آزادی وطن رہا اور یہ بھی سچ ہے کہ اس دور میں مذہبی صحافت کہیں نظر نہیں آتی، لیکن میری رائے میں باقاعدہ مذہبی صحافت کا آغاز اسی دور سے ہوتا ہے- یہ الگ بات ہے کہ اس آغاز کو وسعت نہیں مل سکی-

برصغیر میں صحافت کی مفصل تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے ہی مذہبی صحافت کی بنیاد رکھی اور ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء میں علی گڑھ سے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا- اس رسالے کا مقصد مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور ان کی معاشرت کی اصلاح تھی- سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے پہلے ہی شمارے میں ''تمہید'' کے زیر عنوان اپنے مقصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''بس ہمارا مطلب ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اس مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہو سکے ان کے دین ودنیا کی بھلائی میں کوشش کریں-'' (ص:۱)

اس رسالے کے تعلق سے محمد افتخار کھوکھر نے تاریخ صحافت میں لکھا ہے کہ:

''تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا- اس اخبار نے مسلمانوں کو فرسودہ روایات، رسومات کی اندھا دھند تقلید ترک کرنے کا مشورہ دیا، مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنی زندگیوں میں اسلام کو رائج کریں، لڑکیوں کے لیے بھی تعلیم کا انتظام کریں اور ہر قسم کے علوم وفنون سے استفادہ کریں-''

(ص:۸۳/ مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان)

یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ تہذیب الاخلاق کی بے پناہ شہرت ومقبولیت کے باوجود اس صدی کے آخر تک مذہبی صحافت کا کوئی دوسرا نقش سامنے نہیں آسکا، اس عرصے

میں اگر کوئی مذہبی رسالہ جاری ہوا بھی ہوگا تو اس کی عدم مقبولیت تاریخ صحافت میں اپنا اندراج نہیں کرا سکی۔ مسلم صحافت کے پہلے دور کی طرح دوسرے دور میں بھی مسلم صحافیوں اور علماء کی سرگرمیوں کے موضوعات اور ان کی ترجیحات مختلف تھیں، جن میں مذہبی صحافت کی گنجائش نہیں تھی، جس کا خمیازہ مؤرخین کی بے اعتنائی، عوام کی عدم دلچسپی اور نامقبولیت کی شکل میں مذہبی صحافت آج تک بھگت رہی ہے، جب کہ اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا یہ ایک بڑا اور مؤثر ذریعہ ہوسکتا تھا۔ سرسید نے اس نوشتہ دیوار کو پڑھ لیا اور مذہبی صحافت کے ذریعہ مسلم سوسائٹی میں ذہنی وفکری انقلاب برپا کردیا۔ آج اسی کا نتیجہ ہے کہ برصغیر کی اصلاحی، صحافتی، ادبی اور تعلیمی تاریخ کے حوالے سے مؤرخین، محققین اور لکھنے والوں کی کوئی بات سرسید کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

مذہبی صحافت کے آغاز وارتقا میں سرسید کے نمایاں کردار کے اعتراف کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ انہوں نے اپنی مذہبی صحافت اور مذہبی تحریروں کے ذریعے دین کی جو تعبیر وتشریح پیش کی وہ ''اعتزالی فکر'' کی نئی شکل تھی، جو امت مسلمہ کے شدید مذہبی انحرافات کا سبب بن گئی۔ سرسید کی تعلیمی، صحافتی اور اصلاحی میدانوں میں گرانقدر خدمات کے باوجود علما سے ان کے شدید اختلافات کی وجہ مذکورہ تعبیر وتشریح ہی تھی۔ یہ نظریاتی اختلافات آگے چل کر ان کی تعلیمی، اصلاحی اور صحافتی تحریکوں پر بھی براہ راست اثر انداز ہوئے۔ سرسید کی مذہبی تشریحات اور امت مسلمہ پر ان کے اثرات کے حوالے سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ اقتباس قابل مطالعہ ہے:

''سرسید کے کام کو اصلاح اور تنقید عالی کے الفاظ سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ مسلمانوں میں ان کے بعد جتنی اہم مذہبی، سیاسی، اجتماعی، ادبی، تعلیمی تحریکیں اٹھی ہیں ان سب کا سررشتہ کسی نہ کسی طرح ان سے ملتا ہے، دراصل مبالغہ کی حد سے متجاوز ہے۔ سچ یہ ہے کہ ۵۷ء کے بعد سے اب تک جس قدر گمراہیاں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں ان سب کا شجرۂ نسب بالواسطہ یا بلاواسطہ سرسید کی ذات تک پہنچتا ہے، وہ اس سرزمین میں تجدد کے امام اول تھے اور پوری قوم کا مزاج بگاڑ کے دنیا سے رخصت ہوئے۔'' (ترجمان القران، شوال

۱۳۵۹ھ بحوالہ مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف، مولانا منظور نعمانی، ص:۹۲، مطبوعہ الفرقان بک ڈپو لکھنؤ)

مسلم صحافت کے تیسرے دور کو انقلابی عہد کہا جاسکتا ہے اس دور میں مسلم صحافت اپنے عروج پر تھی۔ اس دور میں اگر مذہبی صحافت کی بات کی جائے تو بیسویں صدی کے آغاز سے مذہبی صحافت کا باقاعدہ اجرا اور برصغیر کے مختلف خطوں سے اس کی اشاعتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس عرصے میں ۱۹۴۷ء تک تقریباً ڈیڑھ سو مذہبی رسائل وجرائد کا سراغ ملتا ہے۔ مسلم صحافت کے اس تیسرے دور میں مولانا آزاد کے ''الہلال'' کو اگر مذہبی صحافت کے زمرے میں لایا جائے تو اس کے علاوہ کوئی بھی مجلّہ یا رسالہ شہرت اور مقبولیت کی اس بلندی تک نہیں پہنچ سکا جہاں تک الہلال کے رسائی تھی۔ جہاں تک اس دور کی مذہبی صحافت کی افادیت کا تعلق ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اس ڈیڑھ سو رسائل کی فہرست میں ایسے کئی رسائل اور مجلّات سامنے آئے جو اپنے اپنے حلقوں میں مسلمانوں کی دینی وشرعی رہنمائی کا ذریعہ بنے نیز ان کے ذریعے بالواسطہ اردو زبان کا فروغ بھی ہوا، کیونکہ اس دور میں فارسی زبان عملی طور پر ختم ہوچکی تھی اور جتنے بھی رسائل وجرائد منظر عام پر آرہے تھے وہ سب کے سب اردو میں تھے۔ ان میں قاضی عبدالوحید فردوسی کا ماہنامہ تحفۂ حنفیہ، پٹنہ (۱۹۰۸ء) اور مفتی عمر نعیمی کا السواد الاعظم، مرادآباد (۱۹۱۸ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے تحریک ندوہ کے مسلکی اشتراک واتحاد کی پالیسی کے خلاف اہل سنت و جماعت کی طرف سے بنیادی کردار ادا کیا جبکہ موخر الذکر نے قیام پاکستان کی تحریک میں اپنے مشمولات اور فکرانگیز مضامین کے ذریعے نمایاں حصہ لیا۔ لیکن پہلا قاضی عبدالوحید کے انتقال کے بعد اور دوسرا تقسیم ہند کے بعد جاری نہ رہ سکا۔ ان کے علاوہ اس دور کے مذہبی رسائل وجرائد میں ہفت روزہ الفقیہ، امرتسر (۱۹۱۸ء) ماہنامہ ترجمان القرآن، حیدرآباد (۱۹۳۲ء) ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (۱۹۱۶ء) اور ہفت روزہ پیغام، کلکتہ (۱۹۲۱ء) کافی اہم تھے اور اپنے مشمولات اور اثرات کے اعتبار سے تمام معاصر رسائل پر فوقیت رکھتے تھے لیکن جب بات صحافت کے وسیع اثرات کی کی جائے تو اس بات کو بھی ماننا ہوگا کہ اس دور

میں کوئی بھی مذہبی مجلّہ یا رسالہ وسیع پیمانے پر مسلم معاشرے میں قابل ذکر اثرات قائم نہیں کر سکا۔ اس کی بنیادی وجہ ''داخلی عناصر'' (جس کی تفصیل ابتدا میں بیان کر دی گئی) کی بے ترتیبی کے ساتھ ''مسلمانوں کی مسلکی تقسیم'' بھی تھی۔

برصغیر کی مسلم تاریخ میں محققین کے ذریعے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان مسلکی فرقہ بندی کی ابتدا شاہ اسماعیل دہلوی (۱۷۷۹/۱۸۳۱ء) کے ذریعے ہوئی، جب انھوں نے ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴/۲۵ء) میں 'تقویۃ الایمان' نامی کتاب لکھی۔ اس کتاب کی اشاعت سے قبل مسلمانوں میں دو ہی فرقے مشہور تھے، ایک شیعہ اور دوسرا سنی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد مختلف ادوار میں متعدد فرقے وجود میں آئے، جیسے وہابی، اہل حدیث، اہل قرآن، دیوبندی، چکڑالوی، نیچری وغیرہ۔ ہر فرقہ اصول اور فروع میں خاص نظریات کا حامی و داعی تھا۔ اس طرح مسلمانان ہند مختلف فرقوں اور مسلکوں میں بٹتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی یہ مسلکی تقسیم صرف نظریاتی اور فکری سطح تک محدود نہیں رہی، بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک انسٹی ٹیوشن کی شکل میں جتنے مدارس وجود میں آئے، مساجد تعمیر ہوئیں، تنظیمیں اور تحریکیں تشکیل پائیں، کتابیں لکھی گئیں ان سب پر مسلکی رنگ غالب رہا، کیونکہ ہر سطح اور ہر محاذ سے اپنے اپنے مسلک کی تبلیغ اور دفاع کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اس ماحول میں جب مذہبی صحافت کی ابتدا ہوئی تو مسلکی تقسیم کا اثر اس پر بھی پڑا۔ کسی بھی مسلک کے صحیح یا غلط اور اس کے حق تبلیغ و دفاع کی بحث سے قطع نظر اس دور کے تمام مذہبی رسائل اپنے اپنے مسلک کی نمائندگی کر رہے تھے، اس لیے ان میں سے کوئی ایک بھی امت کا رسالہ نہیں بن سکا۔ مذہبی صحافت کی یہ مسلکی تقسیم اس کی عام مقبولیت، توسیع اور اثرات میں رکاوٹ بن گئی، اس لیے کہ ہر پرچہ اپنے خاص مسلکی نظریات کے ساتھ صرف اپنے ہی حلقے میں پڑھا جا رہا تھا۔ یہ بات بالکل قطعی ہے کہ ہر چیز کے کچھ اپنے تقاضے اور اصول ہوتے ہیں، جن کی پاسداری ضروری ہوتی ہے۔ صحافت کے بھی اپنے تقاضے اور اصول ہیں، جس کو حد سے زیادہ نظریاتی تسلط، تقسیم، ادعائیت، موضوعیت اور جانب داریت راس نہیں آتی۔

۱۹۴۷ء کے بعد مسلم صحافت کے آخری دور میں اگر مذہبی صحافت کی بات کی جائے تو اس کی اشاعت و اثرات کو دیکھ کر بہت خوشی نہیں ہوتی۔ ۱۹۴۷ء سے قبل مذہبی صحافت کی جو داخلی اور خارجی صورت حال تھی، وہ ۱۹۴۷ء کے بعد مزید بگڑتی چلی گئی اور جو اہم مذہبی رسائل و جرائد تھے، وہ یا تو بند ہو گئے یا پھر تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ برصغیر کے مذہبی کینوس پر مسلکی تقسیم کا رنگ جب مزید گہرا ہوا تو مذہبی صحافت کا دائرۂ اثر بھی بہت محدود ہوتا چلا گیا۔ اب ہمیں اگر مذہبی صحافت کی اشاعت، اثرات اور مشمولات کا جائزہ لینا ہو تو انہیں مسلکی خانوں میں تقسیم کر کے ہی لیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کی یہ تمام صورت حال کے باوجود اگر مذہبی صحافیوں نے اس کے داخلی عناصر پر توجہ دی ہوتی تو آج مذہبی صحافت کا رنگ ہی الگ ہوتا، کیوں کہ بقول شخصے دنیا میں دو ہی چیزیں قابل فروخت ہیں، ایک جنسیات اور دوسری مذہبیات۔ دراصل انسان مجموعہ ہے جسم اور روح کا۔ اس کی جسمانی طلب کی انتہا اگر جنسی لذتوں کا حصول ہے تو روحانی تسکین کا ذریعہ مذہب۔ اس لیے مذہبی صحافت سے عوام کی عدم دلچسپی، اس کی محدود اشاعت، مختصر زندگی اور بے ثمری کا ٹھیکرا عوام اور صحافت کے ''مذہبی عنوان'' کے سر پھوڑنے کی بجائے اپنے رویوں پر غور کرنا چاہیے۔ اپنا محاسبہ انہیں یہ احساس ضرور دلائے گا کہ ہائی ٹیک ذرائع ابلاغ کی موجودہ صدی میں مذہبی رسائل کی پیش کش کا طریق کار کتنا پرانا ہے۔ سائنسی انقلاب کے ذریعے مادیت اور صارفیت کا جو سیلاب آیا ہے وہ مذہب، روحانیت اور انسانیت کو نگلنے کے لیے بے تاب ہے۔ جس سے معاشرے میں بے شمار جدید مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ان جدید مسائل سے منہ پھیر کر مذہبی صحافت کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا جا رہا ہے، وہ کتنا غیر مفید اور بے فیض ہے۔ موجودہ صدی میں صحافت کو مؤثر ترین بنانے کے لیے ترسیل کی زبان کو دلچسپ، معروضی اور عام فہم بنانے کی کوشش تیز تر ہوتی جا رہی ہے، جب کہ مذہبی صحافت کا اسلوب کتنا پیچیدہ اور فہم سے بالاتر ہے۔ مسلمانوں کی معاشی، تعلیمی اور سماجی مسائل پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے دور جاہلیت کے قبائل کی طرح فروعی مسائل پر طویل جنگ و جدال ان پر مستزاد۔

مذہبی صحافت کے مذکورہ تمام مسائل کے ساتھ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں کچھ رسائل ایسے بھی نکلے جو معاصر مذہبی رسائل میں اپنی تحریری، فکری اور علمی انفرادیت کی وجہ سے اپنے اپنے حلقوں میں مقبول ہوئے- ان میں اہل سنت و جماعت کا پندرہ روزہ ''جام کوثر'' کلکتہ، ماہنامہ ''جام نور'' کلکتہ، ماہنامہ ''پاسبان'' الہ آباد اور ان کے بعد ماہنامہ ''حجاز جدید'' دہلی (۱۹۸۸ء) قابل ذکر ہیں- اول الذکر دونوں رسائل علامہ ارشد القادری (۱۹۲۵ء/۲۰۰۲ء) کی زیر ادارت ۶۱/۱۹۶۰ء میں نکلے اور تین چار سالوں میں بند ہو گئے- اپنے مختصر عہد میں یہ دونوں رسائل اپنے مدیر کے اسلوب تحریر اور انداز فکر کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئے- اسی طرح دیوبندی مکتب فکر کا ''الجمعیۃ'' دہلی اور ماہنامہ ''تجلی'' دیوبند- جماعت اسلامی کا سہ روزہ ''دعوت'' دہلی اور مولانا وحید الدین خان کا ''الرسالہ'' دہلی مذہبی معاصر رسائل و اخبارات میں نمایاں رہے- اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ صحافت خواہ وہ سیاسی ہو، ملی یا مذہبی، اپنے آپ میں کشش اور اثر اندازی کی صلاحیت رکھتی ہے- اس کے ذریعے وسیع پیمانے پر ذہن سازی، فکری تعمیر و ترقی، دعوت و تبلیغ اور اصلاحات کا ناقابل تنسیخ نقش معاشرے میں قائم کیا جا سکتا ہے- شرط یہ ہے کہ صحافت کو جبری اصول و نظام کی بجائے اس کے اپنے اصول اور تقاضوں کے تحت چلایا جائے-

---

مذہبی صحافت کی مذکورہ تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے ۲۰۰۲ء میں ہم نے ماہنامہ جام نور کی نشاۃ ثانیہ کا فیصلہ کیا اور اسی سال اکتوبر میں اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا- جدید پیش کش، updated موضوعات اور عصری اسلوب کے ساتھ اس کے داخلی عناصر کی صحیح تنظیم و ترتیب پر بھر پور توجہ دی گئی، جس کا اثر یہ ہوا کہ مذہبی صحافت کے زوال کی کہی ان کہی داستانوں کو یکسر مسترد کرتے ہوئے یہ رسالہ ہند و پاک کے وسیع حلقے کی آواز بن گیا- اس کی اشاعت کے آٹھ برسوں میں کئی اہم ترین موڑ آئے، جہاں اس کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہوا، یہاں تک کہ مئی ۲۰۱۰ء سے اس کی اشاعت پاکستان سے ہونے لگی- شاید جام نور کی اشاعت اور مقبولیت کا یہ ایسا تاریخی سنگ میل ہے، جہاں تک مذہبی صحافت کی

پوری تاریخ میں کوئی دوسرا رسالہ نہیں پہنچ سکا- یہ بات ایک طرف جام نور کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور انفرادیت کا اشاریہ ہے تو دوسری طرف اس بات کا ثبوت کہ اگر موجودہ دور میں مذہبی صحافت عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اور سنجیدہ و علمی لب لہجے میں ہو تو نہ صرف وہ وسیع حلقے میں پڑھی جائے گی بلکہ اس کے دور رس اثرات بھی مرتب ہوں گے-

جام نور کو مقبولیت اور انفرادیت بخشنے میں دیگر بہت سے عوامل کے ساتھ جدید تقاضوں پر مشتمل اس کے مستقل کالمز کا نمایاں حصہ رہا ہے، ان کالموں میں خاص طور پر ''روبرو''، ''تحریری مباحثہ'' اور ''خامہ تلاشی'' قابل ذکر ہیں- ان میں اول الذکر کالم 'روبرو' کے تحت ہم نے برصغیر کی معروف مذہبی، ملی، سیاسی، ادبی، تعلیمی، تحریکی اور صحافتی شخصیات سے انٹرویوز لینے کا آغاز پہلے شمارے سے ہی کیا- اب جبکہ جام نور اپنی مسلسل اشاعت کے ۱۰۰ر شمارے پورے کر چکا ہے، انٹرویوز لینے کی رسم اسی تسلسل سے جاری ہے- میرا خیال ہے کہ مذہبی رسائل و جرائد کی دنیا میں اس مستقل کالم کو جام نور کی ''اوّلیات'' میں شمار کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، کیونکہ مذہبی صحافت کی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں کسی بھی رسالے یا جریدے نے مستقل کالم کے تحت مسلسل انٹرویوز لینے کا اہتمام نہیں کیا-

جام نور کی آٹھ سالہ اشاعت میں اب تک ہند و پاک کی تقریباً ۱۰۰ر معروف شخصیات اور ان افکار و خیالات سے ہم اپنے قارئین کو متعارف کرا چکے ہیں- خیال آیا کہ ذاتی افکار، عالمی و ملکی حالات، شعر و سخن، علم و ادب، تاریخ و تصوف اور مسلمانوں کے داخلی اور خارجی مسائل پر مبنی ان گراں قدر انٹرویوز کو کتابی شکل میں محفوظ کر لیا جائے تاکہ آنے والی نسل بھی ان افکار و خیالات سے رہنمائی لیتی رہے- زیر نظر مجموعے میں جن شخصیات کا انٹرویوز شامل ہے ان کا تعلق مختلف میدانوں اور شعبوں سے ہے، اس لیے ''روبرو'' کے نام سے انٹرویوز کے اس مجموعے کو تین جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلی جلد: علما و مشائخ پر مشتمل ہے-
دوسری جلد: ادبا، شعرا اور ناقدین ادب پر مشتمل ہے-
تیسری جلد: ملی، سیاسی، تعلیمی، تحریکی اور صحافتی شخصیات پر مشتمل ہے-

تقریباً ایک ہزار صفحات پر پھیلے تین جلدوں میں انٹرویوز کے اس منفرد مجموعے کو پیش کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ انٹرویوز لینے میں مناسب شخصیت کا انتخاب سے لے کر سوالات کی ترتیب، وقت کا تعین، ریکارڈ کردہ جوابات کی نقل، اس کی ترتیب وایڈیٹنگ اور تعارفی خاکہ لکھنے تک جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ان کی انجام دہی میں جام نور کی پوری ٹیم خاص طور پر مدیر جام نور ذیشان احمد مصباحی کا نمایاں رول رہا ہے۔ ان کی حصہ داری کے بغیر اس کام کا خوش اسلوبی سے انجام پانا ممکن نہیں تھا۔

خوشتر نورانی

۱۰/نومبر ۲۰۱۰ء

ابوالفیض معینی

ماہ نامہ جام نور کے مقبول ترین کالم ''خامہ تلاشی'' کے کالم نگار

مشہور علمی نقاد کلیم الدین احمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیائے ادب میں ایسے داخل ہوئے جیسے کوئی مست ہاتھی شیشے کی دکان میں داخل ہوجائے، حالانکہ سچائی یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ دماغ اور باشعور انسان تھے، ہاں! ان کا انداز جنونی ضرور تھا، جس کی وجہ سے متنازعہ ہی نہیں مطعون بھی ٹھہرے۔ ہم نے جب محترم ابوالفیض معینی کو جام نور کے تین صفحات کی مطلق العنانی سونپی تو اس قسم کے خدشات ہمیں بھی دامن گیر ہوئے کہ ایسی زمین پر جہاں جمہوری طرز پر اظہار خیال کی آزادی کا گلا بھی گھونٹ دیا گیا ہو وہاں اس قسم کی مطلق العنانیت کو لوگ کیسے برداشت کرسکیں گے؟ لیکن اس اتفاق کو کیا کہیے کہ ہمارا اندازہ یکسر غلط ثابت ہوا، خامہ تلاشی کی ایسی پذیرائی ہوئی گویا معینی صاحب تنقید نہیں قارئین اور قلم کاروں کا قصیدہ لکھ رہے تھے جن کے حضور محبتوں کا خراج پیش کرنے کے لیے لوگ بے قرار تھے، تنقید پر ایسی تحسین اس کے تعمیری ہونے کی آخری دلیل ہے اور اس بات کا اشاریہ ہے کہ ابوالفیض معینی کا ہوش جوش پر غالب تھا اور ان کی ذات پندار علم سے محفوظ۔ اول روز سے ہی اک شور اٹھا کہ ''ابوالفیض معینی کے چہرے سے نقاب اٹھائی جائے''، ہم اسے مسلسل نظر انداز کرتے رہے اور جب ڈھائی سال کے بعد اس کالم کے بند ہوجانے کے بعد بھی یہ شور نہ تھم سکا تو ہم قارئین کو یہ بتانے پر مجبور ہو گئے کہ ابوالفیض معینی کوئی اور نہیں جام نور کے ممتاز محقق وقلم کار، خانوادۂ عثمانیہ بدایوں کے چشم و چراغ مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری (پ: ۱۹۷۵ء) کا ہی دوسرا نام ہے جن کی شخصیت مزید تعارف کی محتاج نہیں۔

خوشتر نورانی: -آج سے تقریباً ڈھائی سے قبل ممبئی کے سفر سے واپسی پر آپ دہلی جام نور کے دفتر میں تشریف لائے تھے، اس ملاقات میں میں نے آپ کے سامنے کالم ''خامہ تلاشی'' کا خاکہ پیش کیا اور اسے شائع کرنے کی تجویز رکھی تھی-اس میں کوئی دورائے نہیں کہ جام نور کے ہر شمارے پر تنقید وتبصرہ کرنے کا خیال نعتیہ ادب کا عالمی جریدہ ''نعت رنگ'' کو دیکھ کر آیا، جس میں عالم اسلام کے مشہور اسکالر مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی نعت رنگ کے ہر شمارے پر تبصرہ فرماتے ہیں-نعت رنگ تو ایک خاص موضوع پر نکلتا ہے اور جام نور کا کوئی ایک خاص موضوع نہیں ہے، بلکہ یہ بیک وقت دینی، مذہبی، سیاسی اور ادبی موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے-اب میرے لیے پریشانی یہ تھی کہ جام نور پر تنقید وتبصرہ کرنے کے لیے ایسی شخصیت کہاں سے لائی جائے جو بیک وقت زبان وادب پر بھی اچھی نگاہ رکھتی ہو، مختلف علوم اسلامیہ پر بھی اچھی دسترس رکھتی ہو، شعر وسخن کا بھی اچھا ذوق رکھتی ہو اور عروض وقوافی سے بھی آشنا ہو-اس پریشانی کی وجہ سے اس کالم کے اجراء کا خیال دل سے نکال دینا ہی چاہتا تھا کہ اچانک آپ کا خیال دل میں آیا اور مجھے محسوس ہوا کہ اب میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے، بہر حال یہ تو اس کالم کا شروعاتی پس منظر تھا، یہ کہانی ایک طویل مضمون کا تقاضا کرتی ہے، اس سے قطع نظر اس کالم کی کامیابی کے تعلق سے جتنا میں نے سوچا تھا، میری سوچ سے کہیں زیادہ اسے کامیابی ملی اور مذہبی صحافت کی تاریخ میں اس نے ایک نیا باب لکھ دیا-آج جب کہ آپ کی اصل شخصیت ہمارے قارئین کے سامنے آچکی ہے، آپ ہمارے قارئین کو یہ بتائیں کہ جب میں نے آپ کے سامنے اس کالم کی تجویز رکھی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟

ابوالفیض معینی: -مجھے یاد ہے کہ جب آپ سے دہلی میں جام نور کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو آپ نے کہا کہ جام نور میں ہمیں کسی ایسے کالم کی شروعات کرنی چاہیے جو بالکل نیا اور انوکھا ہو اور پھر مولانا کوکب نورانی صاحب کے نعت رنگ میں شائع ہونے والے ان خطوط کا ذکر کیا-جہاں تک کوکب نورانی صاحب کی بات ہے، میں ان کی ذات سے، ان

کے قلم سے اور ان کی شخصیت سے خود بھی بہت متاثر ہوں-مجھے ایسا نہیں لگا کہ جو کام کوکب صاحب نے بحسن وخوبی انجام دیا تھا، مجھ جیسا کم علم آدمی وہ معیاری کام کر سکے گا-حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کو یاد ہوگا کہ ابتداً میں اس کام کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا، اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ میں خود کو ایک ایسے کام کے لیے جس میں ایک ذمہ دار اور بہت وسیع المطالعہ شخص ہونا چاہیے اور کم از کم میں اپنے آپ کو اس معیار کا گمان نہیں کرتا تھا-

خوشتر نورانی: -مگر اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے تعلق سے آپ کی اس وقت یہ خاکساری اور انکساری تھی؟

ابوالفیض معینی: -(مسکراتے ہوئے) نہیں! بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ آپ کا حسن ظن تھا کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل ہے کہ جو ذمہ داری آپ نے مجھے دی تھی اسے اپنی وسعت بھر انجام دینے کی کوشش کی-اس کالم کو شروع کرنے میں مجھے جو پس وپیش تھی وہ یہ کہ ظاہر ہے کہ یہ تنقید کا کالم تھا، مجھے جام نور کے تمام مشمولات کو پڑھ کر ان پر تنقید کرنی تھی، جام نور کثرت کے ساتھ جن حلقوں میں پڑھا جاتا ہے وہاں تنقیدی شعور ابھی اتنا بیدار نہیں ہوا تھا کہ لوگ صالح، مثبت اور تعمیری تنقید کو بھی برداشت کر پاتے بلکہ بسا اوقات اسے تنقیص پر محمول کر لیتے، اس لیے اس خارزار وادی کا مجھے پورا احساس تھا کہ جب میں تنقید کروں گا تو مجھے لعنت وملامت ملے گی-لیکن جب بہت غور کیا تو مجھے لگا کہ اگر اس کو شروع کیا جائے تو اس کے ذریعے سے ہم اپنی جماعت میں، مذہبی صحافت میں اور اردو صحافت میں بھی ایک نئی جہت اور نیا افق دکھا سکتے ہیں، لہٰذا آپ کی محبت تھی کہ میں تیار ہوا اور اس کالم کو شروع کیا اور پھر اس کے بعد خاص طور پر میں یہ بات کہنا چاہوں گا کہ آپ کے قارئین نے جس طرح مجھے پسند کیا، خطوط کے ذریعے، فون پر آپ کے ذریعے اور آپ سے نجی ملاقاتوں میں، جس کے لیے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اتنی حوصلہ افزائی، اس قدر پذیرائی کی کہ ان کے ہر آنے والے خط یا فون کے بعد میرا حوصلہ بڑھتا چلا گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ جو تنقید میں کر رہا ہوں قارئین اسے پسند کر رہے ہیں-دراصل اس کام کو شروع کرنے سے پہلے بھی جب میں جام نور پڑھتا تھا تو بہت سی ایسی

باتیں نظر سے گزرتی تھیں اور طبیعت چاہتی تھی کہ ان پر کچھ لکھوں اور ان کی اصلاح کردی جائے، اس کالم نے وہ مواقع دیے اور پھر ہماری کوشش رہی کہ جو کچھ بھی قارئین کے پاس جائے وہ صاف ستھری جائے-

خوشتر نورانی:- یہاں میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے قارئین یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ آپ نے اپنا اصل نام اور شناخت کیوں چھپائی تھی؟ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سلسلے میں میری ذاتی رائے تو یہ تھی کہ آپ اپنے اصل نام سے ہی لکھیں اور اپنی پہچان نہ چھپائیں، لیکن آپ سے مختلف وقتوں میں ملاقاتیں ہوئیں اور فون پر بھی باتیں ہوئیں جس میں آپ نے کہا کہ نام کو پوشیدہ رکھنا ہی مناسب ہے، پھر میں نے بھی آپ کی بات سے اتفاق کرلیا- ہمارے قارئین کو آپ ضرور بتائیں کہ اس کے پیچھے آخر کیا مصلحت تھی؟

ابوالفیض معینی:- اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس میں بہت سی ایسی باتیں تھیں جو میں کم از کم اپنے نام کے ساتھ نہیں لکھ سکتا تھا- ظاہر ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ میرا اپنا ایک خاندانی پس منظر ہے، اپنی ایک تاریخ ہے اور اپنا ایک میدان ہے، اپنی ان تمام شناختوں کے ساتھ بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کو میں نہیں کہہ سکتا تھا، دوسری بنیادی وجہ یہ تھی جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ چونکہ ہمارے یہاں تنقیدی شعور ابھی اتنا بالغ نہیں ہوا ہے، اگر میں اپنے نام کے ساتھ تنقید کرتا تو ردعمل اچھا نہیں ہوتا- مثلاً اگر میں کسی کی غلطی پر جائز تنقید کرتا تو بھی وہ ذاتیات اور شخصیات پر آجاتا اور اگر کوئی ایسی شخصیت تنقید کرتی ہے جس کا کوئی تعارف نہیں ہے تو پھر اسے ذاتیات اور شخصیات پر حملے کے لیے کوئی سرا نہیں ملے گا، بالکل میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، میرا تعارف نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کرنے والے مجھ تک نہ پہنچ سکے- اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ایک فرضی سا نام ہو، اگر بالفرض اس فرضی نام کو لے کر کوئی کچھ کہتا بھی ہے تو اس کی بات صدا بہ صحرا ہو کر رہ جائے گی- آپ نے یہ درست فرمایا کہ آپ کا شدید اصرار بھی تھا کہ میں اپنے نام سے لکھوں اور ہم نے اپنے جام نور ٹیم کے احباب سے مشورہ بھی کیا تو مجھے یاد ہے کہ ان میں سے دو تین لوگوں کا شدید اصرار تھا کہ میں سامنے آؤں-

خوشتر نورانی:- اب جب کہ آپ کی شخصیت سامنے آہی گئی ہے تو ان احباب کا بھی آپ نام لے سکتے ہیں جنہوں نے اس کے لیے اصرار کیا تھا-

ابوالفیض معینی:- جیسا کہ ہمارے کرم فرما مولانا ملک الظفر سہسرامی جو جام نور کے مستقل قلم کار ہیں اور ہمارے بڑے اچھے دوست ہیں ان کا بھی یہی فرمانا تھا کہ آپ اپنے نام سے اس کو لکھیے اور چونکہ یہ ایسی تاریخ بننے جارہی ہے جسے لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے، انہوں نے کہا کہ جب تنقید کرنے والا سامنے نہ ہو، اس کا معیار اور اس کا قد سامنے نہ ہو، اس کی تنقید کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی- مجھے ان کی اس بات سے اتفاق نہیں ہوا، کیونکہ آدمی کو بات دیکھنی چاہیے کہ کہنے والے کی بات کتنی باوزن ہے—یہ طے ہو جانے کے بعد کہ اپنے اصل نام سے نہ لکھا جائے، اب دوسرا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ نام کا انتخاب کیا کیا جائے اور اس میں پتہ کہاں کا ہونا چاہیے، ظاہر ہے کہ مجھے اپنا پتہ دینا نہیں تھا- آخر میں ابوالفیض معینی پر اتفاق ہوا، ابوالفیض معینی میرا اپنا نام نہ سہی، لیکن بالکل فرضی بھی نہیں بلکہ حیدرآباد میں اس نام کا میرا ایک بھتیجہ ہے جو کمپیوٹر انجینیر ہے، اس کے گھر کا نام زاویہ قادریہ ہے اور یہ نام پلّی میں ہی واقع ہے- بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اس نام کی کوئی عمارت حیدرآباد میں نہیں ہے، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ زاویہ قادریہ نام پلّی حیدرآباد میں ہے- اس نام اور پتے کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ یہ شہر ہمارے یہاں سے کافی دور ہے اور لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوگی اور ہمارا کام بھی ہوتا رہے گا-

خوشتر نورانی:- اس کالم کو شروع کرنے کے بعد اہل سنت و جماعت کی طرف سے آپ کو کسی غیر مناسب ردعمل کا خطرہ تھا؟

ابوالفیض معینی:- ظاہر ہے کہ اتنا تو میں نے محسوس کیا تھا، کیونکہ اس سے پہلے جام نور میں اور اس سے باہر بھی ہم نے دیکھا تھا کہ خطوط کے کالم میں یا کبھی اظہار خیالات کے کالم میں کہ اگر کسی کی غلطی پر گرفت کی گئی تو اس کے جواب میں پھر ان لوگوں نے غیر سنجیدہ اسلوب اختیار کیا، بعض کو آپ نے شائع بھی کیا اور بعض کو غیر اہم سمجھ کر شائع نہیں کیا، اس لیے مجھے اندازہ تھا کہ ردعمل تو کچھ ہونا ہے- اچھا! ہمارے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ

ہمارے سامنے اگر کوئی بہت بڑی شخصیت ہے یا کوئی بڑا نام ہے تو اس پر تنقید کرنا ایک مشکل کام تھا اور یہ مجھے مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ اگر کوئی چھوٹا موٹا آدمی غلطی کرے تو اس کی گرفت ہم کر لیں اور اگر خدانخواستہ کوئی سہو یا غلطی کسی بڑی شخصیت سے ہو تو اس کو چھوڑ دیا جائے، کم از کم میں اس کے لیے تیار نہیں تھا، اس کے لیے میری شرط یہی تھی کہ کوئی بھی شخص ہو حتیٰ کہ میں نے آپ سے بھی یہی کہا تھا اور وعدہ بھی لیا تھا کہ میں آپ کے اداریے کو بھی تنقیدی نظر سے پڑھوں گا اور آپ کے اداریے میں مجھے جو بھی نظر آئے گا تاریخی، علمی، لسانی، ادبی، تحقیقی تو میں اس پر ضرور تنقید کروں گا اور آپ کو اسے شائع بھی کرنا پڑے گا- اور میں یہاں اس بات کا بھی بڑی خوشی سے اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس پورے دو ڈھائی برسوں میں آپ کی جس تحریر پر جو بھی تنقید کی تو یہ آپ کی بہر حال اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی ہے کہ آپ نے بغیر کسی ترمیم کے اس کو من و عن شائع کیا-

خوشتر نورانی:- ہمارے یہاں عام رجحان یہ ہے کہ تنقید اچھی چیز نہیں ہے تو کیا یہ رجحان صحت مند ہے؟

ابو الفیض معینی:- تنقید کا معنی یا مفہوم نہ سمجھنے کی بنیاد پر ہی یہ رجحان پیدا ہوتا ہے، جہاں تک میرے ناقص علم میں ہے کہ تنقید کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ کسی تحریر کی کوئی خامی ڈھونڈھی جائے بلکہ ہم نے یہ پڑھا ہے کہ تنقید کا مطلب ہے حسن اور قبح کا اظہار، کوئی بھی شعری یا نثری تحریر ہے، اس میں جو خوبیاں ہیں ان کو اجاگر کیا جائے اور اس میں اگر کوئی خامی ہے تو اس کو بھی اجاگر کیا جائے، تو چونکہ تنقید ان دونوں چیزوں کا نام ہے تو ظاہر ہے کہ جب ہم حسن کا اظہار کر رہے ہیں جس میں تنقیص کا کوئی پہلو ہے نہیں تو جب قبح کو اجاگر کیا جا رہا ہے تو اس میں تنقیص کیسی؟ ہاں! اس میں تنقیص اس وقت پیدا ہوگی جب اسلوب اظہار ہمارا حقارت آمیز ہوگا- یاد رکھیں کہ کسی بھی صحت مند تنقید کے لیے اسلوب بھی آپ کا مثبت، ناصحانہ اور اچھا ہونا چاہیے تاکہ محسوس ہو کہ آپ کی نیت صالح ہے اور تنقید جس نیت سے کی جا رہی ہے وہ خالص تعمیری ہے- میں سمجھتا ہوں کہ تنقید کے خلاف منفی رجحان اس لیے پیدا ہوا کہ ہمارے یہاں مذہبی صحافت میں غالباً اچھے نقاد نہیں پیدا ہو سکے، تنقید کے نام

پر ہمارے یہاں جو بھی لکھا گیا میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ تر تحریریں تحقیر یا تنقیص پر مبنی تھیں، میں نے جتنا بھی مطالعہ کیا اس سے مجھے نہیں لگا کہ یہ تنقید مثبت اور تعمیری بنیادوں پر قائم ہے-

جب بات اسلوب کی آئی ہے تو ایک اور بات بتا دوں کہ خامہ تلاشی شروع کرنے سے پہلے میں نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تنقید پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کو پڑھا جائے، اس سلسلے میں میں نے کوکب نورانی صاحب کے وہ سارے تنقیدی خطوط پڑھے جو انہوں نے نعت رنگ کے لیے لکھا تھا، ''فاران'' کے ایڈیٹر مولانا ماہر القادری صاحب کو پڑھا جنہیں تنقید پر ملکہ حاصل تھا، ان کے علاوہ ادبی حلقوں سے بھی میں نے کافی استفادہ کیا خاص طور پر ''خامہ بگوش'' کو میں نے پڑھا، ان سب کے مطالعے کے بعد میں نے خامہ تلاشی لکھنے کے دوران دو چیزوں کے التزام کرنے کا اپنے آپ سے عہد کیا تھا- پہلی چیز تو یہ کہ جب تک واقعی کوئی غلطی نہیں ہوگی اس وقت تک ہم اس کی گرفت نہیں کریں گے، پوری تحقیق اور ریسرچ کے بعد جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ واضح اور بڑی غلطی ہے جبھی ہم اس پر قلم اٹھائیں گے اور چھوٹی موٹی فروگزاشتوں کو نظر انداز کر دیں گے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ جن لوگوں پر میں نے تنقیدیں کیں انہوں نے نہ صرف اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا بلکہ اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے میرا شکریہ بھی ادا کیا- دوسری چیز جس کا میں نے عہد کیا تھا کہ میرا اسلوب بہت شگفتہ اور اچھا ہونا چاہیے، اس میں کہیں بھی تنقیص یا تحقیر نہیں ہونی چاہیے، جس سے کسی کی دل آزاری ہو- ان دو چیزوں کے التزام کی حتی الامکان میں نے کوشش کی اور میں سمجھتا ہوں کہ قارئین بھی ان دونوں باتوں کے سلسلے میں میری تائید کریں گے کہ میں نے ان ڈھائی برسوں کے اندر کم از کم اپنی حد تک یہ کوشش کی کہ میرے کسی جملے یا کسی لفظ سے کسی بھی اہل قلم، عالم دین اور فاضل و محقق کی دل آزاری نہ ہو سکے- یہاں تک کہ اکابر پر بھی میں نے لکھا، ایک طرف ان کی بڑی شخصیت تھی اور دوسری طرف میں ان کے سامنے کافی چھوٹا اور بچہ تھا، پھر بھی اپنی ان تمام تر کم علمی اور بچپنے کے باوجود ان کے قد کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے بہت ناپ تول کر ایسے جملوں میں تنقید کی کہ شاید انہوں نے بھی پڑھ کر مجھے دعائیں دی ہوں گی اور انہیں اچھا لگا ہوگا- میں نے کہیں

پڑھا تھا کہ تنقید کا اصل حسن وہ ہے کہ جس پر تنقید کی جائے، اس کو بھی وہ بھلا لگے تو میں نے بھی ایسی ہی تنقید کی کوشش کی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مجھے کافی کامیابی ملی- یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ نادانستہ یا غیر شعوری طور پر میرے کسی جملے سے آپ کے کسی قاری، قلم کار یا ہمارے اکابر میں سے کسی کی ذرا بھی دل آزاری ہوئی ہو یا ان کو اپنی ہتک کا احساس ہوا ہو تو میں نہایت کھلے دل سے اپنی اس غلطی پر معذرت خواہ ہوں-

خوشتر نورانی: - یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے اور ایک ذی علم صاحب قلم سے یہی توقع ہوتی ہے کہ اپنے اندر عاجزی وانکساری لائے-

ابوالفیض معینی: - میری نیت غلط نہیں تھی، میں انسان ہوں، ممکن ہے غلطی سے کہیں کچھ ہو گیا ہو-

خوشتر نورانی: - خامہ تلاشی سے جام نور، خاص طور پر قلم کاروں اور ہمارے ان طلبہ کو جو مدارس میں پڑھتے ہیں کیا فائدے ہوئے؟

ابوالفیض معینی: - جہاں تک آپ کا یہ سوال ہے خامہ تلاشی سے جام نور کو، قلم کاروں کو اور طلبہ کو کیا فائدے ہوئے؟ سب سے پہلے تو جام نور کو فائدہ یہ ہوا کہ ہمارے بہت سے قارئین ایسے تھے کہ شمارہ جب آتا تھا تو پورا نہیں پڑھتے تھے لیکن اگلے مہینے جب وہ خامہ تلاشی پڑھتے تھے اور خامہ تلاشی میں کسی مضمون پر تنقید ہوا کرتی تھی تو اس کو پڑھنے کے بعد پچھلے ماہ کا شمارہ نکال کر اس مضمون کو پڑھتے تھے، اس کے علاوہ خامہ تلاشی کی وجہ سے قارئین کی دلچسپی بڑھ گئی کہ اب اگلے ماہ کیا آرہا ہے؟ جہاں تک بات اہل قلم کی ہے میں ان کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ان کی اصلاح کی ہے، وہ فاضلین ہیں، ہمارے بڑے ہیں مگر کم از کم خامہ تلاشی سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ وہ بہت محتاط ہو گئے، جب تک وہ لوگ علمی، لسانی اور تحقیقی جہتوں سے اپنی تحریروں کو پڑھ کر مطمئن نہیں ہو جایا کرتے تھے تب تک جام نور میں شائع کرنے کے لیے نہیں بھیجتے تھے-

خوشتر نورانی: - میں بحیثیت مدیر یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ بہت سے ایسے اہل قلم جو نو آموز تھے اور جنہیں ابھی اپنی تحریروں کی صحت پر پوری طرح اعتماد نہیں تھا، وہ جام نور

میں اکثر اپنی تحریریں نہیں بھیجا کرتے تھے صرف یہ کہہ کر کہ خامہ تلاشی سے ہمیں ڈر لگتا ہے، اس سے میں سمجھتا ہوں کہ جام نور کو مزید فائدہ یہ پہنچا کہ اس میں انہی قلم کاروں کی تحریریں شائع ہونے کے لیے آیا کرتی تھیں جو علمی، لسانی تحقیقی اور فکری جہتوں سے اعلیٰ سطح کی ہوتی تھیں اور پھر جام نور میں اچھے لکھنے والوں کی ایک ٹیم جمع ہو گئی-

ابوالفیض معینی: - اس میں ایک بات اور شامل کرنا چاہوں گا کہ اس میں جو نئے قلم کار تھے جو آپ کے ''تربیت گاہ لوح وقلم'' کے کالم میں لکھا کرتے تھے، ان پر کچھ تنقید کرتے ہوئے خاص طور پر میں نے اس چیز کا خیال رکھا تھا کہ ایسا کچھ نہ لکھا جائے جس سے ان کی دل شکنی یا حوصلہ شکنی ہو، بلکہ ان کی گرفت کرنے سے قبل ان کی تعریفیں کیں، ان کی حوصلہ افزائی کی اور پھر ایک اچھے اسلوب میں ان کی غلطیوں کو اجاگر کیا- آپ کے سوال کا تیسرا حصہ یہ تھا کہ خامہ تلاشی سے ہمارے طلبہ کو کیا فائدہ پہنچا؟ اس سلسلے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ جام نور خاص طور پر جماعت اہل سنت کے اندر اور باہر بھی ہمارے طلبہ کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے وہ بہت کچھ سیکھتے ہیں، جام نور میں جب وہ کچھ پڑھتے ہیں تو اسے سند سمجھتے ہیں اور جب وہ خود کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو جام نور کی وہ بات ان کے ذہنوں میں ہوتی ہے اور پھر وہ اسے آگے بڑھاتے ہیں خواہ وہ علمی حیثیت سے ہو یا لسانی حیثیت سے- مثلاً آپ اداریہ لکھتے ہیں ان میں سے بہت سی ایسی فکریں یا جملے ہوتے ہوں گے جو انہیں اچھے لگتے ہوں گے، وہ انہیں نوٹ کرتے ہوں گے اور پھر آئندہ انہیں استعمال کرتے ہوں گے، اس کے علاوہ اور بھی اہل قلم ہیں جن کی فکروں اور زبانوں سے طلبہ استفادہ کرتے ہوں گے- اب اگر بہت سی ایسی باتیں جو علمی یا لسانی حیثیت سے غلط تھیں ان کی اصلاح نہ کی جاتی تو میں سمجھتا ہوں کہ غلط باتیں طلبہ کے ذہنوں میں بیٹھ جاتیں پھر ان غلط باتوں کو من وعن وہ آگے بڑھا دیتے-

خوشتر نورانی: - پوری دنیا میں جہاں جہاں جام نور پڑھا جاتا ہے وہاں عام قارئین سے لے کر بڑے بڑے علماء ودانش وران تک کی ''خامہ تلاش'' کی شناخت کے حوالے سے مختلف آراء تھیں- ایک رائے تو یہ تھی اور یہی اکثریت کی رائے تھی کہ خامہ تلاش کوئی ایک

شخص نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے کیونکہ بیک وقت مختلف علوم وفنون پر دسترس رکھنا، زبان و ادب پر گہری نگاہ رکھنا اور شعر وسخن کا خاصا درک رکھنا ان تمام صلاحیتوں کا کسی ایک شخص میں جمع ہونا بہت مشکل ہے- اس لیے یہ سمجھا گیا کہ اس کالم کو مختلف علوم وفنون پر مہارت رکھنے والے مل کر لکھتے ہیں- دوسری رائے یہ تھی کہ خود مدیر اعلیٰ ہی خامہ تلاشی ہیں، تیسری رائے یہ تھی کہ مولانا اسید الحق ہی خامہ تلاشی ہیں- اس تعلق سے گھڑی کی سوئی مختلف لوگوں کی طرف گھوما کرتی تھی، اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟

ابوالفیض معینی:- مجھے یاد ہے کہ ہماری جماعت کے ایک بڑے ذمہ دار عالم مفتی مطیع الرحمٰن رضوی صاحب سے ایک بار میری ملاقات ہوئی، ان کو بھی نہیں معلوم تھا کہ خامہ تلاشی میں لکھتا ہوں تو انہوں نے فرمایا کہ ''یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ایک آدمی اتنے سارے علوم پر بیک وقت نظر رکھتا ہو کہ وہ حدیث واصول حدیث پر بات کر رہا ہے، شعر وسخن پر بھی بات کر رہا ہے اور ادب، تاریخ اور زبان پر بھی کلام کرتا ہے، اس لیے میں یہ نہیں مان سکتا کہ کوئی ایک شخص اس کو لکھتا ہے اور اگر کوئی ایک آدمی یہ کام کر رہا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان تین صفحات کو لکھنے کے لیے وہ پندرہ بیس دنوں تک اسی میں لگا رہتا ہوگا- یعنی رسالہ ملنے کے بعد بیس دنوں تک وہ پڑھتا رہتا ہوگا، لائبریریاں کھنگالتا ہوگا پھر جا کر یہ کام ہوتا ہوگا''- تو میں نے ان سے ازراہ مذاق کہا کہ حضرت اگر کوئی آدمی دو دنوں میں یہ کام کرتا ہو تو پھر آپ کیا کہیں گے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ''پھر تو وہ اپنے زمانے کا عبقری ہوگا''- حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اتنی حیرت کی بات نہیں- مثلاً شعر وسخن اور عروض کے تعلق سے جو کچھ بھی میں نے تنقیدیں کیں وہ ایسی کوئی بہت علمی نہیں تھیں کہ ان پر حیرت کیا جائے، اس کے علاوہ میرا تعلق ایک ایسے خاندان اور ایسی سرزمین سے ہے جہاں شعر وسخن کا خوب چرچا رہتا ہے، میرے گھرانے میں دسیوں شعرا گزرے ہیں اور میں بھی کچھ نہ کچھ تک بندیاں کر لیتا ہوں، جام نور میں شائع بھی ہوا کرتی ہیں تو جسے بچپن سے شعر وسخن کا شوق رہا ہے اور کسی نہ کسی حد تک فن سے بھی واقفیت ہے، اس کے علاوہ ادب کا مطالعہ بھی میں نے اپنے خارجی اوقات میں کافی کیا ہے تو یہ میرے لیے ناممکن سی چیز نہیں تھی- ان تمام چیزوں کے باوجود نہ تو مجھے

''ہمہ دانی'' کا دعویٰ ہے اور نہ ہی عبقریت کا زعم، میں تو آج تک اپنے آپ کو طالب علم سمجھتا ہوں، اور جو کچھ بھی ہے اسے میں اللہ کا فضل سمجھتا ہوں اور خاص طور پر اپنے بزرگوں کی دعائیں کہ جو کام میں تن تنہا کر رہا تھا لوگ اسے ایک اکیڈمی کا کام گمان کر رہے تھے، خود میرے استاذ گرامی امام علم وفن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی صاحب بھی نہیں جانتے تھے کہ خامہ تلاشی میں لکھتا ہوں، انہوں نے فرمایا کہ ''بڑی حیرت کی بات ہے، ہندوستان میں تو مجھے ایسا کوئی شخص فی الحال نظر نہیں آتا جو بیک وقت ان تمام علوم وفنون پر دسترس رکھتا ہو-''

خوشتر نورانی:- یہاں میں اپنے قارئین کو یہ بھی بتا دوں کہ کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہیں خامہ تلاش کی شخصیت کا موہوم سا سراغ مل گیا تھا، اس لیے وہ خامہ تلاش کی اہمیت و صلاحیت کو کم کرنے کے لیے یہ افواہ اڑاتے پھر رہے تھے کہ کئی لوگ مل کر اسے لکھ رہے ہیں، مثلاً شعر وسخن کے لیے فلاں شاعر سے رجوع کیا جاتا ہے، حدیث کے لیے فلاں عالم سے، تفسیر کے لیے فلاں مفسر سے اور نقد کے لیے فلاں نقاد سے رجوع کیا جاتا ہے- لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ ایسا کچھ نہیں تھا، میرے محبّ محترم مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری صاحب کسی کی طرف رجوع کیے بغیر نہایت پابندی سے دو برسوں تک خامہ تلاشی لکھتے رہے، ہاں! جب کبھی کوئی اہم صورت حال سامنے آ گئی تو مشوروں کا تبادلہ ضرور ہوا- کسی بات پر شبہ ہوا تو کبھی کسی شاعر یا اہل علم سے ان کی رائے پوچھ لی لیکن میرا خیال ہے کہ ہر شخص کے ساتھ یہ صورت حال ہے، ان چیزوں سے اس کی صلاحیت پر حرف نہیں آتا-

ابوالفیض معینی:- میں یہاں پر ایک حقیقت کا اعتراف کروں کہ خامہ تلاشی لکھنے کے وقت جہاں تک بات مذہبی معاملات کی تھی تو میرا اپنا مطالعہ کافی تھا، اس لیے میں خود طے کرتا تھا کہ مجھے کیا لکھنا ہے، ہاں کبھی ایسا ضرور ہوتا تھا کہ کسی لفظ کی تذکیر وتانیث کے سلسلے میں یا کسی شعر کے وزن کے سلسلے میں یا کسی ترکیب یا محاورے کے سلسلے میں جہاں کہیں مجھے تامل ہوا کرتا تھا تو میں اپنے کرم فرما اور مشفق جناب ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب سے فون پر مشورے کرتا تھا اور ڈاکٹر صاحب کافی اچھی رائے مجھے دیا کرتے تھے، یہ الگ بات ہے

کہ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب سے بھی مجھے اتفاق نہیں ہو سکا، لیکن بہر حال شعر و سخن کے سلسلے میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے ضرور استفادہ کیا ہے۔

خوشتر نورانی: - یہ حقیقت کا اعتراف اپنی جگہ، لیکن پہلے کسی قابل گرفت مقام پر نظر رک جانا یہ بجائے خود اس بات کا اشاریہ ہے کہ شعر و سخن میں آپ اچھی نظر رکھتے ہیں۔

ابولفیض معینی: - ہاں! یہ صحیح ہے کہ پہلے میری نگاہ خود رکتی تھی اور پھر اپنے اطمینان کے لیے میں ڈاکٹر صاحب سے رجوع کرتا تھا اور بہت محبت کے ساتھ وہ رہنمائی فرماتے تھے۔

خوشتر نورانی: - اچھا یہ بتائیں کہ ہمارے ارباب علم و دانش اور قارئین کو کیوں ایسا لگتا تھا کہ کوئی ایک شخص اتنے علوم وفنون پر دسترس نہیں رکھ سکتا؟

ابولفیض معینی: - میں نے جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ میں اس کو عجوبہ نہیں مانتا، ایسا ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ یہاں ایک بات اور بتا دوں کہ خامہ تلاشی لکھتے وقت کبھی کبھی اتفاقات بھی ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک صاحب کا مضمون چھپا جس میں حضرت عمر فاروق کے ایمان لانے کے بارے میں ایک روایت تھی، میں نے وہ روایت پڑھی اور میرے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ اس روایت میں کچھ نقد اور کلام ہے، اتفاق سے میں اپنی لائبریری میں گیا تو محض اتفاقیہ طور پر علامہ شبلی کی ''الفاروق'' سامنے آ گئی، میں نے سوچا کہ معاملہ حضرت عمر کے ایمان کا ہے لاؤ اسے بھی دیکھ لوں، جب اس کو دیکھا تو شاید آپ کو یاد ہوگا کہ پوری اٹھارہ یا بیس سطریں ہو بہو وہیں سے نقل کی ہوئی تھیں، تو ایسے اتفاقات بھی ہوئے ہیں۔ ایک بات اور یہاں عرض کر دوں کہ جب میں ایک شمارے پر تنقید کرتا تھا تو اگلے شمارے میں بعض خطوط آیا کرتے تھے کہ آپ نے فلاں جگہ غلطی تھی اسے چھوڑ دیا، وہ سارے خطوط آپ مجھے دکھایا کرتے تھے اور میں نے پڑھے۔ اس تعلق سے عرض ہے کہ یہ کوئی بات نہیں ہوئی کہ جام نور کی ہر ہر غلطی پر ہم لکھیں، پھر کبھی ایسا ہوا کرتا تھا کہ آپ کے کسی قاری نے لکھا کہ فلاں بات قابل گرفت تھی آپ نے اس پر کیوں کچھ نہیں لکھا؟ تو میں آپ کو بتاؤں کہ بہت سے باتیں ایسی تھیں جو بالکل درست تھیں اور جنہوں نے ان پر تنقید لکھ کر بھیجی تھی وہ غلط تھی، تو ان پر تنقید نہ کرنے کی وجہ ایک تو یہ بھی تھی کہ میرے نزدیک وہ کوئی ایسی غلطی نہیں تھی

کہ جن پر تنقید کی جائے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں بھی ایک انسان ہوں اور انسان کی نظر کبھی چوک جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ میری نظر اس پر نہ پڑ سکی۔ تو یہ سمجھ لینا کہ ابوالفیض معینی ہر ہر سطر پر تنقید کرے ایسا ممکن نہیں تھا، پھر ہمارے پاس کل تین صفحات تھے اور تین صفحات میں ۶۴ ر صفحات پر تنقید ہونا بڑا مشکل ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کبھی کبھی میں نے پانچ پانچ صفحات آپ کو لکھ کر بھیج دیے، آخر میں اسے تین صفحات میں لانا تھا تو پھر ہم لوگوں نے مل بیٹھ کر بہت سی باتیں نکالیں۔

خوشتر نورانی: - خامہ تلاشی لکھتے وقت کبھی کبھی آپ اپنے اوپر یعنی مولانا اسید الحق پر بھی تنقیدیں کیا کرتے تھے، ایسا کیوں؟

ابولفیض معینی: - (مسکراتے ہوئے) ظاہر ہے کہ ہمیں اپنا اصل نام چھپانا تھا ہمیں اس بات کا اظہار نہیں کرنا تھا کہ ابوالفیض معینی اسید الحق ہی ہے، اب اسید الحق کے نام سے ہر شمارہ میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا ہے اور اسید الحق کوئی فرشتہ تو نہیں ہے اس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، اگر میں اسید الحق پر تنقید نہ کرتا تو لوگ محسوس کرتے کہ ابوالفیض معینی اداریہ سے لے کر خطوط کے کالم تک ہر شخص پر تنقید کر رہا ہے لیکن اسید الحق سے اس کی کیا رشتہ داری ہے کہ وہ اسے رعایت دے رہا ہے۔ آپ کو جان کر حیرت ہوگی کہ کئی مرتبہ میرے یعنی اسید الحق کے نام سے جو مضامین شائع ہوئے، شائع ہونے کے بعد جب میں نے دوبارہ انہیں پڑھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مثال کے طور پر میں نے ایک بار ''قفس'' کا استعمال ''ص'' سے کر دیا تھا، لکھتے وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ اردو زبان میں قفس ''س'' سے ہوتا ہے، میں نے چونکہ عربی اور فارسی کافی پڑھی تھی اور ان دونوں زبانوں میں قفس ''ص'' سے استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اردو میں جب مضمون لکھا تو قفس ''ص'' سے لکھ دیا اور آپ نے بھی ''ص'' سے ہی اسے چھاپا، لیکن جب شائع ہونے کے بعد میں نے پڑھا تو مجھے تردد ہوا اور پھر میں نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اردو میں قفس ''س'' سے لکھا جاتا ہے۔ تو جو خود پر میں نے تنقیدیں کی ہیں ایسا نہیں کہ وہ غلطیاں میں نے جان بوجھ کر کیں اور پھر ان پر گرفت کی۔

خوشتر نورانی: -آپ نے خامہ تلاشی کی شروعات ابوالفیض معینی کے نام سے کی، کیا اب آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنی شناخت کو چھپانے کے سلسلے میں آپ کا فیصلہ درست تھا؟

ابولفیض معینی: -میرے خیال سے میرا فیصلہ بالکل درست تھا، اس لیے کہ ابتداءً میں اپنے نام سے لکھتا تو کچھ نہ کچھ تو دشواریوں کا سامنا ضرور کرنا پڑتا، اس کی اور بھی بہت سی وجوہات ہیں، جس کا میں اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتا- خامہ تلاشی جس وقت لکھی جا رہی تھی، اس وقت لوگ مجھ سے بھی پوچھا کرتے تھے کہ آخر یہ کون ہے؟ لیکن آپ میرے صبر وتحمل کو داد دیجیے، میری موجودگی میں لوگ آپ سے کتنا کریدتے تھے اور میں انجام بن جایا کرتا تھا (ہنستے ہوئے)-

خوشتر نورانی: -مجھے پورا احساس ہے کہ آپ کو کتنا تحمل سے کام لینا پڑتا تھا کہ آپ اپنی ہی چیز کو اپنی نہیں کہہ پا رہے تھے، آپ تو آپ رہے خود مجھے بھی بڑے صبر کا مظاہرہ کرنا پڑا، مجھے یاد نہیں آتا کہ میری اپنی زندگی میں کسی ایک چیز کے بارے میں لوگوں نے اتنی بار سوال کیا ہوگا، اگر کیا ہے تو وہ ایک سوال تھا کہ خامہ تلاش کون ہیں؟ میں جہاں بھی جاتا، خواہ سیمینار ہو یا جلسہ یا مخصوص محفل، لوگ یہی ایک سوال کرتے، نجی ملاقاتوں میں تو سوال کرتے ہی تھے، یہی سوال دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں سے فون اور خطوط کے ذریعے لوگ کرتے تھے- میرا آپ سے تعلق صرف ایک مدیر اور قلم کار کا نہیں تھا بلکہ بچپن سے گہرا دوستانہ اور برادرانہ تعلق رہا ہے، اس حیثیت سے مجھے لگتا تھا کہ کاش میں بتا سکتا کہ یہ کوئی اور نہیں خود میرے دوست اسید الحق ہی ہیں، خاص طور پر اس وقت جب خامہ تلاشی کا انتساب کئی افراد یا کسی خاص دوسرے فرد کی طرف کیا جاتا تھا- ایک مرتبہ مجھے یاد آتا ہے کہ ہمارے استاذ گرامی امام علم وفن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی صاحب قبلہ نے فرمایا کہ اب بتا ہی دو کہ آخر یہ کون ہے؟ میں اس وقت غلط بیانی سے کام نہیں لے سکا اور ہم نے اپنے اس معاہدے کو ایک طرف رکھ دیا جس میں ہم نے خامہ تلاش کی شخصیت کو چھپانے کا عہد کیا تھا، میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! یہ کون ہوسکتا ہے؟ یہ آپ ہی کا ایک

پروردہ اور شاگرد ہوسکتا ہے اور پھر جب انہوں نے آپ کا نام سنا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بے حد خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ اسید الحق ہی ہو سکتے ہیں- بہر کیف! مذہبی اردو صحافت کی تاریخ میں اس کالم کو جو پذیرائی ملی ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ارباب علم ودانش جن میں یونیورسٹیز کے ادباء اور نقاد بھی شامل ہیں اس کالم کا موازنہ ماضی میں شائع ہونے والے ان تاریخی علمی اور ادبی کالموں سے کیا جنہوں نے اردو دنیا میں اپنی اہمیت کا لوہا منوایا، مثلاً، فیضی کی بانگ درا، مشفق خواجہ کا خامہ بگوش اور آزاد کی غبار خاطر وغیرہ-

ابولفیض معینی: -میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ مجھ جیسے کسی نو آموز کی تحریر کو کوئی مولانا آزاد کی غبار خاطر اور مشفق خواجہ کے خامہ بگوش کے مقابلے میں پیش کر رہا ہو، بہر حال اس سے میرا حوصلہ کافی بڑھا- ایک بات اور ذکر کر دوں، ابھی آپ نے حضرت امام علم وفن کا تذکرہ کیا جو میرے اور آپ کے بھی استاذ گرامی ہیں- مجھے یہاں اعتراف کرنے میں ذرا بھی کوئی باک نہیں کہ آج جو کچھ بھی میں ہوں یا میری شخصیت سازی میں اور مجھے اس مقام تک پہنچانے میں، اگر کسی شخصیت کا ہاتھ ہے تو وہ ہمارے استاذ خواجہ مظفر حسین صاحب کا ہے اور اکثر ایسے موقع پر میں ایک شعر پڑھا کرتا ہوں کہ

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

خوشتر نورانی: -اس میں کوئی شک نہیں ہے، میں بھی اپنی تحریری اور صحافتی کامیابی کا سارا کریڈٹ انہی کو دیتا ہوں، اپنی زندگی میں جو پہلا مضمون لکھا انہی کی تربیت میں لکھا، جسے دیکھ کر انہوں نے کافی سراہا جس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا-

خوشتر نورانی: -کبھی کبھی جام نور میں بڑے بڑے اہل قلم کے درمیان کسی مسئلے پر بحث چھڑ جایا کرتی تھی اور اس بحث کا سلسلہ مہینوں چلا کرتا تھا، اس وقت قارئین چاہتے تھے کہ آپ فیصل کی حیثیت سے ان دو شخصیتوں کی تحریروں اور بحثوں کا محاکمہ کریں، لیکن ہم نے

دیکھا کہ آپ نے کبھی فیصل بن کر محاکمہ نہیں کیا، اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟

ابولفیض معینی:-اس کی دو وجوہات تھیں، کبھی کبھی تو میں موضوع کی نزاکت کو دیکھ کر ڈر جایا کرتا تھا، کبھی کبھی موضوع اتنا حساس اور نازک ہوا کرتا تھا کہ اس میں گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل والی بات ہو جایا کرتی تھی- کبھی نہ کبھی میرا نام سامنے آنا تھا اور اسید الحق کا اس موضوع پر کچھ لکھنا مناسب نہیں تھا، اس لیے میں اپنی رائے پیش نہیں کرسکا- دوسری وجہ یہ تھی کہ اکثر ایسا ہوا کہ وہ دو متحاربین جو آمنے سامنے تھے ان سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے اور دونوں کو ہی یہ توقع ہوا کرتی تھی کہ میں ان کی حمایت کروں گا حالانکہ میں نے ایسا کبھی نہیں کیا- میں نے کبھی بھی خامہ تلاشی لکھتے وقت تعلقات کی پرواہ نہیں کی، جب آپ سے رعایت نہیں کی تو پھر دوسروں کی بات ہی الگ ہے، لیکن پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا خیال کرنا پڑتا تھا، مثال کے طور پر جب ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب اور مفتی آل مصطفیٰ مصباحی صاحب کے درمیان بحث چھڑی، اب میرے جتنے گہرے تعلقات ڈاکٹر صاحب سے تھے اتنے ہی گہرے مفتی صاحب سے بھی تھے-

خوشتر نورانی:-اور دونوں ہی یہ جانتے تھے کہ ابوالفیض معینی کون ہیں!

ابولفیض معینی:-جی ہاں! دونوں ہی جانتے تھے اور دونوں کو یہ توقع تھی کہ میں ان کے موقف کی تائید کروں گا، حقیقت یہ ہے اس بحث میں نہ تو کلی طور پر میں ڈاکٹر صاحب سے اتفاق رکھتا تھا اور نہ کلی طور پر مفتی صاحب سے، اب جب کہ وہ دونوں حضرات یہ انٹرویو پڑھیں گے تو محظوظ بھی ہوں گے (ان سے معذرت کے ساتھ) دونوں کی مجھے بعض باتوں سے اتفاق تھا اور بعض باتوں سے نہیں تھا تو میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ میں حتمی طور پر اپنی کوئی رائے یک طرفہ دے سکوں-

خوشتر نورانی:-اب آخر میں ہمارے قارئین کو یہ بتا دیں کہ آپ نے یہ کالم لکھنا بند کیوں کر دیا؟ اس کالم کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جب یہ کالم بند ہوا تو رد عمل میں زبانی، تحریری اور ٹیلی فونی شکایتوں کا انبار لگ گیا، بلکہ میں کہوں گا کہ ہاہا کار مچ گئی، ان میں سے کچھ خطوط شائع بھی ہوئے، لیکن زبانی اور ٹیلی فونی شکایتوں کی تعداد شمار سے

باہر تھی، اس کے بند ہونے کا افسوس کرنے والے نہ صرف عام قارئین تھے بلکہ بڑے بڑے دانشور، نقاد، علماء، فضلا اور مشائخ بھی تھے-

ابولفیض معینی:-اس کو بند کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ زیادہ عرصے تک چلتا رہے گا تو اس کا جو اپنا Charm ہے ختم ہوتا جائے گا؟ تو اس سے پہلے کہ آپ کو یہ خط آنے لگے کہ صاحب بہت ہو گیا اب بند کر دیجیے، اس سے پہلے میں ہی اسے بند کر دوں، میرا خیال ہے کہ ایک ہی طرح کی چیز آدمی پڑھتے پڑھتے اوب جاتا ہے اور پھر وہ اچھی نہیں لگتی- تو اس سے پہلے کہ آپ یہ کہتے (ہنستے ہوئے) کہ میں آپ سے باز آیا اور اب آپ خامہ تلاشی بند کر دیجیے، میں نے خود ہی وہ سلسلہ بند کر دیا- دوسری وجہ یہ تھی کہ خامہ تلاشی ایک اچھا وقت لیا کرتی تھی، غور وفکر اور اچھی خاصی محنت طلب کرتی تھی، کبھی کبھی تو ایسا ہوا کہ میری نظر کسی ایک لفظ پر رک گئی اور پھر میں اس کی تحقیق میں پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے تک لگا رہا، چھ آٹھ گھنٹوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بات صحیح تھی- اسی طرح کبھی کسی حدیث میں مجھے لگا کہ کچھ کلام ہے اور پھر اس کی تحقیق میں رات رات بھر کتابیں کھنگالتا رہا اور صبح معلوم ہوا کہ وہ حدیث صحیح تھی اور میری محنت برباد گئی- ان کے علاوہ آپ جانتے ہیں کہ میری خود کی بہت ساری تحریکی، دعوتی، تقریری، تحریری اور علمی مصروفیات ہیں جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اس لیے مجھے ایسا لگنے لگا کہ میں اب بہت زیادہ توجہ اس کالم پر نہیں دے سکتا اور جب تک اس پر بھرپور توجہ نہ دی جائے اس معیار کی تحریر ہم نہیں لکھ سکتے جس کا یہ کالم متقاضی ہے- میں نے کئی مرتبہ اس حوالے سے یہ مصرع بھی پڑھا

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے کام تھے- پھر سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس کالم کے شروع کرنے کا جو ہمارا مشترکہ مقصد تھا وہ پورا ہو چکا تھا، ہم نے اپنے نو آموز قلم کاروں اور طلبہ کو یہ شعور دے دیا کہ تنقید اس اسلوب میں بھی ہو سکتی ہے، نقد ونظر کا مطلب صرف تحقیر یا تنقیص نہیں ہے- آپ نے محسوس کیا ہوگا، یہ بات شاید کہنے کی نہ ہو کہ اس کے بعد کئی رسالوں نے اس قسم کے خطوط اور تحریروں کو شائع کرنا شروع کیا جس میں

تنقید کی جاتی تھی اور ان تحریروں میں کئی بار تو پورے پورے جملے جو خامہ تلاشی میں لکھے تھے، وہ استعمال کرا شروع کر دیے، گویا ہم مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے۔ آپ کے قلم کار بھی محتاط ہو گئے اور قارئین میں تنقیدی شعور بھی بیدار ہو گیا، لہٰذا اس کو مزید کھینچنا مناسب نہیں تھا۔

خوشتر نورانی:۔ آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے کہ آپ نے اپنے قیمتی اوقات میں سے چند لمحے ہمیں اس انٹرویو کے لیے دیے۔

ابوالفیض معینی:۔ میں بھی آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے جام نور کے تین صفحات پر مجھے حکمرانی کرنے کا موقع دیا (مسکراتے ہوئے) اور ان پر میں نے جو چاہا لکھا اور آپ کی محبت ہے کہ آپ نے اسے شائع بھی کیا اور ایک بار پھر قارئین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انہوں نے اتنی محبتیں دیں اور اتنی حوصلہ افزائی کی۔ آخر میں پھر وہی جملہ دہرانا چاہوں گا کہ خامہ تلاشی کے کسی لفظ سے کسی بھی قاری کی، مشائخ کی اور ادارے کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں بڑے ہی وسیع القلبی کے ساتھ ان سے معذرت چاہوں گا۔

خوشتر نورانی:۔ چلتے چلتے یہ بھی بتا دیں کہ مستقبل میں ہم آپ سے یہ توقع رکھیں کہ آپ کچھ نیا شروع کریں گے؟

ابوالفیض معینی:۔ (ہنستے ہوئے) نئی چیزیں تو آپ لے کر آتے ہیں، خامہ تلاشی کا خیال بھی سب سے پہلے آپ ہی کو آیا تھا، اب پھر آپ کوئی نئی چیز سوچیے تو ان شاء اللہ اس پر غور کیا جائے گا۔ ❏❏❏

(شمارہ جولائی ۲۰۰۷ء)

پروفیسر اختر الواسع

صدر شعبہ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر اختر الواسع جہان دانش و بینش کا ایک معروف و متعارف نام ہے، مسلم مسائل موصوف کی فکر و قلم کا محور ہیں، اعتدال و توازن ان کی باتوں کا خاصہ ہے، عصبیت اور جانب داری کی بجائے حقیقت پسندی اور رواداری اُن کی ترجیحات ہیں۔ پروفیسر صاحب کا وطن علی گڑھ ہے، علی گڑھ سے ہی گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی تکمیل کی، استنبول یونیورسٹی سے ۱۹۸۳ء میں ترکی میں ڈپلوما کیا۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۷۹ء تک جامعہ ملیہ میں لیکچرر رہے، ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۰ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لیکچرر رہے، ۱۹۸۰ء میں پھر جامعہ چلے آئے، ۱۹۸۷ء میں ریڈر بنے، ۱۹۹۱ء میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے، اس کے بعد ادارہ علوم انسانی کے ڈین بھی رہے اور فی الوقت صدر شعبہ اسلامیات، ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور وائس چیرمین اردو اکادمی، دہلی ہیں، اس کے علاوہ مولانا آزاد یونیورسٹی حیدر آباد، انڈین وقف کونسل دہلی، کشمیر یونیورسٹی، کشمیر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، آل انڈیا قومی تنظیم دہلی، وغیرہ دو درد جن تعلیمی، ملی، سیاسی، سماجی، صحافتی اور فلاحی اداروں اور تنظیموں سے وابستہ ہیں، تصنیف و ترجمہ اور ترتیب پر مشتمل تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جامعہ کے تین علمی جرنل Islam & the Modern Age، ''اسلام اور عصر جدید'' اور رسالہ ''جامعہ'' آپ کی ادارت اور نگرانی میں شائع ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد یونیورسٹی حیدر آباد کے اسلامیات کے پرچہ میں اپنی کوشش سے تحریکوں میں اہل سنت و جماعت (سنی بریلوی تحریک) اور شخصیات میں امام احمد رضا خاں محدث بریلوی کی شخصیت کو شامل کرایا ہے۔

سوال:- ہفت روزہ عالمی سہارا'' کے ''اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی نمبر'' میں آپ نے ارباب علم و دانش کو رضویات کے حوالے سے سنجیدہ مطالعہ اور غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے، آپ ایک غیر جانب دار اسکالر ہونے کی حیثیت سے بتائیں کہ آپ اعلیٰ حضرت محدث بریلوی سے کیسے متعارف ہوئے اور ان کے تعلق سے کیا رائے قائم کی؟

پروفیسر اختر الواسع:- دیکھیے! جب آپ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے ہندوستان کا بلکہ جنوبی ایشیا کا مطالعہ کریں گے تو آپ اعلیٰ حضرت کو نظر انداز ہی نہیں کر سکتے - شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد دور جدید میں مختلف مکاتب فکر اور مسالک وجود میں آئے اور بڑی بڑی شخصیات پیدا ہوئیں، ان میں اعلیٰ حضرت محدث بریلوی کی شخصیت بہت ہی نمایاں اور اہم ہے اور کئی اعتبار سے منفرد بھی - اور دیکھیے علم کی دنیا میں تعصب کی کوئی گنجائش نہیں، تعصب علم کی نفی ہے، کسی شخصیت کے بارے میں تفریق و امتیاز کی بنیاد پر یا ذہنی تحفظات کی بنیاد پر رائے قائم کر لینا سراسر غیر علمی رویہ ہے اور صرف غیر علمی نہیں غیر اسلامی رویہ بھی ہے- دیانت کا تقاضا ہے کہ کسی بھی شخصیت کے بارے میں پہلے پوری معلومات حاصل کریں پھر کوئی رائے قائم کریں، رائے قائم کرنے کی ہر شخص کو آزادی ہے اور اس آزادی پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی لیکن سنی سنائی بات پر، تحفظات ذہنی کو لے کر تعصب کی بنیاد پر کسی کے بارے میں وہ خواہ مسلم ہو، یا غیر مسلم، کوئی رائے قائم نہیں کرنا چاہیے-

معاف کیجیے گا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تطبیق کی جو راہ نکالی تھی بعد کے لوگوں نے اس راہ پر چلنے کی زحمت نہیں کی، شاہ صاحب کا نام سب لیتے ہیں لیکن ان کی پیروی کرنے کی ہمت کسی میں نہیں، گویا شاہ صاحب کی ذات وہ وزنی پتھر ہے جسے چومتے سب ہیں لیکن انہیں کوئی اٹھانے کے لیے تیار نہیں—اس رویہ سے مجھے لگتا ہے کہ ان لوگوں کا نقصان تو نہیں ہوتا ہے جن کے تعلق سے عصبیت برتی جاتی ہے لیکن اس سے ہندوستان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کا غیر معمولی نقصان ہوا ہے- اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی کا معاملہ بھی یہی ہے کہ وہ غیر معمولی علمی تبحر کی حامل شخصیت ہیں، ان کی دین کی جو

تفہیم ہے وہ اپنے زمانے میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے- علمی اعتبار سے دیکھیے تو دنگ رہ جائیے کہ ایک شخصیت کتنے علوم وفنون کی حامل ہے، آج کے دور میں یک رخے پن کو تخصص کا نام دے کر توقیر بخشنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن ان کو دیکھیے تو وہ صحیح معنوں میں بحرالعلوم تھے، پھر ان کا عشق رسول کتنا بڑا سرمایہ ہے جس پر وہ سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں—اس کے باوجود کسی بھی شخص کو اختلاف رکھنے کا حق حاصل ہے، لیکن اختلاف کا حق ہے عناد کا نہیں، اختلاف تو خیر ہے، خود اعلیٰ حضرت کے جو نیاز مند ہیں، پیروکار ہیں ان لوگوں نے بھی بہت سی چیزوں میں ان سے اختلاف کیا ہے- لیکن یہ اختلاف حد ادب میں ہونا چاہیے—اس کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آپ کے جو افکار ہیں، خیالات ہیں، نظریات ہیں ان کے جملہ حقوق آپ اپنے پاس رکھیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تلاش کریں کہ وہ کون سی مشترکہ بنیادیں ہیں جہاں ہم میں اختلاف نہیں ہے- اب وقت آ گیا ہے کہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں فاضل بریلوی کسی ایک مسلک یا مکتب فکر کے نمائندہ کے طور پر نہ دیکھے جائیں بلکہ ہندوستان میں بلکہ جنوبی ایشیا میں جو اسلام اور مسلمان ہیں ان کے تابناک نمائندہ اور روشن مثال کے طور پر انہیں دیکھا جانا چاہیے- اور چوں کہ آپ سے گفتگو کر رہا ہوں اس لیے یہ اضافہ بھی کرنا چاہوں گا کہ اس سلسلے میں کام کرنے کی زیادہ ذمہ داری ان کی ہے جو اعلیٰ حضرت کے ماننے والے ہیں کہ وہ لوگوں کو ان کی طرف لانے کی کوشش کریں نہ کہ دوری پیدا کریں-

سوال:- ڈاکٹر اوشا سانیال کی تحقیقی کتاب The Devotional Islam & Politics in British India آپ نے پڑھی ہوگی جو چند سالوں قبل آکسفورڈ پریس سے چھپی ہے، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے کتاب وسنت کو اپنا معیار بنایا تھا، ان کے زمانے میں جتنی تحریکیں اٹھیں ان میں امام احمد رضا خاں نے اپنے معیار کے اعتبار جو بھی نقص پایا، اس کا تعاقب کیا، اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

پروفیسر اختر الواسع:- ان کا معیار کہنا غلط ہے، اعلیٰ حضرت کا کوئی اپنا اختراعی معیار نہیں تھا، میں یہ بات ارادی طور پر کہہ رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ یہ بات اہل علم کے بیچ

اور عالم لوگوں تک پہنچے- اعلیٰ حضرت بریلوی کا کوئی اپنا اختراعی معیار نہیں تھا، ان کا معیار
کتاب وسنت تھا، اس معیار پر جو آیا، انہوں نے اسے قبول کیا اور کتاب وسنت کے معیار پر
جو نہیں اترا اس کا تعاقب کیا اور کون شخص ہوگا جس کا اس پر ایمان نہیں ہوگا ۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

سیدھی سادی بات ہے جو اقبال نے کہی ہے

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونہ رسیدی تمام بولہبی ست

ہمارے نزدیک اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے- اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب بولہبی ہے- اس لیے
معیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے جو قرآن ناطق ہے، تو قرآن متلو اور
قرآن ناطق یہ ہیں معیار، اور یہی اعلیٰ حضرت کے معیار تھے، مولانا اشرف علی تھانوی نے
بھی یہی کہا کہ اگر وہ ہمارے مخالف تھے تو عشق رسول کی بنیاد پر تھے- تو سچی بات یہی ہے کہ
اعلیٰ حضرت کے یہاں کوئی ذاتی مخاصمت نہیں ہے، حسد نہیں ہے، بغض وکینہ نہیں ہے، جن کو
رسول اللہ پیارے تھے وہ احمد رضا کو پیارے تھے- بس-

سوال :- مولانا آزاد یونیورسٹی (حیدرآباد) میں اب میڈیکل اور دوسرے جدید
شعبوں کا آغاز ہو رہا ہے جس میں اردو میڈیم سے طلبہ تعلیم حاصل کر سکیں گے، اس تعلق سے
سوال یہ ہے کہ اردو سے Pass Out ہونے والے میڈیکل کے طلبہ کا مستقبل کیسا ہوگا؟
نیز کیا اس تجربے کو دوسری یونیورسٹیوں میں دہرایا جانا مناسب ہے؟

پروفیسر اختر الواسع :- سب سے پہلے میں یہ وضاحت کردوں کہ میرا تعلق مولانا آزاد
یونیورسٹی سے بہت محدود پیمانے پر ہے ، اس کا جو فاصلاتی کورس ہے اس کے شعبہ
اسلامیات سے میرا رشتہ ہے، اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں، لیکن جہاں تک اس کا سوال ہے
کہ انہوں نے میڈیکل اردو میڈیم سے کرانے کا ارادہ کیا ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں اور نہ

پریشان ہونے کی بات ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ آسان ہے لیکن اتنی مشکل بھی نہیں جسے سر نہ
کیا جا سکے- ویسے یہ تجربہ آج سے بہت پہلے ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ
ہی کیا جا چکا ہے- وہ لوگ آج بھی موجود ہوں گے جو اپنے پیشے سے جڑے ہوئے ہوں
گے- انہوں نے اردو سے میڈیکل کیا پھر مزید تعلیم حاصل کی اور پھر کامیاب علاج ومعالجہ
شروع کیا تو یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے-

اس کے ساتھ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس طرح کے سوالات ہمارے ذہن میں کہیں کسی
مرعوبیت کی وجہ سے تو نہیں اٹھتے ہیں، ہم نے یہ کیوں فرض کر رکھا ہے کہ میڈیکل یا دوسرے
عصری علوم صرف انگریزی سے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں، بھائی انگریزی کی عملداری کب
سے ہے؟ ۲۵۰ سال سے، ۲۵۰ سال پہلے جب تاج محل بنایا گیا تھا، جب قطب مینار کی تعمیر
ہوئی تھی، دہلی کی شاہجہانی مسجد اور لال قلعے کی تعمیر ہوئی تھی تو ان کے لیے
Architecture کی کون سی انگریزی اصطلاح تھی؟ ان کے بنانے والے کون تھے؟ وہ
کس آکسفورڈ اور کیمبرج سے پڑھ کر آئے تھے؟ وہ سب مدرسے کی پیداوار تھے، اب ہماری
تن آسانی ہے، کسالت ہے، احساس کمتری اور مرعوبیت ہے، ہماری بزدلی ہے کہ ہم نے
میدان چھوڑ دیا ہے، آپ میڈیکل کی بات کر رہے ہیں آپ یہ کیوں نہیں غور کرتے کہ کیا بو
علی بن سینا کی کتاب القانون فی الطب انگریزی میں ہے جسے میڈیسن کی بائیبل کا درجہ آج
بھی حاصل ہے اور آج بھی اس پر ریسرچ جاری ہے اور اس کا لکھنے والا کیا کوئی انگریز تھا؟
پتہ چلا کہ جب تک آپ میں جوش تھا، ذوق وشوق تھا، جب تک آپ میں ہمت موجود تھی،
دنیا آپ کی علمی فتوحات سے بہرہ مند ہو رہی تھی اور استفادہ کر رہی تھی لیکن تاریخ کا المیہ
ہے کہ ۔

کیا خبر تھی کہ وہ زمانے بھی ہیں آنے والے
سوتے رہ جائیں گے دنیا کو جگانے والے

اردو میڈیم سے میڈیکل کا کورس آسان نہیں لیکن کرنا چاہیں تو کیوں نہیں ہوگا؟
مسلمانوں پر جو ادبار وزوال ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بقول مولانا محمد علی جوہر

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ پستی میں پڑے ہوئے ہیں اور عقل کل سمجھے ہوئے ہیں، جاہل ہونا اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا جاہل آدمی کا اپنے کو قابل سمجھنا، یہ جہل مرکب افراد کو اور قوموں کو دونوں کو ختم کر دیتا ہے، ہماری بد نصیبی یہ ہے کہ ہم جہل مرکب کا شکار ہیں- پھر اردو کے تعلق سے بھی جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کرنے کی ضرورت ہے، اردو کسی مذہب کی زبان نہیں، وہ صرف کسی تہذیب کی ترجمان نہیں، وہ صرف شعر وشاعری کی زبان نہیں اور نہ صرف افسانہ اور قصے کہانیوں کی زبان ہے، اردو علمی زبان بھی ہے، اس سے پہلے بھی اس میں علمی کام ہوئے ہیں اور اب مزید کرنے کی ضرورت ہے-

پھر اردو سے میڈیکل کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوائیوں کے نام بدل کر اردو میں کر دیے جائیں، بیماریوں کے نام بدل دیے جائیں، جو اصطلاحات ہیں وہ تو انگریزی میں ہی رہیں گی صرف میڈیم بدلے گا اور اس طرح کا اگر کوئی تجربہ ہوتا ہے تو اس سے ہم پریشان کیوں ہوں ہمیں تو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے-

سوال:- یو.جی.سی کے ذریعہ منعقد ہونے والا NET کا امتحان اس سے پہلے اردو میڈیم سے بھی دینا ممکن تھا لیکن اب کچھ ماہ قبل اس پر پابندی لگ گئی جو اردو والوں کے لیے اور مسلمانوں کے لیے بڑی تشویش کی بات ہے، اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں کیا یہ پابندی ختم کی جاسکتی ہے؟

پروفیسر اختر الواسع:- میں تو اس سلسلے میں بہت پہلے رجسٹرڈ خط لکھ چکا ہوں، لیکن اس کے ساتھ یہ بتاؤں کہ یہ صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مسئلہ نہیں ہندوستان کی ان تمام یونیورسٹیز کا مسئلہ ہے جن میں اسلامیات یا اردو کا شعبہ ہے، اس کے لیے سب کو مشترکہ کوشش کرنی چاہیے، میں جب تک یو.جی.سی کے پروگرام سے وابستہ تھا، اس وقت تک اس طرح کی کوئی مصیبت نہیں تھی، دراصل بات یہ ہے کہ جو ہمارے ذمہ دار ہوتے ہیں انہیں ان چیزوں کی فکر نہیں ہوتی، وہ بالکل بے فکرے ہوتے ہیں، ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر یہ سب کیوں ہوتا

ہے؟ میں نے بہت تیکھا خط لکھا تھا، دوسروں کو بھی اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس کے خلاف تو ہمارے پاس ایک اور دلیل ہے، وہ یہ کہ جو طلبہ اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھ رہے ہیں ان سے یہ کہنا کہ آپ NET کا امتحان اردو میں نہ دیں یہ کہاں کا انصاف ہوسکتا ہے، دوسری بات یہ کہ مولانا آزاد یونیورسٹی میں مثال کے طور پر، جو استاذ مقرر ہوں گے وہ ظاہر ہے کہ اردو میڈیم میں پڑھانے والے ہوں گے تو اب وہ اساتذہ کہاں سے آئیں گے جو NET کا امتحان بذریعہ اردو دیے ہوں گے؟

حاصل کلام یہ کہ میں اس سمت میں کوشش کر رہا ہوں، ظاہر ہے ایک آدمی کے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس سمت میں پیش قدمی کریں اور اپنی آواز بلند کریں تاکہ ان کا حق انہیں ملے، بصورت دیگر اس سے اردو کے طلبہ اور ان طلبہ کو جو مدارس سے آتے ہیں بہت نقصان اٹھانا پڑے گا-

سوال:- موجودہ دور میں جب کہ انسان روحانیت سے مادیت کی طرف بھاگ رہا ہے، ایسے میں تصوف کی کیا اہمیت ومعنویت ہے؟

پروفیسر اختر الواسع:- آپ احسان کہیں، تزکیہ نفس کہیں، عرفان کہیں یا تصوف کہیں، آپ اس کا کوئی نام دیں، یہ عہد رسالت سے چلا آرہا ہے، اکے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ تصوف مادیت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کی بجائے وہ انسان کو مادیت میں غرق ہونے سے بچاتا ہے، تو آج ایک ایسی دنیا میں جہاں اسراف بے انتہا بڑھ گیا ہے، جہاں انسان جو Social Animal تھا اسے Economic Animal بنا دیا گیا ہے اور ایسے دور میں جہاں قلب ونظر کی جگہ صرف معدے کو دے دی گئی ہے، انسان کو صرف اور صرف خواہشات نفس کا پتلا بنانے کی ہر طرف سے کوشش ہو رہی ہے، تصوف کی ضرورت کل سے زیادہ ہے- دوسرے یہ کہ انسان کے اندر سے صلہ رحمی کا جو فقدان ہوتا جا رہا ہے، انسان رشتوں کے تقدس کو جس طرح فراموش کر رہا ہے، انسان جس طرح سے اپنی ذات میں سمٹتا ہی نہیں جا رہا ہے بلکہ اپنی ذات کے گرد طواف کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہے ایسے وقت میں تصوف ناگزیر ہے- اگر آپ کو انسانیت کو ہلاکت سے بچانا ہے، جنت سے نکالے گئے آدم کے بیٹے جس

طرح دنیا کو جہنم بنا رہے ہیں اگر اسے جہنم بننے سے بچانا ہے تو آپ کے پاس تصوف کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

ایک بات کی اور وضاحت کرتا ہوں کہ کچھ لوگ تصوف کو طریقت سمجھتے ہیں اور شریعت سے ماورا سمجھتے ہیں، میرے نزدیک طریقت اور شریعت دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے۔ تصوف کیا ہے وہ واضح رہنا چاہیے، سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی سے کسی نے پوچھا حضرت میں صوفی بننا چاہتا ہوں، انہوں نے کہا کہ بس آٹھ خصلتیں اپنے اندر پیدا کرلو، صوفی بن جاؤ گے (۱) ایثار (۲) اطاعت (۳) اشارہ (۴) صوف (۵) قناعت (۶) صبر (۷) غربت اور (۸) فقر۔ پھر اس کی وضاحت فرمائی کہ ایثار جیسا حضرت ابراہیم میں تھا، اطاعت ایسی جیسی اسماعیل کی تھی، اشارہ زکریا جیسا، صوف موسیٰ جیسا، قناعت عیسیٰ جیسی، صبر ایوب جیسا، غربت یحییٰ جیسی اور فقر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا جسے انہوں نے اپنا فخر قرار دیا۔ تو صحیح معنوں میں صوفی بننا آسان بھی نہیں ہے، آٹھ جلیل القدر پیغمبروں کی خصلتوں کی پیروی کے بعد یہ رتبہ ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سب لوگ اس کی ہمت نہیں کرپاتے۔

سوال :۔ ہندوستانی مسلمانوں کے بنیادی اور اہم مسائل کون سے ہیں اور غیر بنیادی اور غیر اہم مسائل کون سے ہیں؟

پروفیسر اختر الواسع:۔ اس سوال کے ذریعے ہم اور آپ ایک خطرناک وادی میں داخل ہو رہے ہیں، بہت ہی پیچیدہ سوال کر دیا آپ نے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے پچھلے سو سالوں میں ہمیشہ مقرر کو لیڈر بنایا ہے مدبر کو لیڈر نہیں بنایا۔ اور معاف کیجیے گا اکثر لوگ جنہیں قیادت کا شوق ہے ان کو شجاعت اور حماقت کے بیچ جو باریک فرق ہے اس کا ادراک نہیں ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ شجاعت کے زعم میں مسلمانوں کو ہمیشہ حماقت کی سرحدوں میں داخل کر دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور اہم ہے، وہ یہ ہے کہ مسلم قیادت نے مسلمانوں کو ہمیشہ ادھوری سچائیوں میں زندہ رکھا اور یہ خیال رکھیے کہ ادھوری سچائی سفید جھوٹ سے زیادہ ہلاکت خیز ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہماری قیادت نے مسلمانوں کو یہ تو بتایا کہ لوہا لوہے کو

کاٹتا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سا لوہا کون سے لوہے کو کاٹتا ہے۔ ٹھنڈا لوہا ہمیشہ گرم لوہے کو کاٹتا ہے، گرم لوہا جب بھی ٹھنڈے لوہے سے ٹکراتا ہے خود اپنی شکل مسخ کر لیتا ہے۔ ہماری ساری کوششیں اور کاوشیں گرمی تقریر، گرمی محفل اور گرمی جذبات سے ہیں۔

ہم نے مسلمانوں کو ایک اور ادھوری بات بتا رکھی ہے، وہ ہے **والقدر خیرہٖ وشرہٖ من اللہ تعالیٰ**، جو بھی اچھا یا برا ہوتا ہے وہ تقدیر سے ہوتا ہے اور وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ میرا بھی ایمان ہے اس پر اور جس کا ایمان نہ ہو اس پر وہ مسلمان نہیں ہے، لیکن یہ ادھوری سچائی ہے، اور یہ ادھوری سچائی اس فرمان الٰہی کے ساتھ مل کر پوری ہوتی ہے، **لیس للانسان الا ماسعی — والقدر خیرہ و شرہٖ من اللہ تعالیٰ** یعنی انسان کو کچھ نہیں ملتا اس کی کوشش کے بغیر لیکن جو کچھ اچھا یا برا ہوتا ہے وہ تقدیر کا ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ آپ صرف اس کو نظر کے سامنے رکھیے کہ سب کچھ تقدیر سے ہے تو کیا ہوگا ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھے رہیں گے۔ تو مسلمانوں کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے۔

اور جب بات چل ہی نکلی ہے تو مجھے ایک تیسری بات بھی کہنے دیجیے، خوگر مدح سے ذرا تھوڑا سا اور گلہ سن لیجیے۔ ہم ماضی میں جینے کے عادی ہو گئے ہیں، ماضی کے تحفظ کا میں بھی قائل ہوں، اپنے ماضی سے رشتہ توڑنے کے لیے میں بھی تیار نہیں ہوں، لیکن ماضی میں ہی زندہ رہنا اور حال سے بے گانہ اور مستقبل سے بے فکر رہنا، یہ قوموں کو کہیں کا نہیں چھوڑتا، یہ کہتے رہنا اور فخر کرتے رہنا کہ اس ملک کو ہم نے قطب مینار کی بلندی دی، تاج محل کا حسن دیا، لال قلعہ کی پختگی دی، شاہجہانی مسجد کا تقدس دیا، معین الدین اور نظام الدین کا عرفان عطا کیا، یہ کب تک کام دے گا، آپ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ جب تک یہ سب آپ دیتے رہے آپ ہی کو ظل الٰہی سمجھا جاتا رہا، اب آپ دوسروں کو کیا دے رہے ہیں کہ کوئی آپ کو کچھ گردانے؟ اور دینا تو بڑی بات آپ تو لینا نہیں جانتے، لینے کے نام پر بھی لفظی انتقام لیتے ہیں۔ تو یہ ہیں ہمارے مسائل، ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کون تھے اور کہاں تھے اور اب کیا ہیں اور کہاں ہیں؟ مسلمانوں کے حقیقی مسائل یہ ہیں، اس پورے فکری سانچے کو، پوری عملی روش کو جب تک آپ نہیں بدلیں گے کوئی چیز نہیں بدلے گی۔

مسلمانوں کو ایک اور بات سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا کا کوئی نظریہ، کوئی فلسفہ اور کوئی پالیسی ان کے کام نہیں آئے گی، زندہ قوموں کی کامیابی کے لیے سراپا رحمت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دو معیار دیے ہیں وہی دنیا کے دوسرے لوگوں کے بھی کام آئے ہیں اور وہی آپ کے بھی کام آئے ہیں اور آئیں گے، اور وہ دو معیار ہیں تعلیم اور تجارت۔ جس کے پاس تعلیم ہوتی ہے، علم ہوتا ہے، روز آفرینش ہی یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اس کے سامنے دوسروں کو جھکنا پڑے گا، فرشتے نہیں جانتے تھے اور آدم جانتے تھے اسی لیے فرشتوں کو آدم کا سجدہ کرنا پڑا، اس طرح خالق کائنات نے اسی روز یہ قانون بنا دیا کہ جو نہیں جانتا ہے اسے جاننے والے کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ جب تک آپ جانتے تھے ساری دنیا آپ کے سامنے جھک رہی تھی اور جب آپ کچھ نہیں جان رہے ہو تو آپ خوار پھر رہے ہو اور ہر کس و ناکس کے سامنے جھک رہے ہو۔ یہ ہمارا فکری دیوالیہ ہے کہ ہم نے علم کو دین اور دنیا میں بانٹ دیا، علم کی تو ایک ہی تقسیم ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے، علم نافع اور علم غیر نافع ۔ایک بات بڑی ذمہ داری سے عرض کروں گا کہ تاریخ انسانی میں صرف جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے ایک ایسا نظام تعلیم قائم کیا جس میں سارے طالب علم مسلمان تھے اور سارے اساتذہ کافر تھے، بدر کے موقع پر، اور آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ حکمت مومن کی گمشدہ پونجی ہے اسے جہاں پاؤ وہاں سے لے لو، اسے عمل کر کے دکھایا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جب تعلیم کی بات آئے تو طالب علم کا مذہب دیکھو اور استاد کی مہارت اور قابلیت پر نگاہ رکھو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مسلمانوں کو دوسرا معیار دیا ہے وہ ہے تجارت، یہ اٹل فیصلہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں مَنڈی ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں مُنڈی ہوتی ہے۔ جب تک آپ دنیا میں تجارت کر رہے تھے آپ کے سر پہ تاج تھا، آپ نے تجارت کو چھوڑا تاج سے محروم ہو گئے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی اتنی تاکید کیوں فرمائی؟

چوں کہ مسلمانوں کے مسائل پر بات چل رہی ہے اس لیے ایک بات اور عرض کر دوں کہ ہماری پریشانی یہ ہے کہ ہمارے سیاسی رہنما ہوں یا مذہبی رہنما، وہ تمام جدید

(Modern) میڈیم کو استعمال کر رہے ہیں لیکن ان کا Idiom آج بھی عہد وسطی والا ہے، انہوں نے اپنے لہجے کو نہیں بدلا۔ ہر زمانے کی اپنی لفظیات ہوتی ہے، ایک ذہنی سطح ہوتی ہے، اس کو مدنظر رکھے بغیر جو بات آپ کریں گے اگر وہ اچھی ہوگی جب بھی موثر نہیں ہوگی۔ لوگوں کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھ کر باتیں کرنے کا حکم تو ہمیں حدیث سے ملا ہے، اس لیے میں مسلم رہنماؤں کو اس سمت بھی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنا لہجہ، لفظیات اور انداز گفتگو بدلیں، یہ زمانہ نہ مناظرے کا ہے اور نہ ہی مجادلے کا، یہ مکالمے کا دور ہے۔ اس سے ہٹ کر آپ اس دور کے لوگوں کو متاثر نہیں کر سکتے، اس کے ساتھ دعوتی نقطۂ نظر سے یہ بات عرض کر دوں کہ آپ کا کام Communicate کرنا ہے Convert کرنا آپ کا کام نہیں ہے، اس لیے ہمیشہ ڈنڈا اٹھانے کی کوشش مت کیجیے۔

ایک آخری بات یہ عرض کر دوں کہ جب تک ہم میں خود اعتمادی اور خدا اعتمادی تھی، ہم سب کے قریب آنے کی کوشش کرتے تھے اور جب سے خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کو کھویا ہے ہم سب سے دور ہونے کی کوشش کرنے لگے ہیں، بھاگنے لگے ہیں کہ کہیں دوسروں کا سایہ نہ پڑ جائے، جبکہ دعوتی نقطۂ نظر سے خیر امت ہونے کے لحاظ سے تو ہمیں دوسروں کے بہت زیادہ قریب آنے کی ضرورت ہے۔

سوال:۔مدارس سے یونیورسٹیز آنے والے طلبہ سے آپ کا تعارف ہوتا رہتا ہے، اب تک آپ نے ان کی نفسیات اور صلاحیتوں کا جو مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں بتائیں کہ عصر حاضر کے چیلنجز کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں آپ کیا مشورہ دیں گے؟

پروفیسر اختر الواسع:۔ایک بات میں برابر کہتا رہتا ہوں کہ ہم نے مدارس کے دروازے جامعہ کے لیے اس لیے نہیں کھولے ہیں کہ مدارس سے آنے والے طلبہ دنیا کے رنگ میں رنگ جائیں اور اپنی شناخت کھو دیں۔ میں ہمیشہ اس کی تاکید کرتا ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ ان طلبہ نے جو اپنی روش بنا رکھی ہے کہ وہ اردو، عربی، اسلامک اسٹڈیز اور فارسی کے علاوہ دوسرے شعبے کی طرف رخ ہی نہیں کرتے انہیں اپنی روش اور انداز فکر بدلنا ہوگا۔ کیوں کہ جتنی عربی وہ یہاں بی اے اور ایم اے میں پڑھتے ہیں اتنی عربی وہ مدرسے

میں پڑھ کے آئے ہوتے ہیں اردو کا بھی یہی معاملہ ہے- مدارس کا جب یونیورسٹیز سے الحاق ہوا، خاص طور سے ہمارے بزرگوں نے مدارس کے لیے جب جامعہ ملیہ کا دروازہ کھولا تو ان کے سامنے یہ بات تھی کہ مدارس سے آنے والے طلبہ انسانی علوم اور سماجیات زیادہ سے زیادہ پڑھیں، بقیہ تو یہ پڑھ کر آتے ہیں، انہیں سب سے زیادہ زور انگریزی پر اور دوسرے سماجی علوم پر دینا چاہیے کہ وہ دینیات تو پڑھ کے آتے ہیں اگر وہ انگریزی اور دوسری یورپی زبانیں سیکھ لیتے ہیں اور دوسرے سماجی علوم کا گہرا مطالعہ کر لیتے ہیں تو ان کو مادی فوائد حاصل ہوں گے اور ہمیں روحانی فوائد، مادی فوائد انہیں کیسے حاصل ہوں گے یہ تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں اب رہا ان سے ہمیں روحانی فوائد کیسے ملیں گے؟ تو وہ اس طرح کے وہ طلبہ دین اور دنیا کا اپنے اندر امتزاج پیدا کر لیں گے، دین تو پہلے سے سیکھے ہوئے ہیں جب وہ دنیا کو بھی حاصل کر لیں گے تو وہ دین اور دنیا کے بیچ جو خلیج ہے اس پر پُل کا کام کریں گے اور رفتہ رفتہ پھر یہ ہوگا کہ یہ چیلنج ہی ختم ہو جائے گی- وہ دین کی اعلیٰ سطح پر خدمت بھی کریں گے اور دنیاوی جاہ وجلال بھی انہیں حاصل رہے گا-

اصحاب مدارس اور ذمہ داران مدارس سے ایک گزارش یہ کروں گا کہ انہوں نے اردو کو تعلیم کی زبان تو بنا رکھا ہے لیکن اردو کا کوئی پرچہ وہاں نہیں ہوتا، اگر کوئی اردو کا پرچہ بھی شامل ہو جائے تو یہ بہت ہی اچھا رہے گا، میں نے بعض لوگوں سے اس سلسلے میں گفتگو کی تو وہ کہنے لگے کہ جناب آپ یہ چاہتے ہیں کہ مدارس میں فسق وفجور پڑھایا جائے- سوال ہے کہ آپ امرأالقیس کو کیوں پڑھتے ہو، وہ کتنا بڑا اصالح اور متقی تھا، متنبّی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو نبوت تک کا دعویدار ہے، آپ اسے پڑھا رہے ہو- بہرحال لسانیات کی درستگی کے لیے اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے- آخر میں کہوں گا کہ جو طلبہ مدارس سے یونیورسٹیز آ رہے ہیں انہیں اس طور پر اپنی تیاری کرنی چاہیے کہ ان کے ایک ہاتھ میں جام شریعت ہو تو دوسرے میں سندان عشق- اور اگر سرسید کی زبان میں کہنے کی اجازت دیں تو ہمارے طلبہ کے دائیں ہاتھ میں فلسفہ ہو، بائیں میں سائنس ہو اور سر پر کلمہ طیبہ لا الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہو- یہ نئے دور میں تعلیمی مثالی مسلم نوجوان کی مثال ہے جس کو وجود میں

لانے کی کوشش ہونی چاہیے-

سوال:- اسلام پر آج زیادہ کام کرنے والے غیر مسلم ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پر آج زیادہ تر کام منفی نوعیت کا ہو رہا ہے، ایسے میں اسلامیات کا شعبہ سب سے مضبوط ہونا چاہیے اور اسلامیات کے طلبہ کو بڑے طاقت ور اور باصلاحیت فوجی ہونا چاہیے تاکہ وہ دفاع کا کام بخوبی کر سکیں لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے، کہا جاتا ہے کہ اسلامیات میں وہی طلبہ جاتے ہیں جن کا داخلہ دوسرے شعبوں میں نہیں ہوتا، آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

پروفیسر اختر الواسع:- یونیورسٹیز کے اندر دراصل Raw Product آتا ہے اور ہم اس کی Finishing کرتے ہیں، آپ اگر بالو بھیجیں گے تو ہم اسے سیمنٹ نہیں بنا سکتے، ہمارے پاس تو جو Product آتا ہے اسے Finishing Tuch دے کر اپنی مہر لگا دیتے ہیں، لیکن ایک بات کا خیال رکھیے کہ صدفی صد ایک نمبر کا مال نہ تو کوئی مدرسہ تیار کرتا ہے اور نہ کوئی یونیورسٹی، سارے مدارس شاہ ولی اللہ پیدا نہیں کیے، ندوہ سے نکلنے والے سب سید سلیمان ندوی نہیں بنے اور نہ ہی بریلی سے آنے والے سب مولانا امجد علی اعظمی بنے- تو بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اسی مقدار سے معیار بھی آئے گا، آپ مقدار کو برامت کہیے ہاں معیار کو بہتر بنانے کی کوشش کیجیے- یاد رکھیے جب تک دودھ نہیں ہوگا مکھن کہاں سے نکالیں گے؟

اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ سارے غیر مسلم منفی کام ہی نہیں کر رہے ہیں، بہت سے غیر مسلم بہت ہی معروضی، مثبت اور علمی انداز میں کام کر رہے ہیں، اس لیے میں بہت زیادہ پریشان نہیں ہوں اور اس لیے بھی نہیں ہوں کہ اگر وہ منفی کر بھی رہے ہیں تو اس کے پس پردہ بھی اسلام کی عظمت اجاگر ہو رہی ہے- یعنی اسلام اس اہمیت کا حامل ہے ان کے نزدیک کہ وہ اس پر عرق ریزی کریں- وہ اسلام کو غیر معمولی طاقت کا حامل سمجھ رہے ہیں، پھر یہ کہ یہ تو کوئی نئی بات بھی نہیں، شروع سے ایسا ہی رہا ہے، بقول اقبال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

تو شرار بولہبی تو شروع سے ہے، ہاں اس کا نام، انداز اور طریق کار مختلف رہے ہیں لیکن چراغ مصطفوی بجھا نہیں ہے وہ روشن ہی ہوتا گیا ہے- بغداد پہلی دفعہ نہیں لوٹا گیا ہے، لیکن ہلاکو کہاں ہے کوئی نہیں جانتا اور بغداد آج بھی موجود ہے اور ایک بات اور یاد رکھیے کہ جو دین اور جو امت سانحۂ کربلا کے بعد زندہ ہے، سقوط بغداد کے بعد زندہ ہے، برصغیر میں ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے بعد زندہ ہے، ۱۹۹۲ء اور ۲۰۰۲ء کے بعد زندہ ہے وہ آگے بھی زندہ رہے گی، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے- صرف اپنے رویے کو بدلنے کی ضرورت ہے مسلمانوں کو، اور وہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کریں، پھر دیکھیں ہر چیز ان کی ہوگی، ان شاء اللہ-

سوال: -ماہنامہ جام نور کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

پروفیسر اختر الواسع: -خوشی کی بات یہ ہے کہ اہل سنت و جماعت جسے ہم سنی بریلوی تحریک بھی کہتے ہیں، کے یہاں غیر معمولی بیداری آئی ہے، ادھر ان کی سرگرمیاں بڑھی ہیں، نئے مدرسے وجود میں آئے ہیں، لٹریچر پر کام ہو رہا ہے، کئی اچھے رسالے نکل رہے ہیں، یہ بہت ہی خوش آئند بات ہے، ان کی بعض چیزوں سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن مجھے اس بات سے خوشی ہے کہ ادھر ان میں خوشگوار، مثبت پیش رفت دیکھ رہا ہوں، جام نور کا مئی کا اجتہاد وتقلید پر خصوصی شمارہ دیکھا، اس میں آپ نے ہر مکتب فکر کو نمائندگی دی ہے، یہ توسع مجھے پسند آیا، عصر حاضر میں مکالمے کا یہی تقاضا ہے، خوشتر نورانی اپنے جد امجد کا علمی مشن آگے بڑھا رہے ہیں اور میں اسے صرف ہندوستان نہیں برصغیر بلکہ جنوبی ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل کے لیے نیک فال تصور کرتا ہوں- میں بہت پر امید ہوں-□□□

(شمارہ اپریل ۲۰۰۸ء)

سید محمد اشرف مارہروی

انکم ٹیکس کمشنر، دہلی

مولانا احمد رضا محدث بریلوی (۱۸۵۶ء-۱۹۲۱ء) کا پیر خانہ، خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ عصر حاضر میں تبلیغ واشاعت دین کے حوالے سے نہ صرف ممتاز و نمایاں ہے بلکہ برصغیر کی دوسری خانقاہوں کے لیے نمونہ اور مشعل راہ بھی- اسی خانوادے کی ایک علمی شخصیت کا نام ہے سید محمد اشرف، جو اپنی خاندانی وجاہت، دینی وقار، علمی بلندی اور فکری بالیدگی کی وجہ سے برصغیر ہند و پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں تعارف کے محتاج نہیں- آپ کی پیدائش ۱۹۵۷ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم والد ماجد احسن العلماء مولانا سید مصطفیٰ حیدر حسن کی خدمت میں حاصل کی، اسکول کے بعد ۱۹۷۲ء میں شہر علم و فن علی گڑھ حاضر ہوئے، اردو سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کیا اور گولڈ میڈل سے سرفراز ہوئے بعد ازاں سول سروسیز امتحانات کی تیاری میں مصروف ہوئے اور ۱۹۸۱ء میں اردو سے کامیاب ہو کر اردو والوں کا سر فخر سے اونچا کیا، پھر ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے انکم ٹیکس کمشنر کے منصب پر فائز ہوئے، لیکن باوجود اپنی تمام تر منصبی مصروفیات کے لوح وقلم سے رشتہ ہموار رکھا اور زبان وادب کی آبیاری میں مسلسل لگے رہے- آپ کی نوک قلم نے مختلف دینی وملی موضوعات پر مقالات و مضامین بھی تخلیق کیے لیکن آپ کی خاص دلچسپی ادب سے رہی- ادبی دنیا میں آپ کی پہچان آپ کے افسانے ہیں اور ان میں مذہبی اور صوفیانہ رنگ آپ کی تخلیقیت کا خاص وصف ہے- آپ کے افسانوں کے مجموعوں میں ''ڈال سے بچھڑے''، ''باد صبا کا انتظار'' بہت مقبول ہیں، آخر الذکر پہ تبصرہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی جیسے ناقد نے اعتراف کیا کہ ''زمانے کے بعد ایسی معیاری تخلیق نظر سی گزری'' اور اسی پر ۲۰۰۵ء میں ادب کا معروف اعزاز ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے موصوف کو نوازا گیا-

سوال:-علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے ہوتے ہوئے علی گڑھ میں ہی جامعۃ البرکات کے قیام کا خاص مقصد کیا ہے؟

سید محمد اشرف مارہروی:-۱۹۹۵ء میں جب جامعۃ البرکات کے قیام کے واسطے والد گرامی حضور احسن العلماء قدس سرہ سے ہدایت چاہی تو فرمایا کہ ادارے کا قیام علی گڑھ میں ہونا چاہیے کہ وہاں بہت سی سہولتیں ہیں جو کسی تعلیمی ادارے کے قیام کے لیے ضروری ہوتی ہیں-یوں بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے خانوادے کا تعلق چار پشتوں سے ہے، دادا حضرت سید آل عبا، تایا حضرت سید العلماء، برادر محترم حضرت امین ملت اور برادر عزیز سید محمد افضل اور اب ہمارے بچے-تو ایک طرح سے علی گڑھ کا ہم پر قرض بھی ہے، ہر ادارے کی گنجائش محدود ہوتی ہے، داخلہ دینے کی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت فراہم کرنے کی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر دن بہ دن طلبہ کی تعداد کا بار بڑھتا جا رہا ہے-اللہ کے بھروسے پر ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی جو معیاری تعلیم و تربیت ان طالب علموں کو فراہم کر سکے جو یونیورسٹی میں داخلے سے محروم ہو کر مایوس ہو جاتے ہیں-اسلامی ماحول میں عصری تعلیم کے مختلف سطح کے اداروں کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ طالب علم یہاں اعلیٰ پروفیشنل کورس مثلاً B.C.A-B.B.A-M.B.A وغیرہ مکمل کر کے فوری طور پر باوقار ذریعہ معاش حاصل کر سکیں-

سوال:-جامعۃ البرکات کے نظام تعلیم و تربیت اور نصاب تعلیم کی کیا خصوصیتیں ہیں، جو اسے دوسرے اداروں سے ممتاز کرتی ہیں؟

سید محمد اشرف مارہروی:-جامعہ البرکات کے قیام سے قبل اس کے نظام تعلیم اور نصاب کے تعین کے سلسلے میں ہم نے ایک سیمینار کا انعقاد ہی صرف اس لیے کیا تھا تا کہ کوئی کام جلد بازی میں نہ ہو بلکہ ادارے کی نہج کا تعین قوم کے باشعور دانشور تعلیم یافتہ طبقے اور علمائے کرام کے باہمی مشورے اور ان کی صحت مند تجاویز کی روشنی میں ہو اور اس میں ہم کامیاب بھی ہوئے، کئی یونیورسٹیز کے شیخ الجامعہ حضرات، حکومت ہند کے تجربہ کار افسران

اور تعلیم سے وابستہ ماہرین کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے معروف اور معتبر علماء کرام نے اس سلسلے میں اپنے مشوروں اور اہم تجاویز سے نوازا، جن کے اثرات ہمیں اس کے قیام کے بعد دیکھنے کو مل رہے ہیں-

البرکات میں فی الحال جو نظام اور نصاب رکھا ہے وہ موجودہ دور کے تقاضوں کے مد نظر رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا خیال بھی رکھا گیا ہے کہ ہمارے ادارے کا طالب علم عصری تعلیم کے ساتھ اپنے مذہبی تقاضوں کو بھی پورا کر سکے-فی الحال یہاں پبلک اسکول، مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ، جامعہ ہمدرد سے ملحق مختلف کورس جاری ہیں، تقریباً ۳۰۰ طالب علموں کے لیے رہائشی ہاسٹل کی سہولت بھی موجود ہے-کسی بھی ادارے کی کامیابی کا دار و مدار وہاں کے اساتذہ پر ہوتا ہے اور اساتذہ کے انتخاب کے سلسلے میں جو احتیاط کی جاتی ہے اور جو پیمانے ہماری سوسائٹی نے مرتب کیے ہیں ان سے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں-ہمارا ادارہ اچھے Salary package کی فراہمی کے ساتھ اچھے اساتذہ کو منتخب کرتا ہے تا کہ بچوں کو وہ حضرات پوری دیانت داری کے ساتھ تعلیم و تربیت فراہم کرا سکیں، ہم طالب علموں سے اور بالخصوص رہائشی طلبہ سے بڑی میانہ روی کے ساتھ ایسی فیس چارج کرتے ہیں جو نہ والدین کی جیب پر گراں ہو اور نہ ہی ادارے کو کسی خسارے کا منہ دیکھنا پڑے-اعلیٰ تعلیم، خورد و نوش، علاج معالجے، ورزش وغیرہ سے متعلق جو سہولتیں یہاں فراہم کی گئی ہیں انہیں دیکھنے کے لیے آپ کو ایک بار وقت نکال کر کیمپس میں آنا ہوگا-جہاں تک امتیاز کا سوال ہے تو بفضلہ تعالیٰ بہت قلیل مدت میں جامعہ البرکات نے علی گڑھ میں اپنی ایک انفرادی شناخت قائم کی ہے، ہمارے طلبہ چاہے وہ کھیل کا میدان ہو یا ادبی ثقافتی سرگرمیاں اپنے فن کے جوہر دکھا رہے ہیں، ساتھ ہی پابندیٔ اوقات سے نماز، تعلیم قرآن و حدیث کا انتظام ہے، دینی و ملی جذبہ کی بیداری کے لیے ادارے کے اساتذہ و انتظامیہ پوری توجہ اور لگن کے ساتھ اپنے کام انجام دے رہے ہیں جس کے اثرات ہمارے طلبہ میں دور سے نظر آتے ہیں-البرکات پبلک اسکول میں عصری اسکولی تعلیم کے علاوہ بچوں کو عربی ایک مستقل مضمون کی شکل میں پڑھائی جاتی ہے اور قرآن کا درس اور دینیات باقاعدہ نصاب کا حصہ ہیں-ہر مہینے

بچوں کی دینی تربیت کے لیے خصوصی لیکچر کا انتظام ہوتا ہے جس سے طلبہ میں اسلامیات
کے حوالے سے معلومات میں اضافہ ہو- انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اسکول میں MBA کا
کورس بڑی کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور الحمدللہ تعلیم سے لے کر طلبہ کے Final Job
Placement تک کا انتظام ہے، البرکات میں داخلہ کے لیے طلبہ پیش گی رجسٹریشن
کراتے ہیں اور ایک بھی سیٹ خالی نہیں رہتی، الحمدللہ-

البرکات کا ایک اور اہم منصوبہ ہے، البرکات اورینٹل اسٹڈیز کا قیام، ایک ایسا ادارۂ
تحقیق جو اہم اسلامی موضوعات کے علاوہ ملت کے مختلف مسائل پر تحقیقی نوعیت کے کام
کرے، بین اللسانی تراجم کا کام کرے، عالم و فاضل طلبہ کو موجودہ دنیا سے روبہ رو ہونے
میں تعاون کرے- ہم ایک ایسی لائبریری کا قیام چاہتے ہیں جو علمی نوادرات اور مخطوطات کا
مرکز ہو، اس کی ابتدا ہو چکی ہے، الحمدللہ- ہماری بچیاں اگر کم علم اور بے تربیت ہوں تو ہم خود
کو اپنے مقصد میں پورے طور سے کامیاب نہیں مان سکتے، اراکین سوسائٹی کی دلی خواہش
ہے بچیوں کے لیے الگ سے تعلیم اور قیام کا انتظام ہو، تاکہ وہ اپنے ماحول میں آزادی کے
ساتھ بے خوف ہو کر تعلیم پر اپنی توجہ مرکوز کر سکیں- نیت صاف ہو تو منزل آسان ہوتی ہے-
اللہ پر یقین کامل ہے، اس کی رحمتوں پر بھروسا کر کے سوسائٹی نے اس کام کا بھی آغاز کر دیا
ہے، لڑکیوں کا ہاسٹل زیر تعمیر ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ آنے والے دنوں میں بچیاں البرکات
گرلس اسکول میں ہاسٹل کی سہولت کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں گی- اس کے علاوہ
B.Ed کورس شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کی تمام کاغذی اور دستاویزی کارروائیاں
مکمل ہو چکی ہیں- عنقریب یہ کورس بھی شروع ہو جائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ-

ہم اپنے اداروں کا امتیاز یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارے طالب علم ہم پر بھروسا کرتے ہیں او
رہمارے رفقاء خود کو اس ادارے میں محفوظ جانتے ہیں- حضرت امین ملت کی سرپرستی میں
ادارے کے اراکین اس عزم کے ساتھ کام کرتے ہیں کہ ہمارے اداروں میں اعلیٰ تعلیم کے
ساتھ عمدہ تربیت بھی ہو اور جب یہاں سے طالب علم فارغ ہو کر جائے تو حضرت علی کرم
اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے اس قول پر ایمان لا چکا ہو کہ ''اصل حسن علم اور اخلاق میں ہے'' یہ

قول البرکات کے مونوگرام پر کندہ ہے-

سوال:- سچر کمیٹی کی رپورٹ ہمارے سامنے ہے، جس میں مسلمانوں کو ہر سطح پر
پسماندہ دکھایا گیا ہے، کمیٹی کی اس رپورٹ سے آپ کتنا اتفاق رکھتے ہیں؟ اگر واقعی یہ
رپورٹ حقائق پر مشتمل ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ہندوستانی حکومتیں، آزادی کے بعد
ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات یا خود مسلمان؟

سید محمد اشرف مارہروی:- آزادی کے بعد سے لے کر آج تک ہماری قوم یکے بعد
دیگرے سیاسی پارٹیوں کے ہتھیار کی شکل میں استعمال ہوتی رہی ہے، جس سے اقتدار
حاصل کیا جاتا ہے، ہر سیاسی پارٹی اور سیاست داں یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ مسلمانوں کی
سنجیدہ حصہ داری کے بغیر اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا- لہٰذا کبھی دوست بنا کر اقتدار حاصل کر لیا
جاتا ہے اور کبھی دشمن بنا کر برادران وطن کی حمایت حاصل کی جاتی ہے، یہ ایک ایسا کھیل ہے
جس میں ٹیم کے کھلاڑی بدلتے رہتے ہیں اور کھیل جاری رہتا ہے-

سچر کمیٹی کی رپورٹ یقیناً بہت محنت کے ساتھ تیار کی گئی ہے اور اس میں جو سفارشات
ہیں وہ یقیناً مسلمانوں کے فلاح میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں، جہاں تک آپ ذمہ
داری کی بات کرتے ہیں تو میں بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کہتا ہوں صحیح اور ایمان دار قیادت کا
فقدان سب سے زیادہ ذمہ دار ہے- ہمارے اندر جب تک بیداری نہیں آئے گی، اپنے
محاسبے کی تمیز نہیں آئے گی، قوت ارادی، معاملات میں استحکام، فیصلہ کرنے کی طاقت،
باہمی اتحاد جب تک نہیں ہوگا کوئی پارٹی، کوئی رپورٹ ہمیں ملک میں وہ عزت اور وقار نہیں
دے سکتی جس کی ہم تمنا کرتے ہیں- سچر کمیٹی کی رپورٹ ایک اچھی ابتدا ہے، خدا کرے کہ
اس کی سفارشات کا نفاذ اس طرح ہو کہ مسلمان صرف اقتدار میں ہی حصہ دار نہ بنیں بلکہ اپنی
افرادی قوت کی بنیاد پر دنیا کی اس سب سے بڑی جمہوریت میں صاحب اختیار بھی بن
سکیں، اقتدار میں حصہ داری اور صاحب اختیار ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ مجھ سے زیادہ
اچھی طرح جانتے ہیں-

سوال:- سیاسی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے لیے مسلمانوں کی حکمت عملی کیا ہونی

چاہیے؟

سید محمد اشرف مارہروی:- سیاسی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے لیے مسلمانوں کی حکمت عملی کا جہاں تک تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم تعلیمی اور معاشی ترقی حاصل کر لیں تو سیاسی ترقی کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے-

بے روزگاری اور جہالت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، دونوں ایک دوسرے سے بڑی حد تک وابستہ ہیں، کسی ایک کو پہلے درست کرنا ضروری ہے، جہالت کا مسئلہ نسبتاً آسانی کے ساتھ رفع ہو سکتا ہے کیوں کہ اس کے سد باب کے اداروں کی تعداد زیادہ ہے- اچھے تعلیمی اداروں کا اجراء اور ضرورت مند طلبہ کی مالی مدد کرنا اس مسئلے کو بڑی حد تک کم کر سکتا ہے- اس بڑے کام کے لیے منصوبہ بند طریقے سے مخلص اور دانش مند حضرات کو ادارہ سازی کرنا ہوگی، ساتھ ہی ساتھ اس بات کا شعور بھی پیدا کرنا ہوگا کہ چھوٹی چھوٹی صنعتوں سے وابستہ یا دست کاریوں سے متعلق افراد کو حکومتی تعاون کا فیض لے کر اپنی صنعتیں اور دست کاریاں مضبوط کرنا چاہیے- مائنارٹی فائنانشیل اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشن اس سلسلے میں خاصی مددگار ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ لال فیتہ شاہی کو توڑا جا سکے- مسلمانوں کی اکثریت والی آبادی کے کم تعلیم یافتہ نوجوانوں کو منظم کر کے وہاں کے سمجھ دار اور تجربہ کار افراد اپنے ہی شہر کو ٹارگیٹ بنا کر دیکھیں کہ افراد کارپوریشن سے قرض حاصل کر رہے ہیں یا نہیں اور یہ کہ وہ اس کا استعمال ٹھیک طرح سے کر رہے ہیں یا نہیں- وقت کی اتنی قربانی دینا لازمی ہے-

ضلع پنچایت اور مختلف روزگار یوجناؤں سے بھی اسی طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ہر چھوٹے بڑے شہر میں کوئی بھی صاحب استطاعت اپنے گھر کا باہری کمرہ شام کے اوقات میں اس کام کے لیے وقف کر دے کہ وہاں ایک مقررہ وقت میں لوگوں کو تعلیم اور معیشت کے بارے میں حکومت کی پالیسی سے مطلع کیا جائے گا اور اس کا فائدہ اٹھانے کے سلسلے میں جن فارموں وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تسلیم کیے جائیں گے، جہاں کوئی مخصوص دست کاری ہے وہاں کے مسلمان امداد باہمی کی انجمن بنا کر چھوٹے چھوٹے قرض لے کر اپنے روزگار کو مضبوط کر سکتے ہیں- بنگلہ دیش کے محمد یونس کی مثال سے فائدہ اٹھانا چاہیے جنہوں

نے چھوٹے چھوٹے قرضوں کا انتظام مضبوط کیا اور اپنی اس کارکردگی کے اعتراف میں نوبل پرائز پایا-

معیشت کے جو سیکٹر منظم ہیں ان میں روزگار کی گنجائش کم ہوتی ہے، غیر منظم سیکٹروں میں تھوڑی سی محنت اور جانفشانی سے کرشمے دکھائے جا سکتے ہیں- ہماری جن آبادیوں میں اسکولوں کی کمی ہے وہاں کے سیاسی نمائندوں سے زور ڈلوا کر اسکول کھولنے کی کوشش کی جانی چاہیے، تعلیم کا معاملہ ہو یا روزگار کا، کسی بھی راہ میں کالی دیوار نہیں کھڑی ہے کہ ہم آگے بڑھ ہی نہ سکیں- مضبوط ارادے اور محنت نے ہمیشہ ظلمت کا سینہ چیرا ہے، وہی ہتھیار پھر استعمال ہونے چاہیے-

جہاں تک سیاسی ترقی کا سوال ہے اس کے لیے ہمیں استدراک عمل کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا، جو سیاسی پارٹیاں صریحاً مسلمانوں کے خلاف نہیں ہیں ان کے امیدواروں کو اپنی شرطوں پر جیتنے میں مدد کرنا ایک اچھا قدم ہوگا- جہاں مسلمان بڑی تعداد میں ہیں وہاں بہتر امیدوار کو الیکشن جیتنے میں مدد کرنا چاہیے اور ایسی پارٹیوں کو مضبوط کرنا چاہیے جو الیکشن جیت کر مسلمانوں کو اقتدار میں بھی ساتھی بنائیں اور اختیار میں بھی- ان سب کے لیے ایک تعلیم یافتہ، مخلص اور مضبوط قیادت کا ہونا لازمی ہے، ایک ایسی قیادت جو سیاسی پارٹیوں کو الیکشن میں جتانے سے پہلے ان کے منشور (Manifesto) کو سمجھنے اور اسے تبدیل کرانے کی صلاحیت رکھتی ہو اور برسر اقتدار آنے کی صورت میں اس منشور کو نافذ کرانے کی سیاسی بصیرت سے بھی مالا مال ہو-

سوال:- سول سروسیز کے امتحانات سے مسلمان اب تک برگشتہ کیوں ہیں؟ اس کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہمیں کون سے اقدامات کرنے چاہیے؟

سید محمد اشرف مارہروی:- ہمارے ملک کا ہر مسلمان ہر مشکل چیز سے برگشتہ ہو جاتا ہے، جب کہ وہ یہ تجربہ بھی کر کے دیکھ رہا ہے کہ بنا محنت اور لگن نہ کسی اور کو کچھ حاصل ہوا ہے نہ ہمیں حاصل ہوگا- دراصل ابھی ہماری قوم کے نوجوان طلبہ و طالبات تک یہ پیغام ٹھیک طرح سے پہنچا نہیں ہے کہ اس امتحان میں بیٹھنے والے اور کامیاب ہونے والے طلبہ ہماری

ہی طرح ہڈی اور گوشت کے بنے ہوتے ہیں، آسمان سے IAS ہو کر نہیں گرتے ہیں، دراصل ابھی تک بڑے پیمانے پر ہمارے طلبہ وطالبات کے اجتماعی شعور کو مخاطب بھی نہیں کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے عزائم کمزور ہیں، خواب چھوٹے ہیں، ارادے کچے ہیں اگر کسی کو جنت میں جانا ہے تو اس کے لیے کم از کم مرنا ضروری ہے، امتحان کوئی مشکل نہیں ہوتا سوال یہ ہے کہ آپ میں مقابلے کرنے کی طاقت کتنی ہے، ہمارے طلبہ کی کاؤنسلنگ بہت ضروری ہے ، ان کو متوجہ کرنے کا، آمادہ کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں، بڑے بڑے کالجوں میں سمپوزیم اور ورک شاپ منعقد کیے جائیں اور ان حضرات کو مدعو کیا جائے، جو ان امتحان میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں، تاکہ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں ہمارے نوجوان طلبہ کو ان امتحانات کے لیے ذہنی طور سے تیار کر سکیں اور ان کے دلوں سے یہ بات نکال سکیں کہ U.P.S.C کے مقابلے کے امتحانات میں کوئی تعصب نہیں ہوتا ہے- ضلع کی سطح پر ایسے طالب علموں کا انتخاب کیا جائے جو بارہواں درجہ امتیاز کے ساتھ پاس کرتے ہیں، اسی زمانے سے ان کی تیاری کرانا ضروری ہے- ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ سول سروس کے امتحان میں عموماً بڑے بزنس مین کا بیٹا حصہ نہیں لیتا، کیوں کہ عموماً اسے اپنے باپ کا بزنس سنبھالنا ہوتا ہے، سول سروس میں متوسط اور غریب والدین کے بچوں کے لیے باعزت زندگی گزارنے کا بہت اچھا ذریعہ ہے- ضلع کی سطح پر اچھے طلباء کو منتخب کر کے امداد باہمی کے اصول پر ان کی مالی مدد کرنا بھی ضروری ہے تاکہ کتابوں اور کوچنگ کے اخراجات سے بے فکر ہو کر طالب علم یکسوئی کے ساتھ محنت کر سکے- اگر مقابلے کے تین مراحل میں سے پہلا مرحلہ پاس کر لے تو جناب سید حامد کی کوششوں سے ہمدرد اسٹڈی سرکل ایسے طالب علموں کی خاطر خواہ مدد کرتا ہے- لیکن سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ طالب علموں میں بارہویں کلاس کی سطح پر ہی شوق پیدا کیا جائے اور ان کو یقین دلایا جائے کہ ان کے ساتھ کوئی تعصب نہیں ہوگا- انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ بڑی تعداد میں سول سروس کے امتحان میں حصہ لیں- اپنے ان عزیز طالب علموں کے لیے عرفان صدیقی کا ایک شعر یاد آتا ہے-

فیصلہ کر، کم و بیش تہہ دریا کی نہ سوچ
مسئلہ ڈوبنے کا ہے، ابھر آنے کا نہیں

سوال:-سول سروسیز کے امتحانات میں طلبۂ مدارس کی کامیابی کے کتنے امکانات ہیں؟

سید محمد اشرف مارہروی:-میرا دل خوش ہوا اس سوال کو سن کر کہ اس کا جواب پیش کرنے میں پہلے سے زیادہ خوشی محسوس ہوگی کیونکہ کم از کم آپ نے مدارس اسلامیہ کے طلبہ کی صلاحیتوں کا اعتراف اس طرح کیا کہ وہ بھی ان تمام امتحانات میں شریک ہوں کر کامیاب ہو سکتے ہیں- میں آپ کے اس نیک خیال کا صمیم قلب سے استقبال کرتا ہوں-

آپ یقین کیجیے کہ مدارس اسلامیہ کے طلبہ اپنی صلاحیتوں میں قوت حافظہ، قوت تحریر میں دنیاوی علوم حاصل کرنے والے طلبہ سے کسی طور سے کم نہیں ہوتے، بس ان کی صلاحیتوں کو مہمیز کرنا ہے، جہاں تک سول سروسیز کا سوال ہے تو اگر آپ درس نظامی کے نصاب کا مقابلہ جاتی امتحانات کے نصاب سے مقابلہ کریں تو درس نظامی کا نصاب زیادہ مشکل پائیے گا- یہ اور بات ہے کہ مضامین بالکل مختلف ہیں، میدان مختلف ہے لیکن محنت، تیاری کا طریقہ کار سبھی امتحانوں کا تقریباً ایک سا ہی ہوتا ہے، مدارس کے ان طلبہ کے لیے جو مقابلے کے امتحان میں حصہ لینا چاہتے ہیں ان کے لیے کسی مرکزی درس گاہ میں ایک ورک شاپ کیجیے جس میں ان کو سول سروسیز کے بارے میں پوری اور صحیح جانکاری دیجیے- امتحان کا ڈھانچہ بتائیے، امتحان کی تیاری کیسے کی جائے اس سلسلے میں طلبہ کو باقاعدہ رہنمائی ملنی چاہیے- سول سروسیز میں محنت، خود اعتمادی، قوت تحریر اور حافظے کی پختگی یہ چاروں باتیں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں اور بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے مدارس اسلامیہ کے طلبہ ان تمام اوصاف سے مملو ہیں، بس مضامین کا انتخاب ٹھیک سے کرنا ہوگا اور ان پر محنت کرنا ہوگی، اگر اردو اچھی ہے اور یقیناً اچھی ہونا چاہیے تو پھر ایک اردو اور دوسرا کوئی اور مضمون جو سماجیات سے متعلق ہو، مثلاً علم سیاسیات، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ کو سول سروس کے امتحان کے نقطۂ نظر سے تیار کیا جائے، میرا ماننا ہے کہ پورے حوصلہ اور بلند عزائم کے ساتھ اگر

ہمارے طلبہ کمر کس لیں تو تاریخی کارنامہ انجام دے سکتے ہیں، خدا کرے کہ کوئی بلند ہمت میری باتوں کو پڑھ کر اس سلسلے میں سنجیدگی سے مجھ سے کوئی رابطہ کرے، بات صرف حوصلے کی ہے، بقول عرفان صدیقی

آگے تقدیر پرندے کی جہاں تک پہنچے
حد پرواز مگر حوصلہ بھر ہے سائیں

طلبائے مدارس کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ سول سروس کا پورا امتحان اردو میڈیم میں لکھ سکتے ہیں-N.C.E.R.T نے ضروری مواد کا ترجمہ کر کے اردو میں چھاپ دیا ہے اور یہ کتابیں آسانی کے ساتھ دستیاب ہیں، مدارس کے طلبہ کو سب سے زیادہ مدد قوت حافظہ سے ملے گی، جسے درس نظامی شروع سے ہی سنوار دیتا ہے-

مدارس اسلامیہ کے طلبہ علم ہوں یا دیگر طالب علم ان کو چند باتیں سول سروس کے امتحان کے سلسلے میں گرہ باندھ کر رکھنا چاہیے-اول مضامین کا صحیح ترین انتخاب، دوم ان مضامین پر کتابوں اور دیگر مواد کا صحیح ترین انتخاب، سوم، ان کی مدد سے کسی بھی مضمون کے موضوعات کو گہرائی کے ساتھ سمجھ کر تیار کرنا، چہارم، سوال کا جواب لکھنے کی اعلی درجے کی مشق، سوال کے جواب میں سوال کے ظرف سے بڑا جواب نہیں ہونا چاہیے کہ اس سخاوت سے سول سروس میں نمبر کٹ جاتے ہیں، اگر صحیح اردو مناسب تیزی کے ساتھ لکھ سکتے ہیں تو اردو کو امتحان کا میڈیم ضرور بنانا چاہیے کہ مادری زبان میں تیاری اور جواب لکھنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے-

سوال:-کیا اردو سے طلبہ کا مستقبل وابستہ ہے؟ ذمہ داران کو اس سمت میں کس طرح کی پیش رفت کرنی چاہیے؟

سید محمد اشرف مارہروی:-اس سوال کا مجسم جواب آپ کو اس خادم کی شکل میں حاضر ہے اور آگے پوچھیں گے تو دوسرا جواب برادر عزیز سید محمد افضل کی شکل میں پیش کروں گا- ہماری تعلیم قصبہ مارہرہ میں ہوئی، ہائی اسکول تک اسی قصباتی تعلیم کو حاصل کیا، پھر علی گڑھ آ گئے، اردو کو مضمون بنایا، محنت کی، سارا دھیان ایک طرف مرکوز کیا، برادر محترم حضرت امین

میاں بھی اس وقت علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے، ان کا مضمون بھی اردو تھا، یہ بات تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ رب تعالیٰ کی عطا ہے اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ کہ M.A, B.A دونوں میں گولڈ میڈل حاصل کیا، جب تک میں طالب علم تھا اس کے بہت بعد تک شعبہ میں امتیازی نمبر حاصل کرنے کا اس خادم کا ریکارڈ ٹوٹ نہیں پایا، الحمدللہ! حوصلہ بڑھتا گیا، اردو اور تاریخ کو اختیاری مضمون رکھ کر اردو ذریعہ تعلیم سے سول سرویز کے امتحان میں شرکت کی اور بفضلہ تعالیٰ کامیابی ہاتھ آئی، تین مرتبہ امتحان میں حصہ لیا اور بفضلہ تعالیٰ تینوں بار انتخاب ہوا-

ایسے کم سے کم سو نام لے سکتا ہوں جنہوں نے اس مضمون کو اختیار کیا، مہارت حاصل کی، ادیب، سخنور، نقاد، شاعر، ماہر تعلیم ہوئے، مقابلہ جاتی امتحان میں کامیاب ہوئے، بڑے افسر ہوئے، نام، دولت، شہرت، مرتبہ سب کچھ پایا لیکن شرط یہی ہے کہ مہارت حاصل ہونا چاہیے- آج افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو کو Carrier بنانا تو دور لوگ پڑھنا تک پسند نہیں کرتے، شاعر غزل ہندی میں لکھ کر پڑھتا ہے، ہمارے بچے، نوجوان ساتھی اردو سے ناواقف ہیں، اتنی اردو بولنا جانتے ہیں، جتنی فلموں کے ڈائیلاگ اور فلمی گانے سکھا دیں، پہلے ہمیں اپنی زبان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم پر زور دینا ہوگا، حکومت اگر انتظام نہیں کرتی تو سیاسی نمائندوں کے ذریعے زور ڈالنا ہوگا اگر پھر بھی نہ ہو سکے تو اپنے بچوں کو گھر میں اردو کی تعلیم دینا ہوگی، اردو سے صرف ہمارا مستقبل ہی نہیں ماضی بھی تو وابستہ ہے اور ماضی کی حفاظت کیے بغیر ہم مستقبل کے اچھے خواب نہیں دیکھ سکتے-

سوال:-صنعت کار اور سرمایہ دار طبقہ کی نئی نسل تک اسلامی تعلیمات کی مناسب تبلیغ وترسیل کی کیا صورت ہے؟

سید محمد اشرف مارہروی:-صنعت کار اور سرمایہ دار طبقے کی نئی نسل تک اسلامی تعلیمات کی مناسب ترسیل وتبلیغ کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں، یہ الگ الگ بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور ایک ساتھ بھی- اولاً کوشش کرنا چاہیے کہ ہم عصری تعلیم کے اچھے ادارے خود کھولیں اور ان میں مذہب اور اقدار کی مناسب تعلیم کا انتظام کریں، جس طرح دانش ور

حضرات نعرہ زن ہوتے ہیں کہ مدارس میں سائنس کی تعلیم ضروری ہے، میرے خیال میں
عصری تعلیم گاہوں میں اسی طرح مذہبی تعلیم ضروری ہے، اس کے علاوہ ہندی اور انگریزی
کے رسائل اور اخبارات میں مضامین لکھنا بہت مفید ہوگا، اگر ایسے اخبارات موقعہ نہیں دیتے
تو ہمیں خود کوشش کر کے ہندی اور انگریزی کے اخبار جاری کرنا چاہیے، الیکٹرانک میڈیا کا
سہارا بھی لیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ یہ کام شریعت مطہرہ کی حدود میں ہو، ایک معتبر مفتی دین سے
میں سائل ہوا کہ کیا ٹی وی دیکھنا جائز ہے، انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ جن باتوں کو ٹی وی
کے بغیر دیکھنا جائز ہے انہیں ٹی وی پر بھی دیکھنا جائز ہے، دینی معلومات کی سی ڈی بنا کر بھی
اسلامی تعلیمات کی ترسیل کی جا سکتی ہے، درس قرآن و حدیث، اسلامی معلومات، اصلاحی
تقاریر، روزمرہ کے مسائل، حمد و نعت کے پروگرام بنا کر اس طبقے کی نئی نسل کو دین کی اصل
کے قریب لایا جا سکتا ہے جو اردو اور عربی کی کتابیں پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا جن کے
پاس کسی معقول وجہ سے وقت کی کمی ہے۔

سوال:-افسانوی ادب سے صوفیانہ افکار کی اشاعت کا پہلا نقش آپ کی نوک قلم
سے ابھرا ہے، اس سلسلے میں نئی نسل کے ادیبوں کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے؟

سید محمد اشرف مارہروی:-میری افسانوی تحریروں میں صوفیانہ افکار لاشعوری طور پر در
آئے ہیں، شاید پس منظر اور ماحول کی وجہ سے ایسا ہوا ہے، بہت وسیع و عریض قلعہ نما مکان،
باہر چوک اور بڑا پھاٹک، گھر کے برابر خاندانی مسجد اور خانقاہ شریف، صدر دروازے سے
نکل کر درگاہ شریف جہاں زائرین کی مستقل آمد و رفت رہتی ہے، عرسوں کے زمانے میں بڑا
مجمع اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، نعرہ رسالت یا رسول اللہ، غوث کا دامن نہیں چھوڑیں گے، خواجہ کا
دامن نہیں چھوڑیں گے، جیسے نعروں کی تکرار، جاڑوں میں مسجد کے صحن اور گرمیوں میں درگاہ
شریف کے برآمدے میں گھر کا مکتب جہاں ایک حافظ صاحب اور ایک منشی جی محو تدریس،
مکتب کے بچے بچیوں کے ساتھ پہاڑے اور گنتی رٹنے کا کورس اور فاضل بریلوی مولانا احمد
رضا خاں قادری برکاتی علیہ الرحمۃ کی نعتوں اور ان کے مشہور زمانہ سلام۔ مصطفے جان رحمت
پہ لاکھوں سلام کی مشق اور دل میں اتر جانے والی آوازیں، گھر میں دن کے وقت مرعوب و

متاثر اور رات کو گریہ نیم شبی کرنے والے باپ اور ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف محنتی او
رممتا کی ماری امی، اور بھائی بہن اور مشترک خاندان، ایک چولہا، ایک دسترخوان، ایک سے
تیوہار، ایک سے دکھ، ایک سی خوشیاں۔

گھر کے باہر تھوڑی دور پر کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ، ارہر کے میدان، تالابوں میں
قاز، سیج پر اور بڑے چھپے۔ یہ سب آپ ہی آپ کہانی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ نئی نسل کے
ادیبوں کے لیے مختصر سا پیغام ہے کہ آپ ایک بے حد توانا اور سرسبز زبان کی نمائندگی کرتے
ہیں، اس زبان کو اپنی روح میں اتارنے کے لیے اس زبان کے کلاسیکل ادب کا مطالعہ
بہت ضروری ہے، ادب چاہے شعر ہو یا کہانی، بے حد نزاکتوں کا حامل ہوتا ہے، کلاسک کا
مطالعہ کیے بغیر ہم جان بھی نہیں سکتے کہ لفظوں کی قوت کیا ہوتی ہے اور دل اور جی میں کیا
فرق ہوتا ہے۔

دل خدا جانے کس کے پاس رہا
ان دنوں جی بہت اداس رہا

ادب لکھنا ایک ذمہ داریوں بھرا کام ہے، جب دل کے اندر سے ہوک اٹھے تب لکھنا
چاہیے، اسی صورت میں وہ ادب سامنے آتا ہے جو مسرت بھی عطا کرتا ہے اور بصیرت
بھی۔ اپنی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اگر پڑوس کے ایک بچے کو بھی اردو سکھا دیں تو آپ
کے بعد بھی آپ کا کم از کم ایک قاری تو زندہ رہے گا۔

سوال:-خانقاہ مارہرہ دوسری خانقاہوں کے برعکس باہمی اختلافات میں الجھنے کے
بجائے یکسوئی کے ساتھ خدمت دین وسنیت میں مصروف ہے، آخر خانقاہ کے ارباب حل
وعقد کی وہ کون سی پالیسی ہے جس کی بدولت یہ مثبت نتائج ہمارے سامنے ہیں جن کی وجہ
سے یہ خانقاہ پوری جماعت کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے؟

سید محمد اشرف مارہروی:-آپ کا یہ سوال طویل جواب کا تقاضا کرتا ہے، جہاں تک
آپ نے دیگر خانقاہوں کے اختلافات میں الجھنے کی بات کہی تو یہ بات یقیناً بہت تشویش کی
ہے اور ہم سب کو اس موضوع پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ کیا ایسی وجوہ ہیں جس کے

تحت خانقاہوں کے ذمہ داروں کے درمیان اختلافات یا غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں-

موجودہ حالات کا اگر ہم اور آپ جائزہ لیں تو آپ کو یہ ضرور محسوس ہوگا کہ آج دوریاں کچھ کم ہوتی نظر آرہی ہیں اور جو جذبات یا افراد اس سعی میں شامل ہیں ان کو ضرور اس کی جزا ملے گی، میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر اختلاف کیوں؟ اگر فروعی مسائل پر نظریاتی اختلاف ہیں تو ان کو ذاتی لڑائی بنانے کی کیا ضرورت؟ ہمارا عقیدہ ایک، مشرب ایک، خانقاہوں میں درگاہوں میں جو صوفیا اور بزرگ آرام کر رہے ہیں ان سے عقیدت میں کوئی اختلاف نہیں تو پھر وہ کون سی وجہ ہے جس کی بنیاد پر ہم لوگ ایک دوسرے سے خفا ہیں-

ان تمام خانقاہوں کے اختلافات کا فائدہ وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو بنیادی طور پر ہمارے مسلک اور عقیدے سے اختلاف رکھتے ہیں- لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ اب معاملات میں پہلے کے مقابلے بہت زیادہ فرق ہے، لوگ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور قریب آرہے ہیں- خدا کرے جلد وہ دن آئے کہ سب ایک منبر پر خوشی خوشی ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کر رہے ہوں، ان کے تعمیری کاموں میں تعاون کر رہے ہوں-

جہاں تک خانقاہ برکاتیہ کے تعلق سے آپ نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو میں یہ عرض کروں گا کہ خانقاہ برکاتیہ کے افراد کا یہ ماننا ہے کہ بے جا اختلافات، حسد، بغض و کینہ ترقی کی راہ میں بڑی دشواریاں پیدا کرتے ہیں، ان تمام چیزوں سے مثبت سوچ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی ہے اور سوچ مثبت نہیں ہوگی تو کام تعمیری نہیں ہوں گے، خانوادۂ برکاتیہ ہمیشہ اس بات کا حامی رہا ہے کہ لوگوں کی قدر کی جائے، دلجوئی کی جائے، حوصلہ افزائی کریں، کسی کو حقیر نہ سمجھیں، میرے بڑے ابا حضور سید العلماء علیہ الرحمۃ نے تو وہ تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا جسے دنیائے سنیت کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور وہ ہے آل انڈیا سنی جمعیۃ العلماء کا قیام- یہ وہ دور تھا کہ جب اہل سنت و جماعت میں جید علمائے کرام اور مشائخ عظام موجود تھے جو علم و تقویٰ کے چلتے پھرتے دار العلوم تھے اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر قیادت کی نازک ذمہ داری اٹھانا اور سنیت اور ملت کے مسائل پر حکومت سے آنکھیں

ڈال کر بات کرنا، یہ انہیں کا حصہ تھا-

ان کے بعد میرے والد ماجد حضور احسن العلماء علیہ الرحمۃ کی وہ ذات تھی جو اہل سنت و جماعت میں حکم کی حیثیت رکھتی تھی، بڑے بڑے مسائل، بڑے بڑے گھروں اور خانوادوں کے مسائل اور معاملات ان کی جناب میں لاکر فیصل کرائے جاتے، انہوں نے خانقاہ برکاتیہ میں بیٹھ کر سلسلہ کا اجرا بھی فرمایا اور جماعت کی شیرازہ بندی بھی کی، خود بھی اختلافات سے دور رہے اور اپنے بچوں کو بھی اپنی روش پر قائم رہنے کی تاکید فرماتے رہے -میرے برادرِ محترم حضرت امین ملت مدظلہ العالی اپنی طبیعت کی ناسازی کے باوجود ملک و بیرون ملک دین کی خدمت اور سلسلہ کے فروغ کے لیے دورے فرماتے ہیں، مدارس اسلامیہ کے فروغ اور مدارس اسلامیہ کے طلبہ اور فارغ علمائے کرام کی فلاح و بہبود کے لیے مسلسل کوشاں ہیں، عصری تعلیم کے ادارے بھی قائم کر رہے ہیں- لیکن سب کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں، احباب کی خوشی اور غم کے موقعوں پر بھی برابر شرکت کرتے ہیں- الحمد للہ! خانقاہ برکاتیہ ہمیشہ سیاست اور سیاست دانوں کے فریب سے دور رہی، ہم نے ہمیشہ کرسی سے زیادہ ''آیۃ الکرسی'' کو اہمیت دی- ہم نے خود کو ان راہوں میں محدود کیا اور کوشش کی کہ ہمارے متوسلین موجودہ گندی راج نیتی سے باز رہیں، ہم اپنے احباب کے دل پر نظر رکھتے ہیں جیب پر نہیں- خانقاہ برکاتیہ کے بزرگوں نے خصوصاً حضور احسن العلماء نے بتایا کہ علمائے کرام کی عزت ضروری ہے، وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ خانقاہ کے متوسلین کو احباب سمجھنا چاہیے اور دل سے سمجھنا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ اس قدیم خانقاہ کے متوسلین اپنے پیرخانے اور مرشدوں کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں، خانقاہ نے یہ بھی سکھایا ہے کہ دوسری خانقاہوں اور مراکز علم کی بھرپور عزت کی جائے، خانقاہ نے یہ سبق بھی سکھایا کہ تنظیموں کی قدر دانی اپنی جگہ لیکن فرد کی عظمت کا اعتراف کرنے میں کوتاہی نہیں ہونا چاہیے-

اہل خانقاہ اعراس کی محافل و مجالس کی شریعت کے دائرے میں رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور ساتھ ہی احباب کو یہ نصیحت بھی ہوتی ہے کہ اگر شریعت اچھی اور مستحکم ہوگی تو طریقت و معرفت کی راہیں ہموار ہوں گی- اہل خانقاہ خود بھی اصلاحی تقاریر پر زور دیتے ہیں

اور علمائے کرام سے بھی گزارش یہ رہتی ہے کہ ہمارے احباب وعوام کو کچھ ایسا سنایا جائے، کوئی ایسی نصیحت کی جائے، جس کی عملی اہمیت ہو-

میرے برادر عزیز نجیب میاں تو اپنی تقریر میں ایسے موضوعات منتخب کرتے ہیں جو سامع کے سیدھے دل و دماغ میں اترتے چلے جاتے ہیں اور وہ سلگتے ہوئے مسائل کا فوری حل بھی بتاتے ہیں- الحمدللہ! وہ ایک بڑے طبقے میں اپنی اصلاحی تقریروں کی وجہ سے منفرد مقام رکھتے ہیں-

خانقاہ برکاتیہ کی دلی مراد ہے کہ قرون اولیٰ کے بزرگوں کے عقیدوں کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی قدس سرہ نے جن مضبوط ایمانی دلائل کی روشنی میں قلم بند کیا اور جس شان کے ساتھ عظمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم لہرایا، اس راستے سے کبھی ہمارے قدم نہ ڈگمگائیں، ساتھ ہی یہ کوشش بھی رہتی ہے کہ جو اللہ کے بندے اپنی کسی کم علمی کی وجہ سے خوش عقیدگی سے محروم ہیں، انہیں قریب لاکر ان کے سامنے ایمان اور عقیدیت کی صحیح تصویر پیش کی جائے، دعا کیجیے کہ خانقاہ برکاتیہ کے جاروب کش ہم سب بھائی حضرت امین ملت مدظلہ کی سرپرستی میں حضور صاحب البرکات کا پیغام محبت عام کرتے رہیں اور رب تبارک وتعالیٰ ہم سب سے وہ کام لے جس سے وہ اور اس کے محبوب جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوں-

سوال:- جام نور کی علمی وفکری تحریک پچھلے پانچ سالوں سے اپنے مشن میں مصروف ہے، جناب کی نظر میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

سید محمد اشرف مارہروی:- جام نور ماشاءاللہ بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے، آپ حضرات نے حقیقت میں بہت جانفشانی اور محنت کے ساتھ حضرت علامہ قدس سرہ کے اس مشن کو جاری رکھا، رب کریم آپ کو مزید سے مزید تر کی توفیق عطا فرمائے (آمین) جام نور کی اشاعت کی ضرورت حضرت علامہ نے اس وقت محسوس کی جب معیاری جرائد ورسائل کا فقدان تھا، دینی صحافت کے پیمانے اس حد تک مقرر نہیں ہو پائے تھے جو اس دور کے تقاضوں کو پورا کرتے لیکن حضرت علامہ نے قلم کے وہ جوہر

دکھائے کہ زمانہ انگشت بدنداں رہ گیا- میرے والد گرامی قدس سرہ نے رئیس القلم قدس سرہ کے زمانے کے جام نور کے بارے میں فرمایا تھا کہ ”جام نور کفر کو تڑپا تڑپا کے مارتا ہے لیکن خنجر پر خون کی چھینٹ تک نظر نہیں آتی-“ آپ اس عظیم صاحب قلم کے سچے سپوت ہیں، اپنی پوری معزز ٹیم کے ساتھ آپ نے اپنے اس تہذیبی اور تخلیقی ورثے کی جس طرح آبیاری کی وہ یقیناً قابل ستائش ہے-

جام نور دیکھنے میں جتنا دل کش ہے، اپنے مواد کے اعتبار سے بھی اتنا ہی دلچسپ ہوتا ہے- آپ نے کئی خاص نمبر شائع کیے جو ضخیم ہوں یا مختصر، اپنے موضوع پر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں- تقلید سے متعلق خاص نمبر بہت کاٹ دار ہے، جنگ آزادی نمبر مختصر تھا لیکن اس میں کئی چیزیں ایسی تھیں جو پہلی مرتبہ قارئین کے سامنے آئیں، جام نور نے قاری کی جو ذہنی تربیت کی ہے، وہ خدمت بھی کچھ کم نہیں ہے، ایک اہم بات میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ جام نور کی جدید اشاعت کے توسط سے کم از کم پانچ اہل قلم ایسے سامنے آئے جن کے قلم سے دین وسنیت کی بہت خدمت ہوگی، ان شاءاللہ تعالیٰ- رسالے کو پڑھتے وقت شروع سے آخر تک فرحت کا احساس رہتا ہے- آپ کا رسالہ جس دن آتا ہے اس دن میں بہت مصروف ہو جاتا ہوں- اب بقول اقبال.....تھوڑا سا گلہ بھی سن لے- رسالے میں ایسے کئی مضامین اور خطوط نما مضامین بھی شائع ہوئے ہیں جو نہ چھپتے تو مضائقہ نہ تھا- میں اختلافی مضامین کے خلاف نہیں ہوں بلکہ داعی ہوں- اختلاف کے بغیر ادب وصحافت میں آگے کی راہ نہیں کھلتی- لیکن اختلاف اور دل آزاری میں فرق ہوتا ہے- آپ کو خود اس کا احساس رہتا ہے اور اس احساس کا اظہار بھی آپ کرتے رہتے ہیں- اس بات سے تقویت ملتی ہے، جام نور کی اشاعت جدید میں دل آزاریوں والے حصے مشکل سے تین چار فی صد ہوں گے لیکن اتنے بھی کیوں ہوں؟ مذہبی رسائل کے میدان میں آپ نے جو شگفتہ علمی اور فکری فضا پیدا کی ہے اس کا اعتراف اپنے تو اپنے غیر بھی کرتے ہیں- میرا تھوڑا بہت علاقہ ادب سے ہے اور میں ادبی رسالوں کو بہت پابندی سے پڑھتا ہوں، ہندوستان میں فی الوقت اردو کا کوئی ادبی رسالہ ایسا نہیں ہے جو جام نور سے زیادہ پڑھا جاتا ہو- اس طرح دیکھیں تو جام نور ایک

مظلوم زبان کی خدمت کا حق بھی ادا کر رہا ہے- آپ اور آپ کے رفقاء کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں-

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

سید محمد اشرف مارہروی:- جام نور کے قارئین کی خدمت میں ہدیۂ سلام کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جام نور کا دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے تعاون کرنے کی مہربانی کیجیے- سالانہ زرِاشتراک اگر وقت سے پہنچ جائے تو آپ کا قرض بھی اتر جاتا ہے اور ادارہ بھی سہولت اور کفایت محسوس کرتا ہے- ماہنامہ جام نور کے لیے مزید کیا پیغام دے سکتا ہوں- یہ تمام طول بیانی جام نور ہی کے لیے تو تھی- آخر میں بس عرفان صدیقی کا شعر پڑھوں گا اس امید کے ساتھ کہ جام نور اسے اپنا موقف بنا لے-

سخت ہے مرحلۂ رزق بھی ہم جانتے ہیں
پر اسے معرکۂ عشق سے کم جانتے ہیں

❑❑❑

(شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

ڈاکٹر خواجہ اکرام

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر خواجہ اکرام اردو کے ایک اچھے استاذ، کالم نگار، کئی کتابوں کے مصنف اور مذہبی رجحان اور عصری شعور رکھنے والے ایک معتدل فکر مسلمان ہیں- عصر حاضر کی مسلم دانشوری کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ دانشوران پر جب زعم دانشوری سوار ہوتا ہے تو ان سے احساس مسلمانی رخصت ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف ڈاکٹر خواجہ اکرام ہندوستان کی ایک بڑی عصری درس گاہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے استاذ ہونے اور ایک آزاد ماحول میں رہنے کے باوجود اسلام کا درد، ملت کی فکر اور قوم کے تابناک مستقبل سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور ہر وقت اسلامی کردار اور مسلمانوں کے تعلیمی، معاشی اور سیاسی شعور کو پروان چڑھانے کے لیے اپنے طور پر کوشاں رہتے ہیں- موصوف صوبۂ جھارکھنڈ سے تعلق رکھتے ہیں، مدرسہ شمس العلوم گھوسی (یوپی) سے بنیادی دینی تعلیم کی تحصیل کے بعد عصری علوم کی طرف مائل ہوئے اور پٹنہ یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد جے این یو دہلی آئے اور یہاں سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تکمیل کی- ایم فل کے لیے آپ کے تحقیقی موضوع کا عنوان ''رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تنقیدی مطالعہ'' اور پی ایچ ڈی کا عنوان ''انیسویں صدی کے تذکروں کا تنقیدی جائزہ'' ہے- اب تک تقریباً نصف درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ''اردو کے شعری اصناف'' اور ''جدید فارسی ترجمہ وقواعد'' خصوصی اہمیت کی حامل ہیں- ڈاکٹر صاحب ابھی جے این یو دہلی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، نیوایج میڈیا اینڈ ریسرچ سینٹر دہلی کے ٹرسٹی اور مختلف دینی وعلمی سرگرمیوں اور تنظیموں سے وابستہ ہیں-

سوال :-سب سے پہلے اختصار کے ساتھ یہ بتائیں کہ آپ ایک چھوٹے سے دینی ادارہ سے ملک کی ایک عظیم یونیورسٹی کے منصب تدریس تک کیسے پہنچے؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام:-سب سے پہلے تو ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اس منصب اور اس مقام پر فائز کیا ہے، یہ ایک چھوٹا سا منصب ہے، لیکن منصب سے زیادہ اسے میں اپنی دینی، علمی، اخلاقی اور ملی ذمہ داری سمجھتا ہوں، اور اگر میں اسے نبھانے میں کامیاب ہو گیا تبھی ان سوالات کا کوئی جواب ہوگا نہیں تو کچھ نہیں، مدرسے سے میری تعلیم شروع ہوئی، میرے والد مولانا شمس الدین سہروردی علیہ الرحمۃ والرضوان ایک بڑے صوفی عالم تھے، ان کی ساری زندگی اصلاح معاشرہ اور خدمت قوم میں گزری، ایک بڑے شہر سے اپنے پیر کے حکم کے مطابق ایک چھوٹے گاؤں کا سفر کیا، جس علاقے میں وہ گئے وہ آدی باسیوں کا علاقہ تھا، یعنی جھارکھنڈ کا علاقہ، جہاں کے مسلمانوں کے نام ہری میاں، چمن میاں، لکشمن میاں وغیرہ ہوا کرتے تھے، وہ صرف ایک چادر اوڑھا کرتے تھے، انہیں دین کے تعلق سے کچھ پتہ نہیں تھا، گویا انہیں ایک جنگل میں بھیج دیا گیا اور ان سے یہ کہا گیا کہ تمہیں دین کی روشنی پھیلانی ہے، کوئی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا، ۴۰/۴۵ سال ہو رہے ہوں گے، اور اتنی سی مدت میں اللہ کا شکر ہے کہ پورا منظر تبدیل ہو گیا ہے، ایک اس وقت کا گاؤں تھا اور ایک آج کا گاؤں ہے، میرے گاؤں کے پڑھنے والوں کا پہلا گروپ وہی ہے جس میں ہم لوگ نکلے ہیں، میرے گاؤں میں دو سو گھر ہیں اور آج کوئی ایسا گھر نہیں جس میں کوئی عالم دین یا کوئی حافظ قرآن نہ ہو، میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ میں عالم دین بنوں، اس لیے ان کی بڑی سخت ہدایات تھیں، اور ۱۱ ؍سال کی عمر میں مجھے انہوں نے جھارکھنڈ سے اعظم گڑھ قصبہ گھوسی میں مدرسہ شمس العلوم میں داخل کر دیا- میں نے وہاں فارسی کی دوسری پڑھنا شروع کیا، گلستاں بوستاں پڑھی، منشی کا امتحان دیا، منشی کامل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک میرے سینئر دوست مولانا شوکت نے مجھے بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی طرف متوجہ کیا، اور میں شمس الہدیٰ پٹنہ چلا گیا، شمس الہدیٰ پہنچا تھا کہ وہاں

مجھے زندگی کے دو راستے نظر آئے، شمس الہدیٰ بیچ شاہراہ پر ہے جسے اشوک راج پتھ کہتے ہیں، شمس العلوم کا جو گیٹ ہے یہ سائنس کالج کے گیٹ کے سامنے ہے، بالکل رو برو، میں حسرت اور حیرت سے دیکھتا تھا کہ ایک ہم ہیں ڈرے، سہمے اور دبے ہوئے، گھنٹی کی آواز پر لپک کر دوڑتے ہیں، زور سے قہقہہ نہیں لگا سکتے، ہنس نہیں سکتے، آزادانہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے، دوسری طرف سڑک کے اس پار ایک گیٹ کھلتا ہے جہاں عجیب رونق ہے، آزادی ہے، وہاں کے طلبہ کو ہم دیکھتے ہیں تو ان میں بے باکی اور جرأت نظر آتی ہے، میں بار بار سوچتا تھا، اسے آپ تمنا کہیے یا طفلانہ حسرت کہیے، میں سوچتا تھا کہ کیا میں اس بیچ کی سڑک کو پار کر سکتا ہوں؟ لیکن مجھے اس کی باضابطہ تحریک ایک واقعہ سے ہوئی، میرا ایک روم میٹ ساتھی تھا، جو روزانہ شام میں نہاتا تھا اور خوشبو لگا کر، اچھے کپڑے پہن کر وہ کہیں نکلتا تھا، مجھے دو باتوں سے حیرت ہوئی، اول یہ کہ مدرسہ میں جو نہانے کا تصور ہے وہ جمعہ کو ہے یا صبح کو ہے، لیکن وہ لڑکا صبح بھی نہاتا تھا اور شام میں بھی نہاتا تھا، یہ چیز ہمارے لیے عجیب تھی، دوسری یہ کہ وہ کتابیں لے کر شام کو کہیں نکلتا تھا، وہ مجھ سے سینیر تھا، میں اس کے تعاقب میں رہا اور ہمیشہ اس سے پوچھتا رہا، ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ تم جاتے کہاں ہو؟ اس نے کہا کہ پٹنہ میں ایک نائٹ اسکول ہے اس میں میں نے داخلہ لے رکھا ہے، میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا کہ کیا میں بھی اس میں داخل ہو سکتا ہوں؟ پہلے تو اس نے ذہنی طور پر مجھے آزمایا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ شکایت کر دے، کیوں کہ شکایت کرنے کا مطلب تھا ہوسٹل سے اخراج، جب اسے میں نے اعتماد میں لے لیا تب اس نے مجھے راستہ بتایا اور میں نے نویں کلاس میں داخلہ لے لیا، اس وقت میری یہ حالت تھی کہ ہندی کی تھوڑی بہت شد بد تھی، اس وقت تعلیم کے لیے پیسے بھی نہیں تھے، والد صاحب ضعیف ہو گئے تھے، اسکول سے ریٹائرڈ ہو گئے تھے، بیمار رہتے تھے، ذریعہ معاش کچھ تھا نہیں، بہر کیف! حاصل کلام یہ کہ میں نے دسویں کا امتحان پاس کر لیا، اور اب تک گھر پر کسی کو اطلاع نہیں دی، چوں کہ میں نے اپنی تعلیم کا رخ موڑ لیا تھا، اس لیے گھر والوں سے بتاتے ہوئے کافی ڈر لگ رہا تھا، والد صاحب سے ڈرتے ڈرتے میں نے کہا کہ میں میٹرک کے امتحان میں پاس ہو گیا

ہوں، اچھے نمبر حاصل ہوئے ہیں، آپ اجازت دیں تو پٹنہ کالج میں میرا داخلہ ہوسکتا ہے، خلاف توقع وہ خوش ہوئے، اور اپنی رضامندی کا اظہار کیا، لیکن اتفاق سے اسی سال والد صاحب کا انتقال ہوگیا-

والد صاحب نے چوں کہ اجازت دے دی تھی، اس لیے میں نے سوچا کہ یہ ایک طرح سے میرے اوپر ذمہ داری ہے، میں نے بڑی محنت کی اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں پورے بہار میں گیارہویں پوزیشن حاصل کر لی- اس سے مجھے بہت دلی خوشی ہوئی اور حوصلہ بڑھا- ہمارے اساتذہ نے بھی حوصلہ افزائی کی، پھر میں نے امتیازی نمبرات کے ساتھ وہیں سے بی اے بھی مکمل کیا، پھر جے این یو آگیا یہاں بھی اللہ کا فضل رہا، ایم اے میں بھی ٹاپ کیا، ایم فل میں بھی ٹاپ کیا، تو میری خواہش بڑھتی چلی گئی اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہا-

جب میں شمس الہدیٰ میں پڑھ رہا تھا تو وہ اہل سنت کا ادارہ تھا، لیکن ہر مکتب فکر کے لوگوں کا آنا جانا ہوتا تھا، وہاں ایک بار بحث ہو رہی تھی، فاتحہ، مزار، چادر وغیرہ کے تعلق سے کہ اسلام میں ان کی کیا حیثیت ہے، اس کے بعد میں نے ۱۶ر صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ لکھا اور اس میں میں نے فتاویٰ رضویہ، فتاویٰ امجدیہ اور فتاویٰ رشیدیہ کے فتاوے نقل کیے اور میں نے علمی طور پر یہ اجاگر کرنے کی کوشش کی کہ ان امور کی اسلام میں کیا حیثیت ہے، یہ کتابچہ ''اہل بریلی حقانیت کے آئینے میں'' کے نام سے ایک ہزار کی تعداد میں چھپا اور بک گیا، اس وقت گریہڈیہہ میں ایک صاحب کوئی صوفی ازم کی تحریک لے کر اٹھے تھے، مختلف مذاہب کو ملانے کی بات کر رہے تھے، ایک الگ نظریے کی تاسیس کر رہے تھے، انہوں نے میرے ۱۶ر صفحات کے کتابچہ کا جواب ۲۵۰ر صفحات پر لکھا، اس کے بعد میں نے جو پہلا مضمون لکھا وہ پٹنہ کالج کی میگزین میں چھپا، یہ بھی بہت مقبول ہوا، آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے بار ہا نشر ہوا- اس کے بعد جے این یو آیا تو ایم فل میں میں نے ''رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے کتاب لکھی، جو ملک کی یونیورسٹیز اور پاکستان کے پشاور یونیورسٹی میں شامل نصاب ہے- اس کے بعد میں نے فارسی میں پی ایچ ڈی کی، دہلی

یونیورسٹی میں اسی وقت ایک جگہ آئی جس میں فارسی، اردو جاننے والے کی ضرورت تھی، حسن اتفاق کہ میں نے درخواست دی اور میرا تقرر ہوگیا، اسی درمیان تھی پروفیسر وہاب اشرفی صاحب نے کہا کہ آپ بہار آجائیں، اور رانچی میں انہوں نے بحثیت لیکچرار میرا تقرر کرلیا، لیکن وہاں کی آب وہوا اور علمی فضا مجھے پسند نہیں آئی اور پھر واپس دہلی آگیا، ۵ر سال تک دہلی یونیورسٹی میں میں نے عارضی ۵ر سالہ مدت گزاری اور اس کے بعد جے یو این میں بحثیت اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوگیا اور اب میں آپ کے سامنے ہوں-

سوال:- آپ ایک مسلمان ہیں، اس کے علاوہ تعلیم کے ابتدائی مرحلے میں آپ کا تعلق مذہبی اداروں سے بھی رہا ہے، اس لیے آپ پر دیگر کاموں کے ساتھ خدمت اسلام اور دعوت دین کا فریضہ بھی عائد ہے، اس کے لیے آپ نے کس طرح کی ترجیحات متعین کی ہیں؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام:- دعوت وتبلیغ کے حوالے سے میری پہلی ترجیح تو یہ ہوتی ہے کہ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری زبان میں وہ اثر پیدا فرمائے جس سے دین کی باتیں موثر ہوں، ہمارے کردار سے، گفتار سے، ہمارے عمل سے کچھ طلبہ اچھی باتیں سیکھ سکیں اور انہیں اپنا سکیں، میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ شب وروز کی جو ہماری مصروفیات ہیں ان میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھے جس سے غلط تاثر جائے، دوسرا مقصد میرا خاص طور پر جے این یو میں یہ ہوتا ہے کہ یہاں بڑا آزاد ماحول ہے، یہاں مسلمان بچے اور بچیاں آتے ہیں، اس لیے میں اپنی کلاس میں ہر دن کہیں نہ کہیں اسلامی بات لے کر آتا ہوں اور میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہر روز ان کو حدیث کا ایک مفہوم ضرور بتاؤں، جس طرح کی احادیث میں نے جمع کیں اور ان کو سینے میں محفوظ کیا، ان کا تعلق کردار سازی سے ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عصری تعلیم کے جتنے بھی ادارے ہیں ان کی بنیاد اقتصاد پر ہے، ان کی بنیاد معاشرے کی اصلاح پر نہیں ہے، اور کردار سازی کی کمی وجہ سے بے راہ روی ہوتی ہے، میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ قرآن وحدیث کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بتاؤں جو ان کی کردار سازی میں معاون ثابت ہوسکیں، گویا میری ایک طرح سے کوشش یہ ہوتی ہے کہ میرا طالب علم کسی بھی

شعبے میں چلا جائے، کسی نہ کسی طور پر اسلامی کردار کے فروغ میں وہ اپنا کردار پیش کر سکے، وہ
باضابطہ طور پر دینی تعلیم کو پیش نہیں کر سکتے، کیوں کہ دینی علوم سے وہ بے بہرہ ہوتے ہیں،
لیکن اسلامی کردار کو تو پیش کر سکتے ہیں-

سوال:- جواہر لال نہرو یونیورسٹی ملک کی عظیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک
ہے، اس ادارہ میں مسلم طلبہ کے لیے اور خاص طور سے مدارس کے طلبہ کے لیے کس طرح
کے مواقع حاصل ہیں؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام:- یہ اللہ کا شکر ہے کہ جے این یو جیسے ادارے میں مسلم طلبہ کی تعداد
بہت اچھی ہے، مسلم اساتذہ کی تعداد بھی ماشاء اللہ اچھی ہے، اور یہاں پر جہاں تک مواقع
کی بات ہے تو مواقع یہاں بے انتہا ہیں، یہ بالکل ایک سمندر کی طرح ہے، جس ساحل پر
بیٹھ جائیں کہیں نہ کہیں راستہ مل ہی جائے گا- مدارس کے طلبہ بھی یہاں اچھی تعداد میں ہیں
اور بہت اچھا کر رہے ہیں، لیکن یہاں پر بھی وہی طالب علم اچھا کر رہے ہیں جو مدارس سے
ہی کچھ نہ کچھ صلاحیت لے کر آئے ہیں، مدارس کا ایک بڑا المیہ ہے کہ تین چار سالوں میں
آج کل دستار فضیلت مل جا رہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وہ نحو میر، میزان اور پنج گنج سے آگے نہیں
بڑھ پاتے ہیں، احادیث کا ترجمہ نہیں کر سکتے، قرآنی آیات کا مفہوم نہیں بتا سکتے، تو اگر ان
کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے تو پھر ایسے طلبہ کے لیے یہاں بھی مواقع نہیں ہیں، لیکن ایسے
طالب جن کی عربی اچھی ہے اور یہاں آنے کے بعد انہوں نے اپنی انگریزی اچھی کر لی تو
ایسے طالب علم کبھی بے کار نہیں رہ سکتے، ان کے لیے بھی بڑے اچھے مواقع ہیں، اچھے پیسے
ہیں، ترجمے کا کام، ایمبیسی میں دفتر کا کام، اور دوسرے اداروں میں عربی جانے والوں کی
بہت ضرورت ہے، اور ایسے طالب علم جن کو انگریزی اور عربی پر یک ساں دسترس ہو ان کی
بے انتہا کمی بھی ہے، اور ایسے طلبہ کے لیے معاش کا مسئلہ نہیں ہوتا ہے، یہ خود بھی خود کفیل
ہوتے ہیں اور پورے گھر والوں کو سنبھال لیتے ہیں، اس کے علاوہ ہمارے یہاں اردو ماس
میڈیا کا کورس ہے، اس میں ہم ہر سال دو تین مدارس کے طلبہ کو بھی لے لیتے ہیں، آج اردو
کے عربی کے چینل شروع ہو رہے ہیں، مختلف ویب سائٹس ہیں جن پر کام کرنے والوں کی

ضرورت ہے، اس طرح کے کاموں میں اردو اور عربی جاننے والے طلبہ کے لیے بڑے
مواقع ہیں، علاوہ ازیں جے این یو سے بیرون ملک جانے کے لیے بھی بہت سے مواقع
ہیں، اگر یہ طلبہ بی ایڈ کر لیں تو ان کے لیے باہر کے اسکولوں میں بہت سے امکانات روشن
ہیں، مدارس کے طلبہ میں ایک خوبی ایسی ہے جو دوسرے طلبہ میں نہیں ہوتی ہے، وہ تکلم کی
طاقت ہے، یہ دراصل شخصیت کو موثر بنانے بہت معاون چیز ہے، اس کی وجہ سے سمیناروں
میں، سمپوزیم میں، مباحثوں میں ان کا اچھا مظاہرہ ہوتا ہے، اس کی وجہ سے وہ اساتذہ کی
نظروں میں آجاتے ہیں اور آسانی سے کہیں نہ کہیں ان کا تقرر ہو جاتا ہے-

سوال:- کہتے ہیں کہ جے این یو کا مزاج سیکولر اور کمیونسٹ ہے، ایسے میں ایک
مسلمان طالب علم اسلامی مزاج کے ساتھ یہاں کیسے گزارا کر سکتا ہے؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام:-سب سے اچھا موقع یہیں ہے، آپ ذرا غور فرمائیں کہ ہندوستان
میں جتنے تعلیمی عصری ادارے ہیں ان میں افطار، سحر اور تراویح کا جو اہتمام جے این یو میں
ہوتا ہے یقین مانیے پورے ہندوستان میں کہیں بھی نہیں ہوتا ہے، ایک ایک ہاسٹل میں سو سو
طلبہ افطار کے وقت ایک ساتھ بیٹھتے ہیں، جتنے بھی مسلمان ہوتے ہیں خواہ وہ جس ہیئت میں
ہوں وہاں پہنچتے ہیں، بلکہ یہاں پر تو ٹوپی کرتا، اور داڑھی کو اس حیثیت سے اچھی نظر سے
دیکھا جاتا ہے کہ اس وضع کے لوگ جھوٹ نہیں بولیں گے، مکاری نہیں کریں گے، فریب
نہیں دیں گے، آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ جے این یو میں ایسی ایسی لڑکیاں بھی آپ دیکھ سکتے
ہیں جو نیم عریاں ہوتی ہیں اور ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی صرف آنکھیں کھلی ہوں گی، سارا جسم
نقاب میں چھپا ہوگا، لیکن کیا مجال کہ کوئی شخص بول دے کہ وہ نقاب میں کیوں ہیں، یہ دقیا
نوسی ہے کسی طالب علم کے بارے میں آپ کبھی نہیں سن سکتے کہ وہ ٹوپی پہنتا ہو اور داڑھی
رکھتا ہو اور اس سے کسی نے یہ کہہ دیا ہو کہ وہ دقیانوس ہے، تو اس سیکولر ماحول میں زیادہ مواقع
ہیں، آزادی ہے، آپ جس لباس میں رہیں جس طرح کا کھانا کھائیں، جس طرح کا کام
کریں، کوئی رکاوٹ نہیں، اتنا آزاد ماحول تو آپ کو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں مل ہی
نہیں سکتا، یہاں طلبہ زیادہ محفوظ ہیں اور ان کے لیے زیادہ مواقع ہیں کام کرنے کے-

سوال :-لیکن آپ ان طلبہ کے بارے میں کیا کہیں گے جو مدارس سے ۸/سالہ نصاب مکمل کر کے یہاں آئے ہیں اور یہاں آنے کے بعد اپنی ہیئت ہی کو بدل لی ہے؟ اس کے لیے وہ یہ توضیح بھی کرتے ہیں کہ داڑھی ہمارے لیے ایک طرح کی رکاوٹ ہے، اس لیے ہمیں ترقی کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو گیا ہے-

ڈاکٹر خواجہ اکرام:- جی ہاں! یہ قابل غور پہلو تو ضرور ہے کہ وہ ۸/سال مدارس سے پڑھ کر یونیورسٹی آئے اور آتے ہی اپنی ہیئت کو تبدیل کر لیا اور صرف ہیئت ہی نہیں اپنا مزاج بھی بدل لیا، تو سب سے پہلے سوال تو ان کی تربیت پر ہوتا ہے کہ ۸/سالوں تک جب وہ مدارس میں رہے تو کیا وہاں ان کی اسلامی تربیت نہیں ہوئی یا ہوئی تو اتنی ناقص ہوئی کہ ہوا کے ایک معمولی جھونکے کے ساتھ ریت کی دیوار کی طرح یکایک ڈھہ پڑی، تو یہاں اس کی ذمہ داری جہاں ایک طرف طالب علم پر آتی ہے وہیں ان کی تربیت کرنے والے مدارس پر بھی آتی ہے، کہ بہر حال ان میں کسی نہ کسی طرح کا نقص ہے جس کی وجہ سے ان کا اثر دیرپا نہیں رہ پا رہا ہے-

میں اپنے دوستوں کے بارے میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ کئی ایک ایسے بھی ہیں جن کا تعلق مدارس سے ہے اور وہ شراب و کباب کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں اور بلا تکلف ان کا استعمال کرتے ہیں، میں یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتا ہوں، حیرت کے علاوہ میں اس پر سوچتا بھی ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ مجھے اب تک اس کی دو وجہیں نظر آئی ہیں، ایک وجہ یہ کہ مدارس میں طلبہ کے لیے اتنی پابندی ہوتی ہے کہ وہاں پر وہ پَر بھی نہیں مار سکتے، اب وہ اچانک قید سے آزادی کے ماحول میں آتے ہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ آزادی کے ماحول میں آتے ہیں اس سے اچانک سب کچھ بدل جاتا ہے، تو زیادہ قید اور زیادہ قید سے انتہائی آزادی کی طرف ان کا سفر، یہ ایک بنیادی وجہ ہے اس کی-

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے جہاں تعلیم حاصل کی وہاں ان کی بھرپور تربیت نہیں ہوئی، تعلیم تو دراصل تربیت ہی کا نام ہی ہے، سعدی نے کہا ؎

علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر دل زنی یارے بود

مطلب یہ کہ مدارس میں علم کو دل و دماغ پر موثر کرنے والا ذریعہ نہیں بنایا گیا، صرف ہجے کرا کر رٹوا دیا گیا، اس سے طالب علم کی شخصیت پر اثر نہیں پڑا، اس لیے اس پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت ہے- مدارس میں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ کردار سازی پر کام کریں-

سوال:- جے این یو نے اردو کو کیا مقام دیا ہے، یعنی اس کے شعبۂ اردو کا کیا حال ہے اور اس میں کس قسم کے کورسیز ہیں؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام:- جے این یو کا شعبہ اردو بہت بہتر ہے، دنیا کی کوئی ایسی یونیورسٹی نہیں ہے جہاں اردو کی تعلیم ہوتی ہو اور وہاں جے این یو کے شعبہ اردو کا اثر نہ ہو، یا اس کے چرچے نہ ہوں، یورپ میں آپ جائیں امریکہ، کناڈا، لندن، جرمنی، روس اور دوسرے ممالک جو ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں ان تمام ممالک میں جے این یو کے شعبۂ اردو کا بڑا نام ہے- ہمارے وہ اساتذہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں وہ وہاں کی یونیورسٹیوں میں بار ہا وزٹینگ پروفیسر بھی رہے ہیں، اور آج بھی ایکس چینج پروگرام کے تحت وہاں سے طلبہ اور طالبات یہاں پر آتے ہیں، ہندوستانی سطح پر بات کیجیے تو جے این یو کا شعبہ اردو اپنا امتیازی مقام رکھتا ہے، اس کی امتیازی شناخت ہے، اس طور پر کہ ہمارے یہاں کورسیز کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ کوئی حصہ تشنہ نہیں رہتا ہے، ہم نے اپنے طلبہ کے لیے ہندی کو لازم کر دیا ہے تاکہ اگر طالب علم ہندی بھی پڑھ لیں جو ملک کی قومی زبان ہے- اردو کے نصاب میں ثقافت، تہذیب اور تاریخ کے پس منظر میں ادب کو پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے یہاں ۴/سمسٹر میں ۱۷/کورسیز ہیں، ان کے اندر ہم تقریباً تمام چیزوں کو شامل کر لیتے ہیں، ہمارا طریقہ بالکل الگ ہے، ہم خود امتحانات لیتے ہیں اور کاپیاں چیک کر کے طلبہ کو نمبرات دیتے ہیں، ہمارے طلبہ اس کے مجاز ہیں کہ وہ ہم سے پوچھیں کہ آپ نے آخر ہمیں کیوں کم نمبر دیا؟ تو ایسا نظام ہے کہ ہمیں مجبور ہونا پڑے گا کہ ہم دکھائیں اور ان کو بتائیں کہ دیکھیے آپ نے یہ غلطیاں کی ہیں، ہم طلبہ کو اسائنمنٹ لکھنے کو دیتے ہیں تو ایک اسائنمنٹ لکھنے کے لیے کم سے کم بیس کتابیں انہیں دیکھنا پڑتی ہیں، ہمیں اگر چہ اس کا یقین ہے کہ وہ ۲۰/کتابیں

نہیں دیکھ سکتے مگر انہیں ایک طرح سے رہنمائی تو ہو جاتی ہے کہ وہ ایم اے کے بعد تفصیل
سے دیکھنا اور پڑھنا چاہیں تو پڑھ سکیں، گویا ہمارا نصاب ڈیزائن ہی اس طور سے کیا کیا گیا
ہے کہ وہ صرف موضوع کو Cover نہیں کرتا بلکہ اس کے پورے کینوس میں جا کر اس کے
پس منظر کو واضح کر دیتا ہے۔

جے این یو کے شعبۂ اردو کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے ۲۰/۲۵ سال پہلے جب اردو صحافت
کے کورس کا تصور نہیں تھا، اس وقت جے این یو کے شعبہ اردو نے ڈپلوما ان اردو ماس میڈیا کو
رس شروع کیا تھا، جو آج بھی چل رہا ہے، اور آج ہندوستان کا کوئی سا بھی اردو چینل
B.B.C سے لے کر Voice of America تک اور دور درشن سے لے کر Zee
TV اور دوسرے چینلوں تک کوئی سا بھی ایسا نہیں ہے جس میں ہمارے جے این یو کے طلبہ
ماس میڈیا کر کے نہ پہنچے ہوں، فرقان علی صاحب جو دوردرشن میں ہیں پہلے B.B.C میں
تھے، یہیں کے پروردہ ہیں، دوردرشن کے شکیل صاحب بھی یہیں کے پروڈکٹ ہیں، اب
ہم نے دو سال کا ایم اے ان ماس میڈیا کا کورس شروع کیا ہے جو پچھلے پانچ چھ سالوں سے
چل رہا ہے، تو یہ سب وجہیں ہیں جن سے شعبۂ اردو کا ایک نام ہے اور ایک مقام ہے۔

سوال:۔آپ نے ابھی کہا کہ جے این یو کے شعبۂ اردو کا نصاب کچھ ایسا ڈیزائن
ہوا ہے کہ اس نے اردو کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے، حالانکہ اردو کا نصاب دوسری
یونیورسٹیوں میں بھی ہے پھر بھی آپ نے جے این یو کے شعبہ اردو کو نصاب میں جدید کاری
کی وجہ سے ممتاز قرار دیا، اب یہاں میں مدارس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں
گا، وہ اس طور پر کہ کئی سو سالوں سے وہاں ملا نظام الدین کا تیار کردہ درس نظامی رائج ہے اور
اہل مدارس اس میں تبدیلی کے لیے آج تک تیار نہیں ہیں؟ آپ کی اس تعلق سے کیا رائے
ہے؟ نیز نصاب کی جدید کاری کی اہمیت کیا ہے؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام:۔نصاب کی اہمیت کسی بھی ادارے کے لیے ایسی ہی ہے جیسے جسم
میں ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت ہے، کسی ادارے کا نام اس کی بلڈنگ سے نہیں ہوتا، ادارے کا
نام اس کے نصاب سے ہوتا ہے، جیسا نصاب ہو، ویسی تعلیم ہوگی اور ویسے ہی طالب علم

ہوں گے، آپ نے جو یہ بات کہی کہ مدارس کے لوگ ادھر توجہ نہیں دے رہے ہیں، بالکل صحیح
ہے، یہ دراصل بہت سنجیدہ مسئلہ ہے، سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، دیکھیے
زمانہ تغیر پذیر ہے، منطق وفلسفہ مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، منطق کی تعلیم میں شروع
میں ہی یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ہر چیز تغیر پذیر ہے اور جب ہر چیز تغیر پذیر ہے تو یہ اصول
نصاب کے تعلق سے کیوں قابل قبول نہیں مانا جاتا؟ مدارس میں بھی تو تبدیلی لانی چاہیے،
سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تبدیلی کو ہم دوسرے نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں، اگر یہ مان بھی لیا
جائے کہ نصاب میں تبدیلی محال ہے جب بھی نصاب میں ترمیم واصلاح ایک ناگزیر ضرورت
ہے، اگر ترمیم نہیں کی گئی تو ہم زمانہ سے بہت دور ہو جائیں گے، بہت پیچھے رہ جائیں گے،
دیکھیے مدارس کو اگر ملکی اور بین الملکی سطح پر دیکھیں تو ان کی اہمیت، افادیت، ان کا مقام اور
ان کے مرتبے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، ان کا اتنا بڑا مقام ہے جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے،
ہمیں ان مدارس پر فخر کرنا چاہیے، ہندوستانی سطح پر بھی مدارس کا اتنا بڑا مقام ہے اور ملک کی
تعمیر میں اس کا اتنا اہم کردار ہے کہ آپ سوچیے کہ جو کام حکومت نہیں کر سکی اسے مدارس کر
رہے ہیں، آج حکومت Literacy Movement کے لیے ہزاروں کروڑوں روپے
خرچ کر رہی ہے، لیکن مسلم قوم میں جس نے Literacy Movement پیدا کیا ہے یہ
صرف اور صرف مدارس ہیں، پوری مسلم آبادی کو دیکھیے تو اس میں ۷۰ رفی صد تعلیم یافتہ افراد
مدارس کے ملیں گے جن کی تعلیم پر حکومت کا ایک پیسہ خرچ نہیں ہوا، اگر آپ صرف اس نقطے
سے بھی دیکھیں جب بھی ہندوستانی مدارس کا مرتبہ بے پناہ بلند نظر آئے گا۔ اب اگر مدارس
کو ہم تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ نئے تعلیمی نظام کے تقاضوں سے جوڑنے کی کوشش کر لیں
تب تو یہ مدارس ایسے ہو جائیں گے کہ لوگ اسکولوں کا رخ ہی نہیں کریں گے، مدارس کی
طرف دوڑ کر آئیں گے، مدرسے میں تو بنیادی طور پر قرآن اور حدیث کی تعلیم دینی ہے، یہی
وہ تعلیم ہے جو دنیا کو صحیح راستہ دکھا سکتی ہے، ظلمت سے نور کی طرف لا سکتی ہے، اس سے کسی کو
انکار نہیں ہے، لیکن اس تعلیم کے بعد وہ طلبہ اگر آج کی دنیا کے دوسرے علوم سے باخبر ہوں
گے جب ہی تو وہ مدافعت کر سکیں گے، آج مدارس کے طلبہ اور کالجز اور یونیورسٹیز کے طلبہ

کے بیچ ایک وسیع خلیج ہے اور یہ اس لیے ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے غیر مانوس ہیں، جن کے مانوس ہونے کے لیے اگر تھوڑی بہت ترمیم ہو جائے گی تو خلیج پٹ جائے گی اور جب خلیج مٹ جائے گی تو میں بتاؤں کہ مدارس کے طلبہ جتنا بہتر کر سکتے ہیں اتنا بہتر کوئی نہیں کر سکتا، تو ترمیم تو ضروری ہے اور اس کے لیے اہل علم ونظر کو بہت سنجیدہ غور کرنا ہوگا کہ آج کون کون سے علوم شامل نصاب کیے جانے کے لائق ہیں اور اب کن کو پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے-

ایک بات یہاں میں بطور خاص کہنا چاہوں گا وہ یہ کہ بلاشبہ مدارس کو ایک اچھا فاضل، ایک اچھا مفتی، ایک اچھا خطیب اور ایک اچھا قلم کار پیدا کرنا چاہیے، لیکن وہ مفتی، وہ خطیب وہ قلم کار اسی وقت تو اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے جب وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو جانے، معاشرے کو سمجھے، لیکن آپ اگر معاشرہ کو جانے بغیر صرف کتابی کیڑے بنے رہیں گے تب تو آپ زمین و آسمان کے بیچ پڑے رہیں گے، معاشرے سے تعلق پیدا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہمیں کرنا ہوگا، اس تعلق سے جو نکات ہماری فکر میں ہیں میں آئندہ ان کو تحریری طور پر لکھ کر قارئین کے حضور پیش کرنے کی کوشش کروں گا-

سوال :-موجودہ گلوبلائزیشن کے دور میں اسلام کے لیے کس قسم کے مسائل اور خطرات درپیش ہیں اور آپ کی نظر میں ان سے نبرد آزمائی کے لیے اسلام پسندوں کو کیا کرنا چاہیے؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام :-اسلام کے لیے آج وہی خطرہ ہے جو مکی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھا، مکی زندگی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو خطرہ تھا وہ یہ تھا کہ اس دور میں آپ کے خلاف اور آپ کے صحابہ کے خلاف نفرت کا زہر اگلا جا رہا تھا، اور ایسی سازشیں رچی جا رہی تھیں کہ لوگ ان سے پورے طور پر متنفر ہو جائیں، آج بھی پوری دنیا میں اسلام کے خلاف یہی ہو رہا ہے، کسی نے داڑھی رکھ لی، کسی نے ٹوپی لگالی تو یہ دہشت گرد ہے، کسی نے باشرع صورت اختیار کر لی اور وہ مسلم معاشرے میں ہے تو اس کے بارے میں یہ پیشگی تصور کہ یہ چار شادیاں کرے گا اور کب بیوی کو طلاق دے دے گا کچھ نہیں کہا جا سکتا، یہ فروعی مسائل ایسے ہیں جو دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کو چاٹ رہے

ہیں، اور عالمی سطح پر ان کو لے کر ہمیں بدنام کیا جا رہا ہے- اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو ہمارا دانشور طبقہ ہے، جو ہمارے علماء ہیں، خطیب وقلم کار ہیں، جو پڑھے لکھے لوگ ہیں وہ تو اسٹیج رسول پر جا کر ایک دوسرے کو گالیاں دے کر چلے آئیں گے لیکن یہ سبق عوام کو نہیں دیں گے کہ اگر کوئی ان سے کہے کہ تم چار شادیاں کرنے والے ہو تو اس کا جواب کیسے دے اور چار شادیوں کا جواز کیسے پیش کرے-اگر وہ طلاق پر زبان درازی کرے تو وہ طلاق کی حکمت کو بتا سکے اور یہ واضح کر سکے کہ اسلام نے جو عورت کو مقام دیا ہے وہ کسی اور نے نہیں دیا ہے- تو خلاصہ یہ کہ آج ہمارے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی ہے اور ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ اس نفرت کا جواب کیسے دیں، آج اسلام کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، نہ تو میزائیل کا خطرہ ہے نہ بم اور بارود کا، آج جس بڑے دشمن سے اسلام کا سامنا ہے وہ نفرت کا دشمن ہے-

سوال :-مسلمانوں کی تعلیمی حالت سے آپ کتنا مطمئن ہیں؟ اور کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آج ایک طرف جہاں مسلم طلبہ کا رجحان تیزی سے عصری تعلیم کی طرف بڑھ رہا ہے وہیں دینی تعلیم سے ان کا رجحان کم ہوتا جا رہا ہے؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام :-میں بڑا مطمئن ہوں پورے طور پر مسلم معاشرے سے، خاص طور سے ۹۰ رکی دہائی جو ایک زخم پہنچا کر گئی اور اس زخم کی تڑپ نے ہمیں راستہ دکھانا شروع کیا کہ ہم آگے کیسے بڑھیں، دس سال پہلے کے بارے میں آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ مسلم سوسائٹی میں یہ تڑپ، یہ جستجو، کچھ کرنے کی خواہش، کچھ کر گزرنے کی تمنا لوگوں میں نہیں تھی، تو ایک طرح سے ہمیں بڑا زخم ملا، لیکن یہ ایک بڑا جھٹکا تھا جس نے ہمارے لیے بہت سے راستے کھول دیے- اور ہمیں بیدار کر دیا، ابھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مدرسے میں ایک تڑپ ہے لیکن تڑپ کے ساتھ ایک جھجک بھی ہے، کھل کر کوئی سامنے آنا نہیں چاہتا- جتنے علمائے کرام ہیں ان سے بیٹھ کر آپ تنہائی میں گفتگو کیجئے وہ روتے ہیں، قوم کے درد میں وہ غلطاں و پیچاں رہتے ہیں، سب کو احساس ہے کہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن اگر چند مجاہد مرد، علمی مجاہد، میدان میں اتر آئیں، بے خوف وخطر، اسلامی تعلیمات کے ساتھ اسلام کی عصری تعبیر وتشریح پیش کریں تو نقشہ بدل جائے گا- صرف وہ جھجک ہے علمائے کرام کی،

دانشوروں کی، جس کی وجہ سے وہ کھل کر بولنا نہیں چاہتے، آج آپ مدارس کے طلبہ کو دیکھیے، ہر ایک کے اندر ایک للک ہے، تڑپ ہے، کہ کیا ہم دنیا کے دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں؟ آج یہ بھی خوش آئند ہے کہ بہت سی ریاستوں نے مدارس کی ڈگریوں کو تسلیم کر لیا ہے اور بہت سے مواقع فراہم کر دیے ہیں کہ مسابقتی امتحانات میں بیٹھ سکتے ہیں، مدراس کے طلبہ نوکری حاصل کر سکتے ہیں، آپ بہار میں چلے جائیں وہاں مدارس کے سینکڑوں ایسے فارغین مل جائیں گے جنھوں نے بہار کی عالیت سے بی ایڈ کیا اور اس کی بنیاد پر ہائی اسکول کے ٹیچر ہیں، مدارس کی اسناد کی بنیاد پر انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور کالجز میں لیکچرار بنے ہوئے ہیں- تو بہر کیف آج نئی پیش رفت ہوئی ہے، صورت حال اطمینان کی ہے، لیکن اطمینان سے مراد یہ بھی نہیں کہ خوش ہو کر ہم غافل ہو جائیں، آج ابھی مہمیز لگانے کی ضرورت ہے، اور یہ مہمیز آپ کا رسالہ لگا سکتا ہے اور دیگر دینی رسائل لگا سکتے ہیں، علماء کرام لگا سکتے ہیں اور وہ خطباء لگا سکتے ہیں جو جمعے کی نماز پڑھاتے ہیں- آج بڑا المیہ ہے کہ علماء اور ائمہ کو ہمارا معاشرہ حقیر نظروں سے دیکھتا ہے، اس رجحان کو بدلنے کی ضرورت ہے، لیکن بہر کیف ان کا جو مقام آج ہے وہ بھی کوئی معمولی نہیں ہے، آج بڑے بڑے گاؤں میں چلے جائیں، جس طرح عوام اپنے امام کی آواز پر لبیک کہتے ہیں پردھان اور سرپنچ کی آواز پر نہیں کرتے، تو ان علماء اور ائمہ کو عوام کے اندر اب تعلیمی بیداری بھی لانے کی ضروت ہے-

سوال: -عصر حاضر میں تعلیم کا مقصود کیا ہے اور آپ کی نظر میں تعلیم کا صحیح مقصد کیا ہونا چاہیے؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام: -تعلیم کا مقصود صرف اور صرف کردار سازی ہے، تعلیم کو اگر آپ نے روزگار سے جوڑا تو ملیا میٹ ہو جائے گا- تعلیم کا یہ قطعی مقصد نہیں ہے کہ آپ نے علم حاصل کر لیا تو آپ کو روزگار مل جائے، ہاں! آپ اس کے لیے مستحق ہو گئے- یہاں یہ بات بھی ذکر کر دوں، انسان خلیفۃ الارض ہے، اس لیے ضروری ہے کہ علوم دینی بھی حاصل کیے جائیں، عصری بھی، تاریخ، تمدن، ثقافت اور حالات سے واقف رہا جائے کیوں کہ خلافت

زمین ہی پر کرنی ہے فضا میں نہیں-

سوال: -آج ہندوستان میں تعلیم کے حوالے سے بہت سے منفی رجحانات ہیں، خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے تعلق سے مسلم معاشرہ میں، لوگ کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو پڑھا کر کیا کرو گے؟ آخر تو انہیں چولہا ہی جلانا ہے؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام: -کوئی ان سے میری طرف سے یہ سوال کرے کہ آج اگر لیڈی ڈاکٹر کو عورتوں سے باتیں کرنی ہو یا عورتوں کا علاج کرنا ہو تو مسلم ڈاکٹر کہاں سے لاؤ گے؟ چراغ لے کر ڈھونڈتے رہ جائیں گے وہ، اگر ایک دو انہیں ملیں گی بھی تو برائے نام ملیں گی، چلیے ڈاکٹروں کو چھوڑیے، کوئی کسی ایسی عورت کو مسلم معاشرے سے ڈھونڈ کر نکال دے کہ وہ سیرت رسول پر تقریر کر سکے؟ آج اگر عورتوں کو تعلیم نہ دی گئی تو ہماری بنیادیں زیادہ کمزور ہو جائیں گی، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بچیوں کی تعلیم بچوں سے زیادہ ضروری ہے- اور رہا یہ کہنا کہ عورتوں کو چولہا ہی جلانا ہے، تو میں کہوں گا کہ تعلیم کے تعلق سے جب اسلام نے کوئی فرق نہیں کیا تو ہم کون ہوتے ہیں فرق کرنے والے، میں عورت کو شمع محفل بننے کی وکالت نہیں کرتا، وہ گھر کے اندر کی ہی ذمہ داریاں نبھائیں، لیکن اس کے ساتھ علوم کی تحصیل اور حالات سے آگہی ان کے لیے بھی تو ضروری ہے تا کہ وہ ایک باشعور شخصیت کے ساتھ بچوں کی بھی باشعور شخصیت کی تعمیر کر سکیں- نسل کی تعمیر بنیادی طور پر تو عورتوں ہی کے ہاتھ میں ہے-

سوال: -عصر حاضر میں مذہبی صحافت کی اہمیت کیا ہے؟ اور مذہبی صحافت کو اپنا ہدف پانے کے لیے اور کیا کیا کرنا چاہیے؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام: -آپ نے مذہبی صحافت کو ایک نیا رجحان دیا ہے- پہلے تو پہلی نظر میں پتہ چل جاتا تھا کہ یہ ایک دینی رسالہ ہے، چلو اسے سائڈ کرو، ضرورت تھی اس قسم کی پیش کش کی کہ دیگر رسالوں میں بھی اس کا ایک مقام ہو- میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں مذہبی تعلیمات نہ ہوں، رسالے تو مذہبی تعلیمات پر ہی مبنی ہوں، لیکن پیش کش عصری ہو، آپ صوفیہ کے طرز تبلیغ پر غور کریں کہ انہوں نے گیروا لباس کیوں زیب تن کیا؟ کوئی بھی رنگ اختیار کر سکتے تھے، لیکن ایسا انہوں نے اسی لیے تو کیا کہ معاشرتی ہم آہنگی پیدا ہو، لیکن آپ

تو رسالوں پر گنبد و مینار کی تصویر دے کر اسے الگ کر دیتے ہیں، ان کا تقدس بسر و چشم تسلیم، لیکن اس سے ان کی بے حرمتی بھی تو ہوتی ہے، آپ زمانے کے ساتھ چلیے، نئے نئے ڈیزائن لائیے، میں یہ نہیں کہتا کہ تصویر چھاپیے، لیکن تزئین تو عصری ہو، یہ تو صحافت کی اولین چیز ہے- عمدہ پیش کش تو موجودہ صحافت کی روح ہے- مجھے خوشی ہے کہ اس حوالے سے بھی آپ کا کام قابل ستائش ہے-

سوال:- جام نور اور اس کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

ڈاکٹر خواجہ اکرام:- مولانا رحمت اللہ صدیقی نے پہلی بار مجھے جام نور عنایت کیا، دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت اور مسرت ہوئی، پورا رسالہ ایک نشست میں پڑھ گیا- تاثرات کی جہاں تک بات ہے، میں اس تعلق سے آپ کے منہ پر کچھ بھی نہیں بولوں گا، آپ اسے ستائش سمجھیں گے، البتہ میں اپنے تاثرات دوسری جگہوں پر لکھ کر بھیجوں گا- یقیناً جام نور نے صحافت کی دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ خدائے تبارک وتعالیٰ آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ آپ اسے مزید پہنائیاں عطا کر سکیں، اس کو مزید ترقی دے سکیں- قارئین تک ضرور یہ بات پہنچانا چاہوں گا کہ وہ آپ کا زیادہ سے زیادہ تعاون کریں کیوں کہ یہ ایک ایسا رسالہ ہے جسے ہر طبقے کے لوگ انتہائی دلچسپی سے پڑھتے ہیں، آپ سے میری گزارش ہے کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق ہر ممکن تبدیلی کرتے رہیں- اب تک آپ نے اس میں جو فنی جوہر اتارا ہے، اس سے آپ کی جو صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں، اس تعلق سے تاثرات کے بارے میں ایک بار پھر وعدہ کرتا ہوں کہ میں دوسری جگہوں پر لکھ کر بھیجوں گا- آپ کے سامنے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا-□□□

(شمارہ جولائی ۲۰۰۶ء)

بیکل اتساہی

سابق ممبر آف پارلیمنٹ برائے حکومت ہند

مشرقی یوپی کا ایک چھوٹا سا قصبہ اترولہ ضلع بلرام پور میں یکم جون ۱۹۲۸ء کو ایک بچہ پیدا ہوا اور عام بچوں کی طرح ہی اس نے بھی دھول مٹی میں کھیلتے اور کھیتوں اور کھلیانوں میں اچھلتے کودتے اپنی زندگی کا آغاز کیا، مگر کسے معلوم تھا کہ اس الھڑ طفلانہ روش کے پیچھے اودھی اور پوربی زبان کا ایک عظیم شاعر، شعر وادب کا ایک بڑا سرمایہ اور کبیر و نظیر، میرا و خسرو کا ایک سچا جانشین پرورش پا رہا ہے، جو اپنے شعری مذاق سے شعر وادب کی ایک نئی تاریخ مرتب کرے گا- لودی محمد شفیع خاں بیکل اتساہی برصغیر کے اسی معروف شاعر کا نام ہے جنھوں نے ۱۹۴۰ء میں اپنا شعری سفر شروع کیا اور ۷۰ برسوں میں ہزاروں غزلیں، گیت، دوہے، نعتیں اور منقبتیں لکھ کر اپنی شعری صلاحیتوں کا خراج وصول کیا- میدان شعر وادب میں ان کے منفرد لب و لہجے سے متاثر ہو کر پنڈت جواہر لعل نہرو نے انھیں ''اتساہی'' کا لقب دیا- ۱۹۴۴ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا اور اس کے بعد کم وبیش اب تک تیس سے زائد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان میں کومل مکھڑے بیکل گیت، نغمہ و ترنم، اپنی دھرتی چاند کا درپن، رنگ ہزاروں خوشبو ایک، والنجم، والضحیٰ، والفجر، جام گل، پیام رحمت اور موتی اگے دھان کے کھیت قابل ذکر ہیں- آپ کے ادبی کارناموں پر ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے لیے متعدد ریسرچ ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے- بیکل کی ادبی خدمات کے حوالے سے انھیں ملک و بیرون ملک بے شمار ایوارڈز اور اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے، ان میں خاص طور پر حکومت ہند کی جانب سے ۱۹۵۵ء میں ''راشٹریہ گیت ایوارڈ'' اور ۱۹۷۶ء میں صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ''پدم شری'' کا اعزاز ذکر کے قابل ہیں- اسی حوالے سے آپ ۱۹۸۶ء میں ممبر آف پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) بھی بنائے گئے-

سوال :-اردو زبان وادب کی پچاس سال آب یاری اور خدمت کرنے کے بعد آپ اس کو موجودہ ہندوستان میں کس مقام پر پاتے ہیں؟

بیکل اتساہی :- اس پچاس سالوں میں اردو شعر وشاعری اور نثر نگاری میں کافی انحطاط آیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد یک بیک اردو کے لکھنے والے خائف ہو گئے اور اردو قلمدان یا تو ریفیوجیوں یا ایسے اردو فروش افراد کے ہاتھوں میں چلا گیا جن سے ہماری نسل یا ہماری قوم خائف رہی یا اردو بولنے سے کتراتی رہی، جس کا اثر یہ ہوا کہ ان پچاس سالوں میں اردو کا کلچر تقریباً ختم ہو گیا اور زبان باقی رہ گئی- مشاعرے اور ادبی جلسے جو اردو زبان وادب کی اشاعت کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے اب وہ بھی زیادہ تر تاجرانہ نقطۂ نظر یا تفریح طبع کے لیے ہوتے ہیں- برائے ادب یا برائے زبان بہت کم منعقد ہوتے ہیں، اس لیے ان کا معیار بھی انحطاط پذیر ہو گیا- حالانکہ اردو میں جو کشش ہے اس سے ہر قوم متاثر ہوتی ہے اور سماج متاثر ہوتا ہے، مگر اب اردو کو ہندوستان میں وہ مقام حاصل نہیں رہا، کیونکہ اسے مستقل نظر انداز کیا جاتا رہا ہے- یہ اور بات ہے کہ آج کی قوم جو واقعی اردو سے نفرت کرتی ہے وہ بھی اردو بولنے پر مجبور ہے، وہ لوگ اپنی تقریروں میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے اردو شعر Qoute کرنے پر مجبور ہیں، ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے-

سوال :- کیا زبان کسی ملک اور مذہب کی پابند ہوتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر فرقہ پرست طاقتیں اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر اسے مٹانے پر کیوں آمادہ ہیں؟

بیکل اتساہی :- جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں یہ ان کی نادانی اور بدعقلی ہے اور وہ شاید زبان وادب کی تاریخ سے واقف نہیں ہیں- ان کو یہ نہیں معلوم کہ کوئی بھی زبان یا کوئی بھی ادب کسی کی پوتی نہیں ہوتی- مثال کے طور پر اگر یہ مان لیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی ہے تو ملک محمد جائسی، رسخان، قاسم دریا آبادی اور حضرت امیر خسرو کون تھے؟ جنہوں نے ہندی کو اتنا بڑا سرمایہ دے دیا ہے کہ اس کا جواب اب تک ہندی دانوں کے پاس بھی نہیں ہے- یہ تو ان کی نادانی یا احساس کمتری سمجھئے کہ وہ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں- اسی طرح اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو رگھو پتی سہائے فراق گورکھپوری، برج نارائن چکبست

یا نسیم کون ہیں؟ یہ سب مسلمان تو نہیں تھے؟ آخر انھوں نے اردو کو اتنا بڑا سرمایہ کیسے دیا؟ یہ تو ان کی احساس کمتری اور اردو کو زیر کرنے کے لیے ایک سوچی سمجھی سازش ہے جبکہ اردو یہیں پلی، یہیں بڑھی، یہیں بنی اور یہیں سنوری- اس کی نشو ونما میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی اہم کردار تھا- ہاں! یہ ضرور ہوا کہ آزادی کے بعد یہ پاکستان کی قومی زبان بن گئی تو اس چڑھ میں یہ لوگ اس طرح کی باتیں کرنے لگے-

سوال :- ہندوستان میں مغربی تہذیب کے زیر اثر انگریزی کو ہی کامیابی کا ذریعہ سمجھا جا رہا ہے اور ہمارے بچے اپنی مادری زبان سے بالکل دور ہوتے جا رہے ہیں، ایسے میں اردو زبان کو نئی نسلوں میں کس طرح منتقل کیا جائے؟

بیکل اتساہی :- میرے عزیز! یہ بہت اچھا سوال ہے- یہ صحیح ہے کہ آج کی نسل انگریزی کو ہی کامیابی کا ذریعہ سمجھ رہی ہے- اس کی بنیادی وجہ یہ رہی کہ دنیا کے اکثر ملکوں پر انگریزی حکومت کا قبضہ رہا جس کی وجہ سے ان تمام ملکوں میں انگریزی زبان غالب ہے، اس کے علاوہ انگریزوں نے ان ملکوں کے گرے پڑے لفظوں کو Adopt کر کے اپنے تلفظ میں خود اپنی ایک زبان بنائی، اس لیے اس انگریزی کو بہت اچھی زبان نہیں سمجھتا ہوں بلکہ Adopting Language سمجھتا ہوں، مگر ان کی چودھراہٹ، دولت کی فراوانی اور آزادانہ زندگی سے متاثر ہو کر میڈیا نے اسے خوب ترجیح دی اور خود ان لوگوں نے بھی اپنی تہذیب کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی- مزید برآں وہاں کی زمین کاروباری نقطۂ نظر سے کافی زرخیز رہی، اسی وجہ سے ہماری نسلوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم انگریزی جانیں گے تو باہر کچھ ٹھکانہ مل جائے گا اور ہم ترقی یافتہ کہلائیں گے وغیرہ- اپنی نئی نسلوں سے اردو کو آشنا کرانے کے سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے اسکولوں میں اردو زبان کو داخل کیا جائے اور اس کے لکھنے، پڑھنے اور بولنے پر زور دیا جائے اور اس کی اہمیت اور اپنی دیرینہ روایات کی تاریخ بچوں کے دلوں میں بٹھائی جائے تو بات بن سکتی ہے- جب تک شروع سے ہی بچوں کو اپنے گھروں میں اس کی تعلیم پر زور نہیں دیا جائے گا اس وقت تک اس کا حصول ممکن نہیں- ہمارے یہاں ایسے بہت سے ہندو ٹھاکر ہیں، لالہ ہیں جو آج بھی اردو پڑھتے ہیں اور ان کے بچے اردو میں M. A. کر کے نکلے ہیں- اس

لیے اردو زبان کو ایک تحریک کے طور پر چلائیں، اس کے رسم الخط اور تلفظ سے بچوں کو آگاہ کروائیں اور اردو کو عربی و فارسی کے ادق الفاظ کی بجائے علاقائی زبانوں سے جوڑنے کی کوشش کریں- اس سے لوگوں کی دلچسپی بڑھے گی اور یہی کام میں اپنی شاعری کے ذریعے پچھلے پچاس سالوں سے کر رہا ہوں-

سوال :- آپ کو اپنے وقت کے عظیم شعرا و ادبا کی صحبت حاصل رہی، جن کے درمیان آپ کی شاعری پروان چڑھی اور آپ نے اردو شاعری کے اس عہد زریں کا مشاہدہ بھی کیا- ایسے میں موجودہ شعرا اور ان کی شاعری کو آپ کس مقام پر پاتے ہیں؟

بیکل اتساہی :- آج سے تیس چالیس یا پچاس سال پہلے جو اردو شاعری یا اردو ادب کا معیار تھا اس نے بڑے بڑے ادیب پیدا کیے- آزادی سے پہلے ہندی والے بھی جب ہندی کو اپنی پہلی زبان کے طور پر پڑھتے تو دوسری زبان کی حیثیت سے اردو ضرور پڑھتے تھے تا کہ دونوں کے کلچر اور دونوں کے تلفظ سے واقف ہو جائیں، یہی وجہ ہے کہ اس وقت وہ اچھی شاعری کرتے تھے- آزادی کے بعد بھی ساٹھ اور ستّر تک بہت اچھی شاعری رہی جس سے ہم متاثر رہے اور وہ رنگ و آہنگ کو ہم استعمال کرتے رہے- ہماری روایت وہی تھی، ہماری علامتیں وہی تھیں اور ہمارے استعارے بھی وہی تھے- اب جیسے جیسے زندگی مشینی ہو رہی ہے ہماری علامتیں اور استعارے بدل رہے ہیں اور بدلنے بھی چاہیے، لیکن اس کے باوجود تجربے میں تجریدی شاعری اور جدید شاعری نے آکر تجربہ تو کیا، تاہم وہ پرانی اور روایتی شاعری کو چھو نہیں پائی- اب جو شاعری ہو رہی ہے اس کو میں بہت اچھی شاعری نہیں سمجھتا، شاید ان میں کچھ لوگوں کے دو چار مصرعے، دو چار غزلیں اور دو چار نظمیں ایسی ہوں جو پرانی شاعری کی مقابلے میں رکھی جا سکے- ہم خود پچاس ساٹھ سال سے لکھ رہے ہیں اور آج تک ہم نے نہیں سمجھا کہ ہمارا کوئی بھی مصرعہ ایسا ہو جو اردو ادب میں مقام حاصل کر سکے ابھی تو خود پر نہ اطمینان ہے اور نہ ہی یقین-

سوال :- فن شاعری میں جہاں آپ نے بے شمار اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے وہاں آپ نے صنف نعت پر بھی بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے، مگر جو مقام آپ کو ارباب اردو نے دیا وہ مقام علما اور مذہب سے وابستہ افراد نے نہیں دیا، آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

بیکل اتساہی :- یہ بات تو میں بہت دنوں سے محسوس کر رہا ہوں- اس کی ایک بڑی وجہ آپ اس واقعہ سے سمجھ سکتے ہیں، وہ یہ کہ ایک مرتبہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے ایک مفتی صاحب نے میری نعتیہ شاعری پر یہ کہہ کر اپنا فتویٰ صادر کیا کہ یہ صیغۂ تصغیر استعمال کرتے ہیں اور یہ کفر ہے، کیونکہ میں علاقائی زبان بھوجپوری اور اودھی میں لکھتا ہوں- میں نے جناب کے اس فتویٰ کی کوئی پرواہ نہیں کی کیونکہ بالکل انہی نعتوں کو جب میں نے اہل سنت کے اکابر علما مثلاً حضرت مفتی اعظم ہند، حضرت حافظ ملت، حضرت مجاہد ملت اور حضرت شیر بیشۂ اہل سنت علیہم الرحمہ کے سامنے پڑھا تو ان لوگوں نے اس کو سنا، داد دی اور خوشی سے میرا ماتھا چوم لیا- اس لیے میں مطمئن تھا کہ جب اتنے بڑے بڑے علما نے سنا، سراہا اور دادِ تحسین دی تو پھر یہ مفتی صاحب کون ہیں؟ اسی تصغیر پر اشرفیوں اور رضویوں کے درمیان نزاع بھی ہوا- آج کل کے بہت سے علما اور مفتیان کرام اودھی اور بھوجپوری کے قواعد اور اس کے محل صرف سے ناواقف ہیں، ان کو نہیں معلوم کہ یہ فارسی اور عربی کو بھوجپوری اور اودھی پر نہیں لا دسکتے- جیسے ہم بھوجپوری اور اودھی میں، بیٹا کو بیٹوا، دروازہ کو دوریا اور محل کو بکھریا کہتے ہیں تو یہ صیغۂ تصغیر ضرور ہیں، مگر ہم ان کو پیار اور عظمت و احترام سے کہتے ہیں- ان پر بلا سوچے سمجھے فتویٰ دے دینا نادانی ہے- مجھے نظر انداز کرنے کی ایک تو یہ وجہ رہی- دوسری یہ کہ یہ حضرات اتنے شدت پسند اور نادان ہیں کہ دوسرے نظریات سے ٹکرانے کے لیے انہی کی بات کرتے ہیں- اپنی بات کبھی بھی ہمارے اپنوں نے مثبت انداز میں نہیں کہی، ہمیشہ ان لوگوں نے منفی پہلو کو اٹھایا- اس لیے جو ان کے مسلک سے ناواقف ہے اسے یہ اپنا مسلک نہیں سمجھا پاتے بلکہ اس کی تردید کرنے لگ جاتے ہیں، اس حرکت سے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے- اگر ہم مثبت انداز میں اہل سنت کے عقائد کو اجاگر کرتے تو شاید آج اتنے فرقے وجود میں نہ آتے- ابھی تک ہمیں اپنے آپ کو سنوارنے کا موقع نہیں ملا ہے، کیونکہ ہم اسی میں الجھے ہوئے ہیں- یہ جب اپنے علما کو برداشت نہیں کر پاتے، آپس میں ہی ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے ہیں، معمولی باتوں پر جھگڑا کرتے ہیں تو پھر مسلک تو مسلک ہے- اسی وجہ سے مجھے نظر انداز کیا گیا، حالانکہ اس کی میں پرواہ نہیں کرتا، کیونکہ جو میں خدمت کر رہا ہوں آج نہیں تو کل کوئی اس کو مانے گا- گوئیوں

اور غیر شاعروں کو میرے مقابلے میں سراہا جاتا ہے- میں اپنی عمر کا اکیلا رہ گیا ہوں اور ہمارے ساتھی براتی جو کچھ مجھ سے بڑے بھی تھے اور کچھ ہم عمر بھی، جا چکے ہیں- جیسے علامہ ارشد القادری، مولانا ابوالوفا فصیحی غازی پوری، مولانا مشتاق احمد نظامی، مولانا سلیم بنارسی، یہ سب ایسے لوگ تھے جن کے ساتھ میں نے بہت وقت گزارا اور بہت سے محاذ پر ہم نے ایک ساتھ کام کیا ہے- یہ لوگ مجھے بہت اہمیت دیتے تھے اور عزت وشفقت کرتے تھے، اب ان کے چلے جانے کے بعد یہ لوگ مجھے نظر انداز کرتے ہیں، بڑوں نے مجھے بہت چاہا یہ انہی کا فیض ہے کہ آج میں چل رہا ہوں اور ان شاء اللہ چلوں گا بھی-

سوال :-آپ نے راجیہ سبھا کے ممبر کے طور پر ملکی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا ہے، کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ بی جے پی کی اقتدار میں آجانے کے بعد وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور شیو سینا جیسی فرقہ پرست تنظیموں کو کھلی چھوٹ مل گئی ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی؟

بیکل اتساہی: - یہ تو ہم کیا ایک گاؤں کا چھوٹا بچہ بھی سمجھتا ہے کہ آج انھیں کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے- آج بی جے پی نے فرقہ پرست تنظیموں کو بالکل کھلی چھوٹ دے رکھی ہے، یہ تنظیمیں اسلام دشمنی پر مبنی خیالات ونظریات اپنے بچوں کو پڑھا رہی ہیں اور اسلام اور مدارس اسلامیہ کے خلاف کھلے عام اپنی مجلسوں میں زہر اگل رہی ہیں، جبکہ سچائی یہ ہے کہ ہندوستان کے ہزاروں اور لاکھوں مدارس میں سوائے انسانیت اور اخلاق وکردار کے کوئی اور درس نہیں دیا جاتا- بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہماری سیکولر جماعتوں نے اپنی کرسی بچانے کے لیے انہیں پہلے نہیں روکا، اگر ان کی بدتمیزیوں پر اسی وقت پابندی لگادی جاتی تو آج نوبت یہاں تک نہیں پہنچتی- آج یہ کس منہ سے مسلمانوں کو دہشت گرد کہتے ہیں جبکہ سب سے بڑے دہشت گرد تو یہ خود ہیں- یہ دہشت گردی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک بھیڑ پہنچتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بابری مسجد شہید کردی جاتی ہے- کیا گودھرا میں صرف ہندو مارے گئے؟ مسلمان نہیں مارے گئے؟ اور جب اس کی تحقیقات کی گئی تو پتہ چلا کہ خود ان لوگوں نے ہی اسے کروایا تھا- بی جے پی ایمانداری سے اپنے اندر جھانک کر دیکھے کہ وہ کیا کررہی ہے؟ ان فرقہ پرست تنظیموں پر پابندی لگنی چاہیے یا نہیں؟ ان کی جرأت دیکھیے کہ ایک وزیر

اعظم بول رہا ہے، مگر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہے، یہ سب کچھ ان کی ملی جلی سازش کا پتہ دیتا ہے- تاہم یہ سب بہت دنوں تک چل نہیں پائے گا، قوم مسلم ایک اسپرنگ کی طرح ہے جو ایک دم اچھل کر سامنے آئے گی، اس لیے کہ مسلمان اب بیدار ہو چکا ہے، ہم نے پچاس سالوں تک بہت برداشت کیا، مگر اب مسلمانوں کو دبایا نہیں جاسکتا- اب تو سیاست اس منزل پر آگئی ہے کہ بھرشٹا چار، رشوت اور مذہب کے نام پر قتل وغارت گری عام ہوگئی ہے جبکہ یہ قطعی غلط ہے، کیونکہ کسی بھی ملک میں مذہب کے نام پر نہ سیاست چلی ہے اور نہ ہی چلے گی، اگر اللہ نے چاہا تو پھر سیکولر حکومت بنے گی-

سوال :-مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مسلم ممبران پارلیمنٹ اور سیکولر پارٹیاں ہندوستان کے ۲۰؍کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ کررہی ہیں؟ جبکہ فرقہ پرست اور شرپسند سیاسی جماعتوں کی طرف سے ہندوستان کو ہندو راشٹر بنائے جانے کی کوشش زوروں پر ہے؟

بیکل اتساہی: -جس طرح سکھوں میں دو گروپ ہے ایک سیکولر اور دوسرا فرقہ پرست، اسی طرح مسلمان بھی دو حصوں میں بٹ گئے ہیں، ایک حصہ تو سیکولر مسلمانوں پر مشتمل ہے، جس کی تعداد بہت زیادہ ہے، جبکہ دوسرا سیاسی مفاد کے لیے بی جے پی جیسی فرقہ پرست پارٹی میں شامل ہے- ایسے لوگوں نے اپنا ضمیر بیچ دیا ہے اور انہی کی زبان بولتے ہیں- خواہ وہ سید شہنواز ہوں یا مختار عباس نقوی، صرف اپنی کرسی بچانے کے لیے گجرات کے معاملے میں سرے عام مسلمانوں کے خلاف بول رہے ہیں اور انصاف کی بات نہیں کرتے جو سراسر غلط ہے- مسلم ممبران پارلیمنٹ کو اس کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے، مگر صرف اپنی کرسی کے لیے سب خاموش ہیں، حق اور سچ بات کہنے کے لیے ہمت چاہیے جو ان میں نہیں ہے- جس وقت بابری مسجد ڈھائی گئی اس وقت میں ایم پی تھا، میں نے تمام مسلم سیاسی لیڈروں (خواہ وہ کانگریس، بی جے پی، جنتا دل یا بی ایس پی کے ہوں) سے کہا تھا کہ آؤ سب مل کر استعفیٰ دے دیں ایک تاریخ بن جائے گی، لیکن سبھوں نے کہا کہ استعفیٰ دے تو دیا جائے، مگر میاں جو کام اندر رہ کر ہوسکتا ہے وہ استعفیٰ دینے کے بعد ممکن نہیں- اس وقت مجھے بہت ہی افسوس ہوا کہ لوگوں کو کرسی کا کتنا لالچ ہے، اگر آج بھی سارے مسلم

ممبران پارلیمنٹ خواہ وہ کسی بھی پارٹی کے ہوں حق کے لیے ڈٹ کر مقابلہ کریں اور ضرورت پڑے تو سب ایک ساتھ استعفیٰ دے دیں تو یقیناً فرقہ پرستوں کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

سوال:۔الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی تعمیر وترقی میں آپ کا کیا کردار رہا؟

بیکل اتساہی:۔حضرت حافظ ملت کی حیات میں الجامعۃ الاشرفیہ کو عربک یونیورسٹی بنانے کے لیے میں ان کی کفش برداری میں اکثر رہتا تھا۔ اس زمانے میں میں گورکھپور یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کورٹ ممبر بھی تھا۔اس وقت میں نے حافظ ملت علیہ الرحمہ سے یہ گزارش کی کہ حضرت جیسے دیگر یونیورسٹیز میں الگ الگ فیکلٹیز اور شعبے ہوتے ہیں اسی طرح جامعہ اشرفیہ مبارک پور کا بھی ہونا چاہیے، کیونکہ سنیوں کی ایک بھی عربی یونیورسٹی ہندوستان میں نہیں ہے۔چونکہ میں جامعہ ازہر مصر، مدینہ یونیورسٹی، ندوۃ العلما اور دوسری بہت سی یونیورسٹیز دیکھ چکا تھا، اس لیے میرے ذہن میں تھا کہ اس کو خوب کشادہ اور وسیع زمین پر پھیلایا جائے اور اس کے الگ الگ شعبے ہوں، لیکن ایسا نہیں ہو پارہا تھا جب کہ حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ اس پر رضا مند تھے اور ہمارے اس خیال سے علامہ ارشد القادری اور مولانا قمر الزماں اعظمی (جو اس وقت فارغ ہو چکے تھے) متفق تھے۔اس طرح دو چار ہی لوگ تھے جو یہ چاہتے تھے کہ جامعہ اشرفیہ مصباح العلوم پرانی بستی سے باہر نکل کر ایک وسیع زمین پر ہو، اس کے الگ الگ شعبے ہوں، اچھے ہاسٹل وغیرہ ہوں، اس کا ایک جامع دستور بنے، جس میں دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم ہوتا کہ ہمارے طلبہ کے اندر ہر طرح کے ماحول سے نبرد آزمائی کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ اسی عظیم مقصد کے لیے ۱۹۷۲ء میں تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی اور عربک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی گئی۔ بنیاد تو پڑ گئی، مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کو بنانے کے لیے وسائل نہیں تھے، کیونکہ حافظ ملت چندہ نہیں کرتے تھے۔اس وقت میں نے حافظ ملت کو مجبور کیا کہ آپ بمبئی چلیں، اس پر وہ تیار ہو گئے اور پھر میں، حضرت حافظ ملت اور علامہ ارشد القادری بمبئی گئے اور وہاں سے کئی لاکھ روپئے لے کر آئے۔ اس طرح دوسرے علاقوں کا بھی ہم نے دورہ کیا۔ پھر ہمیں حضرت کے بہت سے مریدین اور معاونین بھی مل گئے اور یہ کام شروع ہو گیا، مگر اب تک اس کی تکمیل نہیں ہو پائی ہے۔

اسی طرح جب اس کی دستور سازی کے لیے میٹنگ کی گئی تو میں بہت سی یونیورسٹیز کا دستور اپنے ساتھ لے کر اس میں شریک ہوا تا کہ اس کی مدد سے جامعہ اشرفیہ کا دستور بن سکے۔اس میٹنگ کو مفتی شمس الدین جونپوری علیہ الرحمہ چلا رہے تھے، حضرت علامہ ارشد القادری اور بہت سے علماء موجود تھے، میں نے کہا مجھے بھی کچھ بولنے کا موقع دیا جائے تو اس پر مفتی صاحب نے کہا کہ یہ علما کی محفل ہے، میں نے کہا کہ میں یونیورسٹی کا کورٹ ممبر ہوں آپ کو کچھ بتا سکتا ہوں کہ یونیورسٹی کسے کہتے ہیں، مگر ان کی تنگ نظری ایسی رہی کہ میں اٹھ کر چلا آیا۔حضرت حافظ ملت اپنے کمرے میں تھے، میں نے دیکھا کہ حافظ ملت کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ سب کچھ ہو چکا ہے، لیکن اتنی محنت کے باوجود اس کا دستور نہیں بن پارہا ہے اور آج تک نہیں بن پایا۔آج بھی اگر اس کے شعبے الگ الگ کر دیے جائیں اور اس کا ایک جامع دستور بن جائے تو یہ دنیا کا بے مثال ادارہ ہوگا۔آج بھی میں اس کی مجلس شوریٰ کا ممبر ہوں اور جب بھی اس پر کوئی آفت آتی ہے تو میں اس کے لیے ہمیشہ کھڑا رہتا ہوں۔

حضرت حافظ ملت کے انتقال کے بعد ایک نیا جھگڑا شروع ہوا تھا کہ اس ادارہ کا سربراہ کون ہوگا۔اس وقت میں ہی تھا جس نے سب سے پہلے آواز اٹھائی کہ مولانا عبد الحفیظ ان کے صاحبزادہ ہیں، B.E علیگ ہیں، اس لیے ان کو ہی سربراہ اور شیخ الجامعہ بنایا جائے۔ میری حمایت مولانا مظفر حسین کچھوچھوی، مولانا اسرار الحق اور علامہ ارشد القادری صاحب وغیرہ نے کی تو ان کو سربراہ بنا دیا گیا۔ میں نے حضرت کا جنازہ بھی مولانا عبد الحفیظ سے ہی پڑھوایا۔اس کے بعد کچھ لوگوں نے مل کر مولانا عبد الحفیظ کے خلاف ایک ریزولیشن پاس کیا کہ ان کو نکال دیا جائے، مجھے اطلاع ملی تو میں پھر پہنچا، میرے ساتھ مولانا مشتاق احمد نظامی، مولانا اسلم بستوی اور بھدوہی کے صوفی محبوب صاحب تھے۔میں نے پہنچ کر ان کے ہاتھوں سے وہ پورا کمیشن چھین لیا اور میں نے کہا کہ جو اپنے استاد کے صاحبزادہ کو نہ برداشت کرے وہ قوم کو کیا برداشت کرے گا؟ یہ لوگ تو چاہتے تھے کہ سب نکل جائیں اور یہ اسے اپنی نجی پراپرٹی بنا لیں، مگر میں نے ایسا ہونے نہیں دیا۔اس طرح اشرفیہ کی بنیاد سے لے کر اب تک اس ادارہ سے لگا ہوا ہوں اور اس کے ہر دکھ درد میں شامل ہوں اور میری

زندگی جب تک ہے اس کی ترقی و بہبودی کے لیے کرتا رہوں گا-

سوال:- مدارس اسلامیہ میں اردو زبان میں ہی تعلیم ہوتی ہے، پھر بھی طلبہ میں اردو ادب کا ستھرا ذوق نہیں پایا جاتا- ان میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے انھیں کس حد تک اردو کی باقاعدہ تعلیم و تربیت دینی چاہیے؟

بیکل اتساہی:- ہمارے جو طلبہ مدرسوں میں آتے ہیں وہ زیادہ تر اس لیے آتے ہیں کہ فارغ ہو کر جلدی سے کوئی ادارہ قائم کرلیں یا کہیں مدرس ہو جائیں یا پھر کسی مسجد میں امامت مل جائے- میرا خیال ہے کہ ایسے لوگ اگر اس کے ساتھ ادیب و ناقد اور شاعر بھی ہوں تو یہ سونے پر سہاگہ ہوگا اور اس کے ذریعے اردو اور دین کی اور بھی اچھی طرح خدمت ہوگی، مگر دینی تعلیم سے بھی ان کا مقصود زیادہ تر معیشت ہوتا ہے، اس لیے بالعموم مدارس اور طلبہ کی اس طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، جب کہ ہمارے دینی اداروں میں باقاعدہ اردو ادب کی تعلیم ہونی چاہیے- جب اشرفیہ کا نصاب مرتب کیا جا رہا تھا تو علامہ ارشد القادری، مولانا مشتاق احمد نظامی، مولانا اسلم بستوی اور میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ نصاب میں اردو ادب بھی داخل کیا جائے، لیکن یہ ہو نہ سکا، کیونکہ ہمارے علما ایک کنویں میں گھرے ہوئے ہیں اور آگے نکلنا نہیں چاہتے جب کہ اردو ہماری مادری زبان ہے، اسی زبان کے سہارے ہم مدارس میں تعلیم بھی دیتے ہیں اور اسی کے ذریعے ہندوستان میں دعوت و تبلیغ کا کام کررہے ہیں-

سوال:- ہندوستان میں ہمارے علما نے مذہبیات کو اردو ادب سے تقریباً علیحدہ کررکھا ہے یہی وجہ ہے کہ بالعموم ان کی تحریریں اغلاط سے بھری اور خشک ہوا کرتی ہیں- کیا اسی وجہ سے مسلمانوں کا ذہنی رجحان مذہبی لٹریچر کی طرف سے تقریباً ختم ہوکر رہ گیا ہے؟

بیکل اتساہی:- میرے پاس علما کے بہت سے رسائل و جرائد آتے ہیں اور کتابیں بھی آتی ہیں- میں ان میں عجیب و غریب جملے اور تراکیب دیکھتا ہوں اور بالعموم جو محاورے وہ استعمال کرتے ہیں وہ بھی غلط ہوتے ہیں، یہاں تک کہ رسم الخط میں بھی غلطیاں ملتی ہیں اور زبان و ادب سے کم واقفیت رکھتے ہوئے بھی ''علامہ'' بن جانا چاہتے ہیں- یہ صحیح ہے کہ اسی وجہ سے مسلمانوں کا ذہنی رجحان مذہبی لٹریچر کی طرف سے بالکل گھٹ کر رہ گیا ہے- اس

لیے میں جلسوں اور سیمیناروں میں جاتا ہوں تو علما کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتا ہوں-

سوال:- اخیر میں آپ ماہنامہ جام نور کے توسط سے مسلمانوں کو کیا پیغام دینا پسند کریں گے؟

بیکل اتساہی:- سب سے پہلے تو میرے عزیز میاں خوشتر نورانی آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے حضرت علامہ ارشد القادری کے جاری کردہ رسالہ کو دوبارہ جاری کر کے بہت اچھا کام کیا- اس رسالے کا ایک زمانے میں کافی تذکرہ رہا اور پھر بعد میں یہ بند ہوگیا - آپ نے اپنے داداجان کے اس مشن کو آگے بڑھا کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے- دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اتنی توفیق دے کہ زیادہ سے زیادہ آپ اس کو ادبی، سماجی اور دینی طور پر نکالیں اور اسے معاشرے تک پہنچائیں- میں اس کے ذریعہ اپنی قوم، علما اور شعرا کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ لکھیں اور نئے نئے مضامین پر اپنا اظہار خیال کریں تا کہ اس رسالہ کا معیار اور وقار مزید بلند ہو سکے اور لوگ کہیں کہ ہندوستان میں کم از کم ایک ایسا مذہبی رسالہ ہے جو بالکل منفرد ہے اور جس سے سب کو فائدہ پہنچ رہا ہے- آپ کے لیے بھی کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ! ❑❑❑

(شمارہ فروری ۲۰۰۳ء)

پروفیسر سید حسین الحق چشتی

صدر: شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا

پروفیسر سید حسین الحق چشتی سجادہ نشین دائرہ حضرت شاہ وصی سہسرام (پ ۱۹۴۹ء) کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں- مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام سے ۱۹۶۹ء میں فراغت کے بعد ۱۹۷۲ء میں پٹنہ یونیورسیٹی سے اردو میں ایم اے، ۱۹۷۴ء میں مگدھ یونیورسیٹی سے فارسی میں ایم اے اور ۱۹۸۵ء میں مگدھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا- ۷۶-۱۹۷۶ء میں لکچرار، ۱۹۸۶ء میں ریڈر اور ۱۹۹۲ء میں پروفیسر ہوئے اور اب شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کے صدر ہیں- آپ کے دو ناول اور سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، جن کی فنی حیثیت پر مختلف جہات سے گفتگو کا سلسلہ دراز ہے- ہندو پاک کے اہم ترین رسائل و جرائد میں آپ کے افسانے اور تصوف وتنقیدی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں- آپ کا فن تصوف وادب کا حسین سنگم ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی دیگر کتابوں میں آثار حضرت وصی، آثار بغاوت، آثار حضرت وحید بنارسی، آداب حج وزیارت وغیرہ بھی لائق ذکر ہیں- آپ تقریباً ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنف، درجنوں کتابوں کے مولف ومرتب ہیں- مختلف رسائل وجرائد کے مدیر اور مجلس ادارت میں شامل رہے ہیں- آپ کی غزلوں، نظموں اور تصوف کے مضامین کے مجموعے بھی عنقریب منظر عام پر آنے والے ہیں- تقریباً دو درجن اسکالرز آپ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کر چکے ہیں- پٹنہ یونیورسٹی، کولکاتا یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سلیکشن کمیٹی کے آپ ممبر بھی ہیں- آپ قاضی علی حق اکیڈمی سہسرام، مولانا انوار الحق شہودی لائبریری گیا اور دو دینی مدرسے کے بانی وسرپرست بھی ہیں، آپ کو مختلف ادبی ایوارڈز سے بھی نوازا جا چکا ہے-

سوال :- خاندان قطبیہ مدنیہ کی شاخ حضرت قاضی علی حق کے اجڑنے اور بسنے کی داستان اور اس کی علمی ودینی اور ادبی ووطنی خدمات کیا ہیں؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی :- حضرت قطب الدین مدنی کڑوی مانک پوری کے چھوٹے صاحبزادے حضرت قاضی تاج الدین قاضی بدایوں کی ایک شاخ پہلے موضع رونی ملاپا اور اس کے بعد اعظم گڑھ کے ایک موضع داناپور (نزد تحصیل جین پور) میں منتقل ہوئی- بعدہ مفتی امر اللہ صاحب کو افتا سپرد ہوا اور یہ غازی پور کی طرف منتقل ہوئے جہاں کے ایک موضع لہنہ میں ان کی سسرال بھی تھی- ان کے پوتے میر اشرف علی خاندان میں مخدوم غلام اشرف کے نام سے مشہور ہیں اور سید المتاخرین وتمغہ تازہ وغیرہ میں ان کے تذکرے دستیاب ہیں- یہ خانوادہ حضرت غلام اشرف کی حیات ہی میں آڈاری (ضلع بلیا) منتقل ہوا اور قدیمی کھیتان کے مطابق کئی گاؤں کی زمینداری حضرت قاضی علی حق کے وقت تک موجود رہی جسے انگریزوں نے صرف اس لیے ضبط کر لیا کہ قاضی علی حق نے ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے راجا ارادت جہاں اور جگدیش پورہ (آرہ) کے راجا کنور سنگھ کا ساتھ دیا تھا- کاغذات میں جائداد کی ضبطی اور مصائب کی سختی کے شواہد موجود ہیں- راقم نے اپنی کتاب ''آثار بغاوت'' میں تمام تفصیلات کو یکجا کر دیا ہے- یہ کتاب خدابخش لائبریری پٹنہ نے شائع کی ہے-

قاضی علی حق کی جب ساری جائداد ضبط کر لی گئی اور انہیں باغی قرار دے کر وقت مقررہ کے اندر علاقہ چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا تو وہ مجبوراً اپنی سسرال سہسرام منتقل ہوئے- ان کی سسرال والے دراصل موضع دینارہ کے رہنے والے تھے- دینارہ کی مشہور شخصیت قاضی بازید کے بھائی کی اولاد میں حضرت شاہ بندہ علی حضرت قاضی علی حق کے خسر تھے- حضرت قاضی علی حق کے صاحبزادے حضرت وحید الحق تک خاندانی سلسلہ طریقت (سلسلہ کبرویہ) تو پہنچا ہی تھا مزید برآں چوں کہ آپ اپنے پردادا حضرت غلام اشرف ماں کی طرف سے ''اشرفی جزئیت'' سے بھی سرفراز تھے، اس لیے گویا حضرت وحید الحق پر ''چشتیت'' واشرفیت کا اثر تین پشت پہلے ہی سے جلوہ پاشیاں فرما رہا تھا- نتیجتاً حضرت وحید الحق اپنے والد کے

مجاز و نائب ہونے کے باوجود اپنے وقت کے مشہور صوفی عالم، شاعر اور دانش ور بزرگ
حضرت خواجہ قیام اصدق کی طرف متوجہ ہوئے اور سلسلہ چشتیہ قادریہ میں باضابطہ اجازت و
خلافت سے نوازے گئے۔

حضرت وحید الحق کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت وصی الحق مسکین اصدقی،
حضرت واعظ الحق مسرور، حضرت مولانا انوار الحق شہودی المتخلص بہ حضرت نازش سہسرامی،
حضرت بہاء الدین معمور سہسرامی، جناب آصف سہسرامی، جناب وسیم الحق وسیم، جناب
مولانا نسیم الحق نسیم مسروری، جناب نعیم الحق مسرور، جناب مولانا ڈاکٹر عین تابش، جناب
ڈاکٹر زین رامش، عزیزی سید عینین علی حق اور عزیزی نورین علی حق تک فضل و کمال اور
خدمت خلق کے لیے انتھک محنت کرنے والوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

علمی و ادبی خدمات کے ضمن میں خود کچھ کہنے سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ
ایک کتاب ''شہودی وراثت'' کی طرف منتقل کروں جس کے مصنف حضرت سید شاہ مشاہد
اصدق صاحب سجادہ خانقاہ اصدقیہ پیر بیگہ شریف ہیں۔ ان کا فرمانا ہے:

''دائرہ حضرت وصی کے سجادگان نے رشد و ہدایت کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی
خوب خوب کام کیا ہے۔ غالباً حضرت خواجہ قیام اصدق اور ان کے دو خلفا حضرت فخر الدین
حسین سخن دہلوی اور حضرت باقر پیر بیگھوی (تلامذہ غالب) کے بعد ادب و تصوف کا جتنا
کام دائرہ حضرت وصی نے کیا، اتنا کام اور کوئی دوسری اصدقی خانقاہ نہ کرسکی۔ دائرہ حضرت
وصی کی کم از کم ۳۰ کتابیں مطبوعہ ہیں۔ دائرہ کی نمایاں علمی شخصیتوں میں حضرت مولانا انوار
الحق شہودی نازش سہسرامی، حضرت آصف سہسرامی، جناب پروفیسر حسین الحق، ڈاکٹر عین
تابش اور ڈاکٹر زین رامش کے اسماء بطور خاص قابل ذکر ہیں۔''

دینی خدمات کا معاملہ یہ ہے کہ خاکسار کی نگاہ میں علم و ادب کا کام بھی کوئی غیر دینی
کام نہیں ہے پھر بھی عرف عام کی فہم کے مطابق بھی عرض کرنا ضروری ہے تو اس باب میں
اول لازمی کلمہ یہ ہے کہ خانقاہوں میں دینی کام قولی اور عملی زیادہ ہوتا ہے تحریری کم، تین
نسلوں کی محنت میرے سامنے ہے اور اس کے نتائج بھی۔ دینی کام کرنے والوں کی اپنی

بساط، مواقع اور حالات وغیرہ کے مطابق یہ کام اطمینان بخش ہے۔ دراصل اہل اللہ کی تین
چوتھائی زندگی تو خود پر محنت کرنے میں گزر جاتی ہے۔ پھر بھی وحدت الہ، شرف آدم کا نقطہ
عروج، اسلام کا روحانی نظام، فوز و فلاح کی گمشدہ کڑی، آداب حج و زیارت، آثار حضرت
وحید، آثار حضرت وصی، غیاث الطالبین، گویا دینی خدمات کے نام پر کھاتے میں آٹھ
کتابیں، دو مدرسے، ایک لائبریری، دو خانقاہیں، ایک درجن علما، ایک درجن مجاز و نائبین،
سیکڑوں کی تعداد میں موجود آثار و مخطوطات کی حفاظت اور کئی عدد حفاظ۔ بس اللہ قبول
فرمائے۔ آمین!

سوال:- اصدقی بزرگوں کے پیغامات، ان کی بے نیازی، ان کی علمی و دینی اور
ادبی و ملی خدمات کیا ہیں اور ان میں تب سے اب تک اپنے اپنے عہد میں نمایاں شخصیات
کون رہی ہیں؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی:- اس سلسلے میں یاد رکھنے والی بنیادی بات یہ ہے کہ
اصدقی بزرگ ملت اسلامیہ اور مسلک صوفیہ کا ہی ایک حصہ تھے لہٰذا بہ صمیم قلب ایک بات بہ
آسانی کہی جاسکتی ہے کہ جو پیغام محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اتباع میں غوث
پاک اور خواجہ غریب نواز کا ہے۔ ان تین Role models سے الگ کون سا پیغام ہوگا؟

اس بنیادی حقیقت کے اعتراف کے بعد عرض یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کی توسیع تو ہر دور
میں ہوا کی ہے اور ہر معلم اور ٹرینر کی کچھ اپنی ذاتی خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ شاید بعد کے
خانوادوں اور اشخاص کے پیغامات کا جواز یہی ہے۔ اس لحاظ سے اول مرحلہ سلسلہ چشت
اہل بہشت کے پیغام کا ہے جس کا ایک بڑا ہی دلچسپ تعارفی سرنامہ بھی ہے اور وہ یہ کہ تمام
سلاسل میں تربیت کا ایک نصاب ہوتا ہے اور ان سلاسل کے بزرگوں کے پیغامات اسی
نصاب کے ذیل میں آتے ہیں، مگر چشتیوں کا کوئی نصاب نہیں ہے، یہاں مریض دیکھ کر
فیصلہ ہوتا ہے کہ کون سا طریقہ علاج اور کون سی دوا اس مریض کے لیے کافی اور ضروری ہے۔

اس پس منظر میں اصدقی بزرگوں کے پیغامات میں عرفان الٰہیہ اور انسانی مساوات کو
بطور خاص نمایاں کیا جاسکتا ہے۔ ماضی قریب کے تقریباً تمام اصدقی صوفیہ یا تو وحدت

الوجودی تھے یا وحدت الشہودی، گویا بہرطور عرفان الٰہ کا شاغل ہونا ان کا اولین پیغام ہے اورانسانی سطح پر حضرت خواجہ قیام اصدق علیہ الرحمہ سے عہد حاضر تک تمام اصدقیوں کے یہاں جو انکسار، تواضع، بردباری، تحمل، سادگی اور ''عرفان کبد'' (مشقت کی معنویت کا عرفان) ہے، وہی ان اصدقی صوفیہ کا عمل بھی ہے اور پیغام بھی- اصدقی صوفیہ کی زندگیوں کے مطالعے سے ایک اور اہم پیغام یہ بھی ملتا ہے کہ اگر اسلام عرفان توحید ورسالت کا نام ہے تو توحید پر استقامت کا اعلان نماز کے ذریعہ اور رسالت محمدی پر استقامت کا اعلان صلوٰۃ وسلام کے ذریعہ ہی ممکن ہے، جو صلوٰۃ وسلام کا منکر ہے وہ گویا عرفان رسالت سے محروم ہی نہیں بے نیاز بھی ہے، جس طرح نماز کے لیے پکا سچا صالح مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح صلوٰۃ وسلام کے لیے پہلے ہی اتباع رسول کی شرط بے معنی ہے، دراصل یہ دولت بھی صلوٰۃ وسلام کے ذریعہ ہی ممکن ہے-

اصدقی بزرگوں کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل پوری کتاب کی طالب ہے، لہٰذا یہاں صرف بطور اشارہ عرض ہے کہ گزشتہ پونے دوسو برسوں میں اس سلسلے سے متعلق بزرگوں نے کم از کم لاکھ لوگوں تک دین اور علم کا پیغام تو ضرور ہی پہنچایا ہوگا- دوم یہ کہ ۱-حضرت خواجہ قیام اصدق ۲-حضرت مولانا خواجہ شاہ شہود الحق ۳-حضرت مولانا شاہ محمد سعید حسرت عظیم آبادی ۴- حضرت مولانا فرید الدین فرید ثانی سہسرامی ۵- حضرت فخر الدین حسین سخن دہلوی ۶-حضرت علامہ باقر پیر بیگھوی ۷-حضرت مولانا غیاث الدین شریفی اصدقی ۸-حضرت حافظ مولانا محمد انوار الحق شہودی نازش سہسرامی ۹-حضرت مولانا سلیمان اشرف ۱۰-حضرت مولانا افضل حسین فریدی ۱۱-حضرت مولانا شاہ احتشام الدین فریدی ۱۲-شیخ الحدیث مولانا شاہ ظہیر الدین فریدی ۱۳-حضرت واعظ الحق مسرور سہسرامی ثم اورنگ آبادی ۱۴- حضرت نعیم الحق مسرور اورنگ آبادی ثم سہسرامی ۱۵- حضرت شاہ کبیر الدین فریدی غازی پوری ۱۶-حضرت شاہ عبدالعزیز خاں نوری اصدقی میرٹھی ۱۷-حضرت مولانا شاہ غلام قادر اصدق بانی مدرسہ غریب نواز ہزاری باغ- کم از کم بیس ایسے علماء، صوفیہ، ادبا اور دانش وروں کا بہ آسانی تذکرہ کیا جاسکتا ہے جو اپنے اپنے عہد میں

مشاہیر عصر رہے، جن کی تحریریں اور کتابیں (زیادہ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ بھی) موجود ہیں جن پر جامعات میں تحقیقی کام کیے گئے جن پر مشاہیر نے مضامین لکھے اور جن کا سلسلہ ان کے خلفا و مجازین کے ذریعہ ہنوز قائم و دائم ہے-

تادم تحریر زندہ و تابندہ اصدقیوں میں حضرت مولانا رکن الدین اصدق، جناب ڈاکٹر ابو منور گیلانی، صدر شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی مظفر پور، جناب ڈاکٹر مولانا عین تابش صدر شعبہ انگریزی، مرزا غالب کالج گیا، جناب ڈاکٹر زین رامش، ریڈر شعبہ اردو ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ، جناب ڈاکٹر قاسم فریدی صدر شعبہ اردو سنہا کالج اورنگ آباد- مولانا نور الدین اصدق، مولانا نورین علی حق، مولانا ثاقب فریدی، سید عینین علی حق ایم اے، مولانا ارشد افضلی کا ذکر بطور خاص ضروری ہے- یہ وہ لوگ ہیں جو صاحب کتاب بھی ہیں اور صاحب فضل و کمال بھی- ان میں اگر مولانا رکن الدین اصدق اور ڈاکٹر مولانا عین تابش کو مشاہیر عصر میں شمار کیا جاسکتا ہے تو بقیہ کی شہرت و عرفیت اور خدمات میں بھی کوئی کلام نہیں-

مزید برآں بہار و جھارکھنڈ میں اصدقی مدارس کا ایک جال سا بچھا نظر آئے گا- کم از کم ایسے ۳۰ مدارس کا بہ آسانی ذکر کیا جاسکتا ہے جنہیں یا تو اصدقی بزرگوں نے قائم کیا یا جن کا انتظام وانصرام اصدقی بزرگوں اور نوجوانوں کے ذمہ ہے- یہی حال خانقاہوں کا ہے- کم از کم ۲۰ اصدقی خانقاہیں بہار، یوپی اور جھارکھنڈ میں موجود ہیں، جن سے کم از کم بیس ہزار افراد ضرور منسلک ہوں گے اور اگر معتقدین کو بھی شمار کیا جائے تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ سکتی ہے- یہی حال کتابوں اور تحریروں کا ہے کہ کم از کم ۲۰۰ مطبوعہ کتابیں اور دو تین ہزار مضامین ان کے کھاتے میں بہ آسانی جمع کیے جاسکتے ہیں-

اگر اسے تعلّی نہ سمجھا جائے تو میں عرض کروں کہ بہار میں ایسی مشغول و متحرک کوئی دوسری خانقاہ نہیں ہے-

سوال:- آپ نے کبھی انجمن تصوف پسند مصنفین قائم کیا تھا، کیا اب اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتے؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی:- جی ہاں! میں نے انجمن تصوف پسند مصنفین قائم کی اور

کل ہند پیمانے پر اس کا استقبال کیا گیا، ڈاکٹر وحید اشرف، ڈاکٹر اکمل اجملی مرحوم، سید محمد اشرف، شکیب ایاز، ڈاکٹر شاہ طلحہ رضوی برق، ڈاکٹر علی امام، مولانا مصباح الحق عمادی، ڈاکٹر سید حسین احمد، یہ نام بر سبیل تذکرہ یاد آ گئے ورنہ انجمن کی فائل اگر کھنگالوں تو شاید پچاسوں نام نکل آئیں گے- انجمن کے قیام کے سلسلے میں ایک کلیدی مجریہ جاری کیا گیا، پھر متعدد حضرات کے سوالات کے جوابات دیے پھر ''انجمن تصوف پسند مصنفین - ایک تعارف'' کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی شائع ہوا، اس کی شاخیں بھی قائم ہوئیں مگر انجمن کے مسلسل متحرک نہ رہنے کے دو بڑے اسباب ہیں-

(الف) تصوف پسندوں پر یہ واضح ہی نہیں ہے کہ خانقاہیت اور تصوف پسندی کی حقیقت کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا ہے، مزید برآں ا- تصوف پسند ادب کو کیا کرنا ہے ۲- تصوف پسند ادیب کو کیا کرنا ہے- تصوف پسندوں پر اس کی وضاحت بھی ضروری ہے-

(ب) منم شیخم، ہم چنیں دیگرے نیست، قطب از جانمی جنبد، مستند ہے میرا فرمایا ہوا وغیرہ محاورے آج کی تاریخ میں خانقاہیوں اور تصوف پسندوں پر جتنا صادر آتے ہیں کسی اور پر نہیں، ہر شیخ اپنی گدڑی میں مست ہے (الا ماشاء اللہ) یہاں مکالمہ بند ہے، کھڑکی بند ہے، تازہ ہوا کا گزر نہیں، جس نے تازہ ہوا چاہی وہ ملحد قرار پایا، یہ وہ مینڈک ہیں جنہوں نے اپنے تالاب کو سمندر جانا ہے اور اپنی ٹرٹراہٹ کے آگے کسی کا نغمہ بھی سننے کو تیار نہیں- میرا تجربہ یہ ہے کہ مینڈک تولے نہیں جا سکتے-

(ج) انجمن تصوف پسند مصنفین کو میں نے معطل نہیں کیا- میں نے اسے مزید فعال بنانے کے لیے اپنے حصار سے باہر نکالنا چاہا- اس کی آخری میٹنگ ڈاکٹر شاہ حسین احمد سجادہ نشیں خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی کی ایما پر خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی میں منعقد ہوئی اس میٹنگ میں جناب مولانا مصباح الحق عمادی سجادہ نشیں خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی کو اس انجمن کا صدر اور ڈاکٹر شاہ حسین احمد کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا- اس کے بعد یہ انجمن نکل گئی کوسوں دور دیار حرماں سے، مجھے پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی-

میں اب بھی اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کیوں کہ خانقاہیوں کا ایک پلیٹ فارم پر

آنا جتنا مشکل ہے، تصوف پسندوں کا ایک پلیٹ فارم پر آنا اس کی بہ نسبت آسان ہے اور اس وقت ملت کو، ملک کو اور انسانیت کو جن چند چیزوں کی بہت شدید ضرورت ہے اس میں ایک تصوف پسندی بھی ہے- خدا کرے کہ کوئی قلندر پھر اٹھے اور آواز لگائے......ع

من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

سن رسیدہ ہونے کے باوجود میں آج بھی اس آواز پر لبیک کہنے کو تیار ہوں-

سوال:- خانقاہیت اور تصوف پسندی کی حقیقت کیا ہے؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی:- خانقاہیت اور تصوف پسندی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ بہت مشکل سوال ہے، اس میں کچھ ناگفتنی بھی ہے، خوف اور فساد خلق کا خطرہ بھی ہے، پھر بھی آپ نے سوال کیا ہے تو عرض کرنا ہی پڑے گا-

پس عرض یہ ہے کہ میری نظر میں تصوف مذہب کی روح ہے اور مذہب قرآن کی نظر میں صرف ایک ہے اور وہ ہے اسلام- حضرت آدم سے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی مذہب، ایک ہی دین، ایک ہی پیغام مختلف زمانوں میں، مختلف زبانوں میں، مختلف اسالیب میں انسانوں تک پہنچتا رہا- توحید پرست بنو، انا رکی پسند (مشرک) نہ بنو- سنت اللہ (رسالت، وسیلہ) کو اپناؤ، وسیلے کو وسیلہ ہی رہنے دو، ذریعہ ہی رہنے دو، منزل نہ بناؤ، خدا نہ بناؤ، رسول کو رسول ہی رہنے دو اوتار یا خدا کا بیٹا وغیرہ نہ بناؤ- یہ ایک بہت واضح عقلی اور سائنسی نقطہ نظر ہے جس کی خدا اپنے بندوں کو تعلیم دے رہا ہے-

میں بہت سے مستند علما کے تتبع میں تصوف کو مذہب کی روح مانتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ ہر روح کا ایک چہرہ ہوتا ہے جس سے وہ متعارف ہوتی ہے، روح مذہب کا چہرہ شریعت ہے، یہ ہر پیغمبر کی زمانی و مکانی ضرورتوں کے مطابق مختلف ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے، قرآن ارشاد فرماتا ہے:

تم میں سے ہر ایک کو ہم نے دیا ایک شریعت اور راستہ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک دین پر کر دیتا لیکن وہ تم کو آزمانا چاہتا ہے، پس تم خوبیوں اور نیکیوں کی طرف دوڑو- اللہ کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے، وہ تم کو جتا دے گا (اور بتا دے گا) جس بات میں تم کو اختلاف

تھا-(مائدہ:۴۸)

تصوف مذہب کی روح ہے اور فقہ مذہب کا چہرہ- اسے بہ الفاظ دیگر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تصوف مذہب کی جمالیات ہے اور فقہ مذہب کی شعریات (بوطیقا)-تشکیل و تربیت کے مراحل میں شعریات یعنی ضوابط وقوانین معاون تو ضرور ہوتے ہیں مگر متحرک کرنے کی طاقت شعریات (ضوابط) میں نہیں جمالیات میں پنہاں ہے جو انسان کے اندر داخل ہوکر اسے مہمیز کرنے کی طاقت رکھتی ہے-

ظاہر ہے اندر داخل ہونے اور داخل ہوکر چھپ کر بیٹھ جانے کا مرحلہ نیو کی اینٹ بننے کا مرحلہ ہے-مذہب کی جمالیات (تصوف) بھی دیگر فنون کی جمالیات کی طرح نیو کی اینٹ ہے-اب تصوف کو آپ مذہب کی جمالیات کہیے یا مذہب کی شعریات وشریعت کے مطابق صفائے باطن،حسن نیت یا نیت، یہ بنیادی طور پر وہ قوت نافذہ ومتحرکہ، جوہر (Essence) ہے جو تفاعل کا سبب تو ہے مگر خود جس کی فعالیت ناقابل بیان ہے اور یہ جو مذہب کی جمالیات (تصوف) کے مظاہر ہیں یعنی رسوم (سماع، بیعت، صوفیانہ لباس، خانقاہی آداب) ان کی حیثیت اصل تصوف کی نہیں ہے-تصوف تو مذہبی افراد کی ظاہر پسندی اور رسم پسندی کے خلاف خود ایک نعرہ احتجاج تھا-اب اسے اگر دوبارہ رسوم میں قید کردیا گیا تو یہ جمالیات کی شعریات وضع کرنے کی مترادف ہے اور یہ ایک مضحکہ خیز عمل ہے-

(ب) یہ گفتگو کا ایک رخ ہوا جسے اصل تصوف پر کی جانے والی گفتگو کی تمہید کے طور پر پڑھا جانا چاہیے-

تفصیل میں گفتگو بہت دور تک جاسکتی ہے جس کا ابھی موقع نہیں ہے، پھر بھی اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ روح بھی اپنے اظہار کی طالب ہوتی ہے جیسے انسان کی بے ساختہ ہنسی یا درد کی انتہا پر گریہ کا وفور یہ دونوں بظاہر جسم کے کالبد سے برآمد ہوتے ہیں لیکن یہ بنیادی طور پر روح کی بے چینی یا اطمینان کا استعارہ ہیں، اسی طرح تصوف اگر مذہب کی روح ہے تب بھی تلاش حقیقت میں صوفی کا اضطراب اور مخلوق سے اس کی قلبی وابستگی ہی دراصل تصوف کی اصل حقیقت ہے-

گویا خدا اور بندے کے درمیانی روابط کا عرفان تصوف ہے اور تصوف چونکہ عطر مذہب ہے اس لیے یہاں فروعات سے درگزر کرتے ہوئے ایک ایسے طریقہ کار کو اپنانا خانقاہیت ہے جو اللہ رحمٰن و رحیم اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی منشا کو پہچانتے ہوئے اعتدال اور بین بین کے رویے کو سوسائٹی اور سماج میں متعارف کرائے جیسا کہ خود قرآن کریم میں بتایا گیا کہ ہم نے تمہیں ''امت وسط'' بنایا- ظاہر ہے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امت کے ''امت وسط'' ہونے کا واحد مطلب یہی ہے کہ آدمیوں کا یہ گروہ کسی بھی طرح انتہا پسند نہیں ہوسکتا-لہٰذا میری نظر میں خانقاہیت اور تصوف پسندی کی حقیقت اعتدال ہے-ہر معاملے میں اعتدال ہی منشائے الٰہی ہے، خواہ یہ معاملہ دین کا ہو یا دنیا کا-

سوال:-صوفی نظام تربیت کی عصری معنویت کیا ہے اور اسے ہم کیسے اختیار کرسکتے ہیں؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی:-صوفی نظام تربیت کی عصری معنویت یہ ہے کہ ا-سلفی گروپ نے پوری دنیا میں زور زبردستی کا جو بازار گرم کررکھا ہے اور اس کے ذریعہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام امن وسلامتی (اسلام) کو جس طرح بدنام کرنے کا مسلسل نمونہ پیش کیا جارہا ہے، اس کے مقابل آج کی تاریخ میں صرف اور صرف صوفی نظام تربیت ہی میں یہ طاقت موجود ہے کہ وہ اسلام کی مسخ شدہ تفہیم پیش کرنے والے اسلام دشمنوں کے مقابل اپنے تربیت کردہ افراد کی صف بندی کرسکے کیوں کہ خاص ہندوستان کے پس منظر میں کل ہند تنظیمیں چچا بھتیجے کے ٹکراؤ کے سبب Family welfare organisation بن چکی ہیں چونکہ ایسی تنظیموں کی بنیاد میں تصوف نہیں سیاست تھی- لہٰذا نیت کا خلوص ان کو حاصل نہ ہوسکا مگر صوفی نظام تربیت میں (الف) اعتدال (ب) اخلاص نیت اس بات کا ضامن ہے کہ یہ طریقہ کار صحیح نتائج برآمد کرسکتا ہے-۲-وہ جو سلفی ہونے کے منکر ہیں اور اپنی حنفیت کا بار بار اعلان کرتے ہیں ان میں بھی (الف) دین کے نام پر جاہلانہ غلو (ب) سیاست اور ۳-محض جماعتی شناخت کے نام پر کچھ فروعی چیزوں کا انکار اور کچھ فروعی چیزوں پر اصرار

نے ''ظاہر پسند گروہ'' کو امت کے مجموعی منظر نامے پر چھا جانے کی طاقت عطا کر دی ہے اور اس ظاہر پسندی نے روح مذہب کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں-

عصر حاضر صلاحیت، مسابقت، عقلیت اور مہارت کا دور ہے لہٰذا عصر حاضر کے پس منظر میں صوفی نظام تربیت کی اصل معنویت یہ ہے کہ وہ ''معتدل ذہنیت'' کے ذریعہ پر سکون دماغ تیار کرے جو ''تحرک پسند'' ہو اور کسی بھی طرح کے ردعمل کا شکار نہ ہو- Action ہو Reaction نہ ہو- ایسی ذہانت صرف صوفی نظام تربیت ہی پیدا کر سکتا ہے جہاں کسی کو برا نہیں کہا جاتا جہاں کسی کو برا نہیں سمجھا جاتا جہاں صرف اپنے کو ''منتخب العصر''، نہیں سمجھا جاتا-

اس نظام تربیت کو دوبارہ ''روشناس خلق'' کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کی طرح تصوف کی نشاۃ ثانیہ کی جائے- تربیتی مراکز قائم کیے جائیں، مختلف افکار و رجحانات والوں سے مکالمہ شروع کیا جائے، شاگرد (مرید) اور استاد (شیخ) کے درمیان نزدیکی اور روابط قائم ہوں- ان دنوں جو رسی پھینک کر مرید کیا جا رہا ہے، یہ مسئلے کا حل نہیں ہے، مسئلے کو اور الجھانا ہے-

سوال: -آپ کے فن پر تصوف کا غلبہ ہے اور بہت سارے افسانوں میں کربلا بھی موجود ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تصوف اور کربلا ہی وہ پاور ہاؤس ہیں جہاں سے آپ روشنی حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس سے منور کرتے ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی: -حضرت امام حسین میری سائکی کا بہت گہرا اور اٹوٹ حصہ ہیں- اماں نے بتایا تھا کہ مجھ سے پہلے ۶ بھائی بہن پیدا ہوئے مگر زندہ نہ بچ سکے- ایسے عالم حسرت و یاس میں ایام محرم آن پہنچے- نو یا دس محرم کو حضرت والد و مرشد کی نگاہ محلے کے تعزیہ پر پڑی اور بے ساختہ دل میں ایک دعا نے سر اٹھایا ''مولائے قدیر! حضرت امام کے صدقے میں ایک اولاد تو ایسی عطا کر دیجیے جو زندہ بچے-'' اور پھر اگلے سال بتاریخ دس محرم شب عاشور، میں پیدا ہوا، میرا نام حسین (حسین الحق) رکھا گیا-

یہ تو ہوا نجی معاملہ مگر تاریخ کے مطالعہ نے یہ بھی بتایا کہ کربلا آخری اسلامی جنگ ہے، آخر دفاعی جنگ ہے، اسلام کی تاریخ میں ظالم کے خلاف مظلوم کا آخری نعرہ احتجاج ہے- کربلا کے بعد مسلمانوں کی تاریخ استعمار پسندی، ملوکیت اور توسیع پسندی کی تاریخ ہے (بہ استثنائے حضرت عمر بن عبدالعزیز) ایسے میں کربلا کا روشن چراغ بننا ایک فطری عمل ہے-

رہی بات تصوف کی یہ مسئلہ وراثت، مطالعہ اور نظریہ تینوں سے جڑا ہوا ہے، میں آپ کے گزشتہ سوالات سے گزرتے ہوئے عرض کر چکا کہ ساتویں پشت سے شبیر کی مداحی میں، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد تصوف و صوفیہ کا Role model حضرت علی ہیں اور اس واسطے سے میں نے جب مذہب و تصوف کو سمجھنے کی کوشش کی تو احساس ہی نہیں یقین ہوا کہ اللہ رب العزت نے اسلام کی جو تفہیم صوفیہ کو عطا کی وہی اسلام کی اصل اور صحیح تفہیم ہے- ظاہر ہے کہ کربلا اور تصوف دونوں کو میرے لیے پاور ہاؤس بننا ہی تھا-

سوال: -آپ خالص صوفی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، پھر افسانہ نگاری و ناول نگاری کی طرف آپ کا رجحان کیسے ہوا؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی: -صوفی خانوادے سے تعلق رکھنے والا ادیب اگر شعر و افسانہ کی طرف متوجہ نہ ہو تو یہ حیرت کی بات ہوگی، قرآن کریم کی اظہاری تکنک (احسن القصص) کی تقلید میں مثنوی مولانا روم سے عہد حاضر تک بیش از بیش صوفی ادباء اور شعرا نے داستان، ناول، افسانہ اور شاعری ہی کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے، یہ ویسے ہی ہے جیسے ملفوظات صوفیہ میں آپ کو قصص و حکایات نظر آتے ہیں، عوام الناس کی نظر میں یہ کرامات ہیں اور خواص کی نظر میں حکایات ہیں اور دونوں صورتوں میں حق ہیں- میں نہ کرامات کا منکر ہوں نہ افسانہ و ناول کو ''جھوٹا قصہ'' ماننے کو تیار ہوں-

سوال: -کیا یہ سچ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کا عروج و زوال خانقاہوں کے عروج و زوال سے وابستہ ہے؟ اور فی زمانہ چوں کہ خانقاہیں زوال آمادہ ہیں اس لیے ہندستانی مسلمان بھی مائل بہ زوال ہیں؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی: -یہ بہت بڑا دعویٰ ہے- میں خود کو ایسا دعویٰ کرنے کا اہل

نہیں سمجھتا- میرا خیال ہے کہ قوموں کے عروج وزوال میں بہت سے عناصر کارفرما ہوتے ہیں اوران کارفرما عناصر میں تعلیم، معاش، ذہنی بلوغت اور تہذیبی تشخص کے سلسلے میں عصری تقاضوں کا احترام وعرفان کی حیثیت بنیادی ہے- خانقاہیں چوں کہ ان عناصر کو پیش نظر رکھ کر فعال رہتی تھیں اس لیے خانقاہوں پر کل بھی نگاہ ٹکی رہتی تھی اور آج بھی یہ احساس ہو رہا ہے کہ خانقاہوں کے زوال آمادہ ہونے کے سبب تعلیم، ذہنی بلوغت اور تہذیبی تشخص میں عصری اور علاقائی تقاضوں کے عرفان کا معاملہ تعطل کا شکار ہو رہا ہے، مگر معاش کا معاملہ خانقاہوں سے کم اور حکومتوں سے زیادہ متعلق رہا ہے-

سوال :- دریتیم: ماہرالقادری، لالہ زار: علامہ ارشدالقادری اور شمس نوید عثمانی نے اپنے اپنے عہد کے تقاضے کے مطابق ناولانہ اسلوب میں کتابیں لکھیں، آپ کو ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ اسلامی موضوعات و حکایات کو مابعد جدید طرز واسلوب کے قالب میں ڈھلنا چاہیے؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی:- جناب ماہر القادری، علامہ ارشد القادری اور شمس نوید عثمانی صاحبان نے دریتیم، لالہ زار اور اپنی دیگر تحریروں میں ناول اور افسانہ کا اسلوب اس لیے اختیار کیا کہ یہ لوگ ناول وافسانہ کو کم مایہ اور کم اوقات نہیں سمجھتے تھے، بلکہ انہیں افسانوی اسلوب کی طاقت کا احساس تھا اور ان تحریروں کا مابعد جدید طرز واسلوب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، دراصل مابعد جدید طرز واسلوب نام کی کوئی چیز کہیں موجود ہی نہیں ہے، اسالیب تو بس دو ہی ہیں ا- ترقی پسند اسلوب ۲- جدید اسلوب- ان دو کے ذیل میں تمام اسالیب آجاتے ہیں- مابعد جدیدیت تو ایک صورت حال ہے جو مغرب میں پیدا ہوئی مگر مشرق میں جس کے نام ونشان کی تلاش ہنوز جوئے شیر لانے کے برابر ہے- البتہ اس مابعد جدید صورت حال کے پیدا ہونے کے سبب کچھ تھیوریز سامنے آئیں جیسے ساختیات، قاری اساس تنقید، ردساختیات وغیرہ- مگر ان تمام تھیوریز کا بنیادی تعلق متن کی قرأت سے ہے، متن کی بناوٹ سے نہیں ہے- مابعد جدیدیت کے پاس کوئی ایک اسلوب ایسا نہیں ہے جسے وہ خاص مابعد جدید اسلوب کہہ سکے-

سوال :- فی الوقت آپ شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی کے عہدۂ صدارت پر فائز ہیں- آپ کے آنے کے بعد وہاں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور مستقبل کے کیا عزائم وارادے ہیں؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی:- (ا) اردو طلبہ کی تعداد میں اضافہ کی کوشش کی گئی (۲) شعبہ کے انفراسٹرکچر کو بہتر بنایا گیا (۳) لائبریری کی کیٹلاگنگ جاری ہے (۴) مختلف قسم کے سمینار اور مذاکروں کے ذریعہ شعبہ کو باہر کی اردو دنیا سے جوڑا گیا (۵) شعبہ کے ترجمان ''مشام'' کی اشاعت میں تسلسل پیدا کیا گیا-

مستقبل کے عزائم (ا) اردو جرنلزم کا ووکیشنل کورس (۲) اردو غزل گائیکی کا سرٹیفکیٹ کورس (۳) پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے لیے صلاحیت کی بنیاد پر وظائف کا انتظام

سوال :- عرصہ سے آپ یونیورسٹی میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں، اس مدت میں دینی اور عصری مدارس سے طلبہ آپ کے یہاں آتے ہوں گے، ان کے تعلق سے آپ کے تجربات کیسے رہے؟ یعنی نسبتاً کن میں بہتر کرنے کی صلاحیت موجود ہے؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی:- آج سے کم از کم دس سال پہلے عصری مدارس کے طلبا کا ذہن دینی مدارس کے طلبا کی بہ نسبت زیادہ کشادہ رہتا تھا مگر اب سب دھان بائیس پسیری ہے- دینی اور عصری دونوں طرح کے مدارس میں جہالت کا بول بالا ہے- اصل میں اردو سماج کا جو Creamy layer ہے وہ (ا) یا تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف جارہا ہے یا (۲) صوبے سے باہر کی یونیورسٹیوں کی طرف متوجہ ہو جارہا ہے (اور اس کی وجہ صوبے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں موجود اساتذہ کی جہالت اور حرام خوری ہے)

سوال :- جن روایات ودرایات کے آپ حامل ہیں انہیں آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے آپ کیا سعی کر رہے ہیں؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی:-

مجھ کو تو ہوس جشن چراغاں نہیں عاجزؔ
اک شمع ہی جل جائے سر شام، بہت ہے

جو روایات و درایات مجھ تک پہنچیں، خدا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آدمی کا جو تصور مجھے میسر ہوا، اسلام اور انسانیت کی جو تفہیم عطا ہوئی اسے میں نے اپنے اردگرد موجود آئندہ نسل تک پہنچا دیا ہے (غالبًا) میری آئندہ نسل میں میری اولاد، میرے اعزا، میرے اہل خاندان، میرے متوسلین، میرے اہل مذہب اور میرے اہل وطن سب شامل ہیں، ان میں کوئی مسٹر ہے کوئی مولانا، مگر تعلیم اور لباس میرا مسئلہ نہیں، دینی اور دنیوی تعلیم کی الگ الگ حد بندی کا میں قائل نہیں، روایات و درایات کا اصل مطلب ''منشائے مذہب وتہذیب'' کو سمجھ جانا ہے اور میں اپنی آئندہ نسل تک اسی منشا کو پہنچانے میں مصروف ہوں- یہاں ایک مشکل کا اظہار ضرور کرنا چاہتا ہوں- میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ بیٹیاں بیٹوں کی بہ نسبت Conservative زیادہ ہوتی ہیں مگر سچ بات یہ ہے کہ ان کے کلاسیکی ہونے کی وجہ سے بہت سی تہذیبی و مذہبی روایات کا تحفظ ہو جاتا ہے-

سوال:- قارئین جام نور کے لیے آپ کا کوئی پیغام یا مجلس ادارت کو کوئی مشورہ؟

پروفیسر سید حسین الحق چشتی:- قارئین سے میری گزارش ہے کہ ذہن کشادہ کیجیے، مکالمہ جاری رکھیے، توحید، رسالت اور معاد کے علاوہ بقیہ معاملات پر لچک اختیار کیجیے، مجرم کو ختم کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ جرم کو ختم کیجیے، صدق مقال اور اکل حلال اختیار کیجیے، بزرگوں کے عقیدت مند ضرور رہیے مگر عقیدت کو عقیدہ مت بنائیے- اردو رسائل خرید کر پڑھیے، جام نور جیسے کشادہ ذہن اور کشادہ قلب رسالے کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اپنے اپنے شہروں میں ''حلقہ جام نور'' قائم کیجیے اور اس حلقے کی ماہانہ نشستوں میں لوگوں کو بلاتفریق مذہب وملت مدعو کیجیے اور جام نور کی بہ آواز بلند قرأت کا انتظام کیجیے- اگر ممکن ہو تو اس پر گفتگو کیجیے اور اس گفتگو کو مشتہر کیجیے- مجلس ادارت کے لیے بس ایک پیغام.....ع

نوا را شیر تر می کن چو ذوق نغمہ کم یابی

□□□

(شمارہ جون ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی

رکن: مجلس شوریٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

''شکیل'' لفظ ہی ایسا ہے جو زبان پر آتے ہی خیال کے پردے پر ایک صاف و شفاف نفیس و نازک اور دل آویز تصویر کا عکس چھوڑ جاتا ہے اور چند ثانیے کے لیے طبیعت کیف و سرور کی خوش گوار لذتوں میں ڈوب جاتی ہے اور جب ہم ''ڈاکٹر شکیل'' کہتے ہیں تو نگہ تصور کے سامنے ایک ایسی خوب صورت قامت آ کھڑی ہوتی ہے جو اپنے ادبی ذوق، علمی مزاج، شاعرانہ وجاہت، سلجھی فکر، پاکیزہ تخیل، لطیف مزاح اور تنظیمی فعالیت کے سبب بار بار دامن دل کھینچتی اور ذہن ودماغ پر چھاتی چلی جاتی ہے- الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے ممتاز فاضل اور اس کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن، ایک خوش فکر شاعر، ایک ذی علم ادیب اور یونانی میڈیسن کا ایک تجربہ کار ڈاکٹر، یہ مختصر تعارف ہے مولانا ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی گھوسوی کا - ابتدائی تعلیم مدرسہ شمس العلوم گھوسی اور متوسطات مدرسہ فضل رحمانیہ پچپڑوا سے حاصل کرنے کے بعد الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے اول پوزیشن کے ساتھ علوم عقلیہ ونقلیہ میں سند فضیلت حاصل کی اور پھر یونانی میڈیکل کالج الہ آباد سے پہلی بار چار مضامین میں امتیازی نمبروں کے ساتھ طب یونانی میں کامیابی حاصل کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا، بعد ازاں گھوسی میں اپنا مطب کھولا جو ہنوز قائم ہے- ڈاکٹر صاحب کی شاعری بڑی معیاری ہوتی ہے- ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی کی طرح موصوف کی کم نویسی بھی معروف ہے، جس کی وجہ ان کی ذاتی مصروفیات ہیں، لیکن جب بھی لکھتے ہیں، ایک عرصے تک اپنی یاد چھوڑ جاتے ہیں- موصوف کا پیش نظر انٹرویو بھی کسی معیاری ادبی مضمون سے کسی طرح کم نہیں ہے-

سوال (۱): -ایک علمی اورادبی شخصیت طبی دنیا میں آکر کتنی مطمئن ہے؟

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی: -علم وادب، تحقیق وتنقید اور شعر وشاعری سے تعلق میرا اپنا فطری ذوق ہے اور طبی دنیا سے تعلق خدمت خلق اور کسب معاش کا باوقار ذریعہ-طبی دنیا سے متعلق ہوتے ہوئے بھی مسلسل علمی وادبی خدمات انجام دیتا رہتا ہوں، میرے احباب کو ہمیشہ اس بات پر حیرت رہتی ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود میں کس طرح اور کس وقت علمی وادبی نگارشات، مشاہیر علم وادب سے مراسلات وتبادلۂ خیالات کا موقع نکال لیتا ہوں- بات دراصل یہ ہے کہ جب کسی شخص کا کسی فن کی طرف طبعی رجحان اور فطری ذوق وشوق ہوتا ہے تو اس کے اکتساب واظہار کے مواقع ہزار موانع کے باوجود نکال ہی لیتا ہے-

طبی دنیا سے وابستہ ہونے کا ایک بہت بڑا اور بابرکت فائدہ میرے لیے یہ بھی ہے کہ مجھے حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے (قادری منزل گھوسی میں قیام کے دوران) علاج کا شرف بھی حاصل ہوا اور حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے علاج کا تو بارہا شرف حاصل رہا، بلکہ آخری وقت تک معالج میں ہی تھا-حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کو میرے علاج پر بڑا اعتماد رہا کرتا تھا، علالت کے دوران ایک بار حسان الہند حضرت بیکل اتساہی نے ازراہ عقیدت ومحبت حضرت سے کسی اچھے ہاسپٹل میں علاج کی درخواست کی تو حضرت نے فرمایا کہ ''علاج ڈاکٹر شکیل صاحب ہی کا ہوگا، مجھے ان پر پورا اعتماد ہے اور ان کے علاج سے فائدہ بھی ہے، کسی دوسری جگہ بڑے بڑے ڈاکٹر تو مل جائیں گے، لیکن ڈاکٹر شکیل نہیں ملیں گے-''

ان دونوں بلند پایہ، خدا رسیدہ بزرگوں نے مجھے ہمیشہ اپنی مخصوص دعاؤں، نیک خواہشات اور توصیفی کلمات سے نوازا اور ان کے فیوض وبرکات کے واضح اثرات آج بھی پورے طور پر محسوس کر رہا ہوں- بایں ہمہ مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اطمینان وسکون کی وہ کیفیت جو ادبی وعلمی تخلیقات ونگارشات کے لیے درکار ہے، طبی دنیا میں آنے کے بعد میسر نہیں-

سوال (۲): -شعر وادب کی دنیا مختلف ادبی تحریکوں اور تھپیڑوں کے بعد کس منزل میں ہے؟

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی: -شعر وادب کی دنیا مختلف ادوار میں مختلف تحریکوں سے وابستہ رہی، کبھی ادب برائے ادب کا نظریہ سامنے آیا، کبھی ادب برائے حیات کا، کبھی ترقی پسند تحریک، کبھی جدیدیت کبھی مابعد جدیدیت کے نظریات سامنے آئے اور ان نظریات کے علمبرداروں اور حامیوں پر کبھی کبھی انتہا پسندی اور جدلیاتی کیفیت بھی طاری ہوئی-

ادب برائے ادب زیادہ تر لفظوں کی تراش وخراش، لسانی تزئین وترصیع اور رومانی جذبات وتخیلات کے اظہار کا ذریعہ رہا، جبکہ ادب برائے حیات میں حیات وکائنات اور ماحول ومعاشرہ کے جملہ مقتضیات کی بھرپور عکاسی کی گئی-

ترقی پسند ادب نے مارکسی والحادی نظریات کو عام کیا، جدیدیت نے خارجی دنیا سے کٹ کر دروں بینی وخود رفتگی کے نظریے کو فروغ دیا، اور مابعد جدیدیت نے ادب کو داخلیت ودروں بینی کی قید سے آزاد کیا-

مختلف ادبی تحریکوں سے بہر حال شعر وادب کو فائدہ پہنچا کہ وہ پامال وفرسودہ مضامین کی تکرار، گل وبلبل اور کاکل ورخسار کے حصار سے نکل کر کائنات، سماج اور ماحول ومعاشرہ کا عکاس بن گیا اور زبان وبیان کو نئی فضا اور نئی جہت عطا کی-

شعر وشاعری کی دنیا میں بھی نئے نئے تجربات کیے گئے، مقفّٰی ومردف وغیر مردف باوزن شاعری تو رائج ہی تھی، آزاد نظم نگاری اور معری شاعری بھی وجود میں آئی، مختلف اصناف سخن کے فارم اور ہیئت میں بھی تبدیلیاں کی گئیں- ماضی کی ان تمام ادبی وشعری تحریکات ونظریات کے عروج وزوال اور رد وقبول کے بعد اب حال کا ادب ساری قید وبند کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی خاص تحریک ونظریہ کا پابند نہ رہ کر حیات وکائنات کے سارے مسائل، خارجی وداخلی عوامل اور فطری جذبات واحساسات کے اظہار کا معتبر ذریعہ بن گیا ہے-

سوال (۳): -برصغیر کی عظیم دانش گاہ جامعہ اشرفیہ میں آپ کے دوران طالب علمی، علمی وادبی ماحول کیسا تھا؟

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی:- میری طالب علمی کے دوران جامعہ اشرفیہ کا علمی وادبی ماحول بڑا ہی معیاری اور دلچسپ تھا، درسیات کے علاوہ طلبہ کو شعر وادب سے بھی کافی دلچسپی تھی، مشقی جلسوں کے علاوہ بزم شعر وسخن کا بھی انعقاد ہوا کرتا تھا، جس میں اپنے طرحی وغیر طرحی کلام کے ساتھ طلبہ بڑے ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے، لفظوں کی صحت اور تذکیر وتانیث کی تحقیق ہوتی تھی، ان کے غلط استعمال پر سخت گرفت ہوتی تھی، کسی لفظ کی صحت وعدم صحت میں اختلاف ہونے پر مستند مشاہیر علم وادب سے رجوع کیا جاتا تھا- گفتگو طویل ہوگی، مگر چند امثال ونظائر ضرور پیش کرنا چاہوں گا، جو افادیت سے خالی نہیں-

لفظ ''حُدیٰ'' کے تعلق سے ایک بحث چھڑ گئی، میرا اپنا نقطۂ نظر یہ تھا کہ از روئے لغات تو صحیح لفظ ''حدیٰ'' الف مقصورہ کے ساتھ ہے لیکن موسَم بجائے موسِم، تمیز بجائے تمییز، خضَر بجائے خضِر، کافَر بجائے کافِر کی طرح یہ لفظ بھی متصرف فیہ ہے-

فخر مشرق علامہ شفیق جونپوری جو مستند شاعر تھے اور والد مرحوم کے گہرے دوستانہ مراسم کے باعث اکثر وبیشتر گھر پر آیا کرتے تھے، ان کی زبان سے ان کی نعت کا مصرع بارہا سنا-

حُدِی خوانوں سے طیبہ کا بیاباں گونجتا ہوگا

وہ حُدیٰ کو حُدِیْ ہی پڑھتے تھے، ان کے علاوہ بھی بیشتر اہل علم حضرات سے یہی تلفظ سنا تھا، مگر اس لفظ کی تحقیق کے لیے میں نے علامہ نیاز فتح پوری کو جو اس وقت سب سے بڑے نقاد ادیب اور محقق مانے جاتے تھے، خط لکھا، خط کے جواب میں نیاز فتح پوری صاحب نے لکھا کہ ''حُدیٰ کے سلسلہ میں آپ نے جن لغات کا حوالہ دیا ہے، انہیں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل لفظ حُدا ہے اور جس طرح موسیٰ کو موسا پڑھا جاتا ہے، اسی طرح سے حدی کو حُدا پڑھا جائے گا، فارسی والوں نے موسیٰ کو موسِی بھی نظم کیا ہے، لیکن صحیح تلفظ ''موسا'' ہی ہے- اردو میں یقیناً حُدا پڑھنا چاہیے، حُدِی پڑھنا درست نہیں''-

علامہ نیاز فتح پوری کے اس جواب کے کچھ دنوں بعد استاذ الشعراء جناب ذوقؔ دہلوی کی ایک غزل نظر سے گزری، جس میں انہوں نے خوشی چلے، ابھی چلے، وغیرہ کے قوافی میں حُدِی چلے کا استعمال کیا ہے، ملاحظہ ہو-

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے
لیلیٰ کا ناقہ دشت میں تاثیر عشق سے
سن کر فغان قیس، بجائے حدی چلے

اس سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ بلاشبہ متصرف فیہ ہے اور اردو میں حُدِی پڑھنا غلط نہیں-

اسی طرح ایک بار سنہری اور سنہرا کے تعلق سے بحث چھڑی کہ سنہری موقع، سنہری اصول کہنا درست ہے یا نہیں؟ بحث طول پکڑ گئی، میں نے علامہ نیاز فتح پوری سے رجوع کیا اور لکھا کہ موصوف صفت میں مطابقت ضروری ہے، موصوف اگر مذکر ہے، مثلاً موقع، اصول تو سنہرا لکھنا چاہیے، یعنی سنہرا موقع، سنہرا اصول اور لفظ (موصوف) مؤنث ہو تو سنہری، مثلاً سنہری جلد، سنہری رنگت وغیرہ- نیاز صاحب نے جواب دیا کہ سنہری اصول، سنہری موقع لکھنا غلط ہے، سنہرا جائز- لیکن مجھے یاد آتا ہے کہ سنہرا اور سنہری کے سلسلہ میں روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میں خاصی بحثیں چلی تھیں، غالباً اہل لکھنؤ سنہری کو مستقل صفت کا ایک لفظ قرار دے کر سنہری ہی لکھتے ہیں، موصوف خواہ مذکر ہو یا مؤنث مثلاً سنہری موقع، سنہری اصول، سنہری رنگت-

فرہنگ آصفیہ میں سنہرا اور سنہری دونوں درج ہے، سنہرا کے ضمن میں آتش اور رشک کا ایک ایک شعر درج ہے-

یہ طلائی رنگ جسم یار گہرا ہو گیا
جو انگرکھا چھو گیا تن سے سنہرا ہو گیا
(رشک)

مے کی تکلیف نہ کیونکر کریں ان آنکھوں کے جام
موئے سر، ابر سیہ، برق سنہرا تعویذ
(آتش)

لیکن سنہری کے ذیل میں رنگین کا ایک شعر

دانت خاصے دھڑی طلسم جمی

سنہری لب تس پہ بول چال پری

(رنگین)

یہاں لب کے لیے جو مذکر ہے، سنہری استعمال کیا گیا ہے، ناسخؔ کے دو شعر بھی منقول ہیں:

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا

آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو

یہاں سنہری انگیا کی صفت ہے جو مؤنث ہے، لیکن ناسخؔ ہی کے دوسرے شعر میں سنہری مذکر لفظ رنگ کی صفت کے طور پر مذکور ہے:

وصف جب میں نے کیے تیرے سنہری رنگ کے

خود بخود ہر صفحۂ دیواں مذہّب ہو گیا

ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کروں، مولوی قمر الزماں (مفکر اسلام علامہ قمر الزماں اعظمی، جنرل سکریٹری، ورلڈ اسلامک مشن، انگلینڈ) اشرفیہ میں، مین گیٹ کے سامنے پوربی جانب جہاں دیوار گھڑی آویزاں رہتی تھی، اس کے پاس ایک ستون تھا، وہیں پر ایک تخت بچھا رہتا تھا، جس پر عموماً مولانا علی احمد صاحب مرحوم بیٹھ کر طلبہ کی نگرانی فرمایا کرتے تھے، اسی تخت پر بیٹھ کر گردوپیش سے بے نیاز ہو کر فکر سخن میں محو تھے، میں نے دور سے دیکھ کر ان کی کیفیت بھانپ لی تھی، قریب جا کر ستون کی آڑ سے میں نے ان کے لکھے ہوئے اشعار پڑھ کر ذہن میں محفوظ کر لیے تھے، میں نے اپنے خاص احباب یعنی مولانا سید مدنی میاں (شیخ الاسلام پیر طریقت حضرت سید مدنی میاں صاحب قبلہ اختر کچھوچھوی) اور مولانا محمد نعمان خاں صاحب اخترؔ دیوگامی (سابق پرنسپل الجامعۃ الاسلامیہ رونا ہی، فیض آباد) سے اس واقعہ کا ذکر کیا، آپس میں یہ طے ہوا کہ آج شام کو بالائی چھت پر حسب معمول جب ہم لوگ جمع ہوں گے تو ایک دوسرے سے تازہ اشعار سنانے کی فرمائش کریں گے، آپ مولوی قمر الزماں کے وہی اشعار سنائیں گے، جو آج انہوں نے کہے ہیں، پھر دیکھیے کتنا مزہ آتا ہے- چنانچہ

پروگرام کے مطابق ہم لوگ چھت پر اکٹھا ہوئے تو اشعار سنانے کی فرمائش کی گئی، پہلے سید مدنی میاں نے اپنے کچھ اشعار سنائے، پھر مولوی نعمان صاحب نے اور جب میری باری آئی تو میں نے خصوصیت سے مولوی قمر الزماں صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں کے کہے ہوئے تازہ اشعار سنائے تو اس وقت ان کی کیفیت عجیب وغریب ہوگئی - حیرت و استعجاب کے عالم میں دیر تک ڈوبے رہے، ان کی سمجھ ہی میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا- بہت چھیڑنے اور پریشان کرنے کے بعد ان کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا گیا- اور اشعار یاد نہیں رہ گئے، صرف ایک مصرع یاد ہے، ملاحظہ ہو:

مونگ دشمن کی چھاتی پہ دلتے رہے

ایک محاورے کو کس خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے، سبحان اللہ!

ایک بار نظیریؔ کا ایک شعر موضوع بحث رہا، میں نے اس شعر کا صحیح مطلب علامہ نیاز فتح پوری سے دریافت کیا-

نظیری کا شعر ہے:

گل ز بہر اشک لولوئے ورنگ کا ہیم

در بلوریں حقہ دارد کہر بائے سودہ را

نیاز صاحب نے مطلب بیان کرنے کی بجائے یہ لکھا کہ ”اس شعر کے قبل وبعد کے دو دو شعر لکھ کر بھیج دیجیے- نیاز صاحب کے اس جواب کے بعد میں نے سوچا کہ نظری کی غزل کا یہ ایک شعر ہے- (اور غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے اور مستقل اپنا ایک معنی ومفہوم رکھتا ہے) نظم کا نہیں، قطعہ بند بھی نہیں کہ قبل وبعد کے دو دو شعر لکھ کر بھیج دینے سے سیاق وسباق کے پیش نظر مفہوم کا تعین کیا جاسکے- میں نے نیاز صاحب کے حکم کی تعمیل نہ کرتے ہوئے خود اپنے طور پر اس شعر کا مطلب بیان کر کے احباب کو مطمئن کر دیا- میں نے پہلے شعر میں مستعملہ الفاظ کی تشریح کی تا کہ تفہیم شعر آسان ہو جائے-

تشریح الفاظ:

گل: منجملہ دیگر معانی انگارا، رنگ سرخ

لولو: آبدار موتی

بلوریں : بلور ایک چمک دار معدنی جوہر، بہ طور صفت صاف شفاف چمکدار

حقہ : ڈبہ، جواہرات رکھنے کا ظرف

کہربا: (مخفف کاہ ربا) گھاس اٹھانے والا گوند، ایک قسم کا زرد گوند

جس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اسے کپڑے یا چمڑے پر رگڑ کر گھاس کے تنکے کے مقابل کریں تو مقناطیس کی طرح اسے اٹھا لیتا ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہوا کہ غم عشق میں میرے آنسو (اشک خوں) تو گرم، سرخ، موتی کی طرح چمکدار ہیں، مگر میرا جسم گھاس کی مانند کمزور ناتواں اور زرد ہو چکا ہے، لیکن پھر بھی معشوق کی کشش اور عشق و محبت کی شیفتگی و وارفتگی سے خود کو آزاد نہیں کر پا رہا ہوں، گویا معشوق کا سراپا ایک صاف شفاف خوبصورت ظرف ہے، جو اپنے اندر پسا ہوا کہربا رکھتا ہے اور کہربا کی خاصیت یہ ہے کہ وہ گھاس کے تنکے کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ یعنی معشوق اپنے اندر اس قدر حسن، جاذبیت اور کشش رکھتا ہے کہ ہزار خوں نابہ فشانی اور کلفت واذیت کے باوجود اس سے دوری اور بےتعلقی ممکن نہیں۔ یا پھر دوسرے مصرعے سے معشوق کی روشن وتابناک، خوبصورت و پرکشش اور سحر کار آنکھ مراد ہو۔

ایک بار مولانا رحیم اللہ صاحب بلیاوی مرحوم نے جو مولانا عبداللہ صاحب (موجود شیخ التفسیر) کے ہم سبق تھے اور اشرفیہ کے انتہائی ذی استعداد اور مایۂ ناز طالب علم تھے، دوران گفتگو گاجر کو مؤنث استعمال کیا، چونکہ ہم لوگوں کے یہاں اس کو عام طور پر مذکر استعمال کرتے ہیں، اس لیے اس کی تذکیر وتانیث میں شبہ ہوا۔ میں نے حضرت ظفر ادیبی صاحب سے دریافت کیا کہ گاجر مؤنث ہے یا مذکر؟ تو ادیبی صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ گاجر ہے تو مؤنث لیکن مولانا رحیم اللہ کا فرمانا مستند نہیں، وہ بہرحال بلیاوی مولانا ہیں بلیا کے تو اچھے سے اچھے شاعر اور ادیب تذکیر وتانیث میں اکثر وبیشتر غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور عجب اتفاق کہ انہیں دنوں میں نے مشہور ومعروف شاعر حضرت نشور واحدی (جو بلیاوی تھے) کے پاس اصلاح کے لیے اپنی چند غزلیں بھیجی تھیں، پہلی ہی غزل کا مطلع تھا۔

دیکھا جو ان کا نقش قدم سر جھکا لیا
آنکھوں سے بڑھ کے خاک کف پا لگا لیا

نشور صاحب نے اس کو علیٰ حالہ باقی رکھا، کوئی اصلاح نہ فرمائی، ادیبی صاحب نے غزل پر اصلاح دیکھنے کے بعد فرمایا کہ میں آپ سے نہیں کہتا تھا کہ آپ اپنا کلام ادیب مالیگانوی کو دکھائیے، ان کو زبان و بیان اور فن پر بڑی قدرت ہے، واضح رہے کہ ظفر ادیبی صاحب ادیب مالیگانوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے اور اسی نسبت سے خود کو ظفر ادیبی لکھتے تھے۔ نشور صاحب بہرحال بلیاوی ہیں، دیکھیے انہوں نے آپ کے مطلع پر کوئی اصلاح نہ دی، جبکہ اس میں زبان کی واضح غلطی موجود ہے، یعنی خاک مؤنث ہے، اس لیے ''لگا لیا'' درست نہیں۔ لگا لی چاہیے۔

اور اسے بھی حسن اتفاق یا سوء اتفاق کہیے کہ ٹھیک انہیں دنوں ماہنامہ آج کل میں نشور واحدی صاحب کی ایک انتہائی مرصع اور خوبصورت غزل شائع ہوئی۔

پرتو محبت سے تاب زن سا ہوتا ہے
زندگی کا ہر لمحہ اک کرن سا ہوتا ہے
بزم غم معطر ہے اپنی چشم گریاں سے
سلسلہ ان اشکوں کا یاسمن سا ہوتا ہے

اس میں ایک شعر یہ تھا

ایک جان سے گزرا، مرنے والے سو آئے
عاشقی و جانبازی اک چلن سا ہو تا ہے

ظاہر ہے مبتدا اور خبر میں مطابقت ضروری ہے، عاشقی و جانبازی مؤنث ہے، اس کی خبر ''سا ہوتا ہے'' کیونکر درست ہے، بلاشبہ نشور صاحب کو چلن کی تذکیر سے مغالطہ ہوا۔

ایک بار علامہ اقبال کے کلام میں تذکیر وتانیث پر بحث ہونے لگی، ایک دوست نے اعتراض کیا کہ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

متاع کو مذکر استعمال کیا ہے، جو غلط ہے، متاع مؤنث ہے میں نے جواباً عرض کیا کہ متاع مختلف فیہ ہے، قواعد اردو میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس کی صراحت کی ہے-علامہ اقبال نے متاع کو مؤنث بھی استعمال کیا ہے

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافرادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

ہاں! اشارہ پاتے ہی زاہد نے توڑ دی پرہیز

یہاں انہوں نے پرہیز کو مؤنث استعمال کیا ہے جب کہ پرہیز متفقہ طور پر مذکر ہے، اس کی توجیہ اس کے سوا اور کیا کی جا سکتی ہے کہ یہ تسامح علاقائی زبان کے زیر اثر ہوا-

ایک بار لغتۃً لغتاً، حقیقۃً، حقیقتاً، وقتاً، کلیتاً کے صحیح املا کے تعلق سے بحث چھڑی، میں نے نیاز فتح پوری سے اس کے املا کی صحت دریافت کی، انہوں نے جواباً تحریر فرمایا کہ ''میری رائے میں ان میں صرف رسم کتابت کا فرق ہے، جو چنداں قابل لحاظ نہیں''-

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں صرف رسم کتابت کا ہی فرق نہیں، بلکہ ایک مسلمہ ضابطے کی خلاف ورزی بھی ہے-

دراصل تنوین کے سلسلہ میں قاعدہ یہ ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں تائے مدورہ یا تائے موقوفہ لکھی جاتی ہے، ان میں ''ۃ'' کے بعد الف کا اضافہ نہیں کیا جاتا، بلکہ اسی ۃ پر دو زبر لگا دیئے جاتے ہیں، جیسے کلیۃً، ساعۃً، حکمۃً اور جن لفظوں کے آخر میں تائے دراز یا تائے اصلی لکھی جاتی ہے-ان میں ''ت'' کے بعد الف کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے وقتاً-

لیکن اب انجمن ترقی اردو بورڈ کی اصلاح رسم خط کمیٹی نے تجویز کیا ہے کہ عربی کی تائے مدورہ کو اردو میں ہمیشہ تائے اصلی ''ت'' لکھا جائے اور تنوین کے لیے ''ت'' کے بعد الف کا اضافہ کر کے اس پر دو زبر لگا دیا جائے، جیسے عادتاً، نسبتاً، رعایتاً، کلیتاً وغیرہ-اسی طرح اس کمیٹی نے یہ بھی طے کیا ہے کہ عربی میں جو لفظ الف مقصورہ سے لکھے جاتے ہیں، اردو میں الف سے لکھے جائیں، یعنی بجائے اولیٰ، اعلیٰ، عیسیٰ، موسیٰ، مصطفےٰ، ادنا، اعلا، عیسا، موسا،

مصطفا لکھا جائے، فارسی میں بھی اب یہ رجحان غالب ہے کہ اس قسم کے سارے الفاظ بجائے الف مقصورہ بصورت یا کو الف ہی سے لکھنا چاہیے-

غرض کہ اس طرح کی بے شمار علمی و ادبی بحثیں ہوا کرتی تھیں، کہاں تک ذکر کروں، اس کے لیے ایک دفتر بھی ناکافی ہے-

سوال:-حافظ ملت کے دور کا اشرفیہ اور آج کے اشرفیہ میں کیا فرق ہے اور اسے آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی:-حافظ ملت کے دور کا اشرفیہ تعلیمی و تعمیری اعتبار سے اپنے دور کی دیگر درسگاہوں سے ممتاز و منفرد تھا، حافظ ملت نے مروجہ روایتی نصاب تعلیم کی صالح قدروں کو بحال رکھتے ہوئے جدید عصری علوم وفنون کا انتظام بھی فرمایا تھا، دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی، انگریزی، ہندی زبانوں کے سیکھنے سکھانے کا نظم بھی فرمایا تھا، ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور طبیہ کالج کے قیام کا منصوبہ بھی بنایا تھا-

عصری تقاضوں کے تحت نصاب مرتب کرنا اور ایک مدرسہ کو جامعہ کا روپ دینا آسان نہ تھا قدم قدم پر مزاحمتوں کا سامنا تھا، لیکن وہ مرد مجاہد بفضلہ تعالیٰ خلوص نیت اور عزم محکم کے سہارے ساری رکاوٹوں اور دشواریوں کو عبور کرتا ہوا، قدم بڑھاتا رہا، اور بالآخر منزل مقصود تک فاتحانہ شان کے ساتھ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، آفریں باد بریں ہمت مردانہ او-مقررین وخطبا تو ہماری جماعت میں بہت تھے، لیکن انشا پرداز صحافی اور قلم کار کم تھے، اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے حافظ ملت نے ماہنامہ اشرفیہ کا اجرا فرمایا اور باضابطہ نشر و اشاعت کا ایک مستقل شعبہ قائم فرمایا، جس کے خوب صورت اور قابل قدر نتائج آج دنیا کے سامنے ہیں-آج مصباحیوں میں نہ خطبا کی کمی ہے، نہ قلم کار انشا پرداز وصحافی کی-

اِس دور کا اشرفیہ حافظ ملت کے خوابوں اور منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور ان کو ترقی دینے میں ہمہ وقت مصروف ہے، جس درخت کو حافظ ملت نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا، آج وہ ایک تناور اور ثمر آور درخت بن چکا ہے اور دنیا اس سے حسب توفیق پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے-

سوال :- آپ جامعہ اشرفیہ کے رکن مجلس شوریٰ ہونے کی حیثیت سے اسے کس مقام پر دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں؟

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی :- الجامعۃ الاشرفیہ کو عروج وارتقا کی اعلیٰ ترین منزل پر دیکھنے کا آرزومند ہوں- ہم تمام ارکان جامعہ اشرفیہ کو روز بروز عروج وارتقا کی طرف لے جانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں، ابھی منزل مقصود تک پہنچنے پر کچھ وقت درکار ہے، ابھی ہمیں عصری تقاضوں کے تحت مروجہ نصاب تعلیم میں ترمیم وتنسیخ کر کے زیادہ مؤثر اور سودمند بنانا ہے-

تخصص فی الفقہ کا شعبہ تو عرصہ سے امتیازی شان کے ساتھ چل رہا ہے، اختصاص فی الادب العربی کے دوسالہ کورس کی تجویز مجلس شوریٰ میں پاس ہو چکی ہے، بہت جلد اس کا آغاز ہونے والا ہے، لائق وفائق اور مناسب اساتذہ کی تلاش جاری ہے، درجۂ فضیلت تک عربی وانگریزی دونوں زبانوں کو بیک وقت پڑھنے لکھنے بولنے کا باضابطہ اہتمام کیا جا رہا ہے، عربی وانگریزی زبان وادب کی تکمیل کے بعد باقاعدہ طلبہ کو ان کے سرٹیفکیٹ دیے جائیں گے، تا کہ حسب ضرورت ان کے ذریعہ وہ اپنے آئندہ علمی وعملی سفر کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکیں- کمپیوٹر کی باضابطہ ٹریننگ دی جا رہی ہے، طبیہ کالج کے قیام کے لیے قانونی کارروائیاں کی جاری ہیں، طلبہ کے ذہنی افق کو وسعت دینے کے لیے توسیعی خطبات کا اہتمام کیا جا رہا، جن میں بالخصوص مندرجہ ذیل موضوعات پر طلبہ کو معلومات فراہم کرنے کی سعی بلیغ کی جائے گی-

(۱) منکرین اسلام کے اعتراضات کے جوابات

(الف) اسلامی عقائد پر (ب) اسلامی احکام ومسائل پر (ج) سیرت رسول پر (د) فقہا ومحدثین پر (ہ) اسلامی مؤرخین پر

(۲) نو پید مسائل کے حل (۳) تاریخ علوم وفنون (۴) علوم جدیدہ کی بنیادی معلومات- اور بھی اس طرح کے دیگر اہم موضوعات پر

شعبۂ تقابل ادیان کا انتہائی اہم اور جدید شعبہ بحسن وخوبی اپنے فرائض انجام دے رہا ہے، مجلس شرعی کے زیر اہتمام تیرہواں فقہی سمینار اختتام پذیر ہو چکا ہے، جس میں جدید

مسائل پر پوری فقہی بصیرت کے ساتھ جماعت اہل سنت کے اکابر علما وفقہا بحث ومباحثہ کر کے کوئی فیصلہ صادر فرماتے ہیں، اختلاف کی صورت میں مسائل فیصل بورڈ کے پاس بھیج دیے جاتے ہیں اور فیصل بورڈ پورے غور وخوض اور کمال ژرف نگاہی کے ساتھ تمام جزئیات شرعی نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، حکم شرع بیان کر دیتا ہے اور وہ فیصلہ متفق علیہ اور حرف آخر متصور ہوتا ہے- بحمدہ تعالیٰ فیصل بورڈ کے بھی چار اجلاس منعقد ہو چکے ہیں اور فیصلے بھی صادر کیے جا چکے ہیں، چودہواں فقہی سمینار ۱۱/۱۲/ مارچ ۲۰۰۷ء کو منعقد ہونے جا رہا ہے-

جامعہ اشرفیہ کے زیر اہتمام تنظیم ابنائے اشرفیہ کی تشکیل ہو چکی ہے، تنظیم کا بنیادی نشانہ تو یقیناً الجامعۃ الاشرفیہ کا فروغ وارتقا اور ابنائے اشرفیہ کو باہم مربوط اور متحد رکھنا ہے، لیکن اسی کے ساتھ دین ودانش کا فروغ، ملی وجماعتی مسائل کا حل اور عصر حاضر کے چیلنجز کا مقابلہ کرنا بھی اولین ترجیحات میں شامل ہے- تنظیم کی جانب سے دو روزہ بین الاقوامی میڈیا سمینار کے عنوان سے مورخہ ۱۸/۱۹/ مئی ۲۰۰۶ء کو دو روزہ کامیاب سمینار منعقد ہو چکا ہے، جس میں قابل ذکر ارباب علم ودانش، مختلف جامعات کے بالغ نظر اساتذہ اور نامور قلم کار وصحافی حضرات نے شرکت فرمائی اور مذکورہ موضوع پر اپنے گراں قدر مقالات پیش فرمائے، مقالات پر بحث ونظر اور سوالات وجوابات کا سلسلہ بھی رہا-

جامعہ کی موجودہ مجلس شوریٰ اور مجلس منتظمہ کے لیے یہ بات بڑی خوش آئند اور طمانیت بخش ہے کہ اس کے سربراہ اعلیٰ حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب قبلہ اپنے تمام تر آئینی اختیارات کے باوجود کسی پر اپنی خواہش اور ذاتی رائے نہیں مسلط فرماتے، بلکہ کثرت رائے کا احترام کرتے ہوئے جو تجویزیں پاس ہوتی ہیں، ان پر بہ طیب خاطر اپنی مہر تصدیق ثبت فرما دیتے ہیں- اگر جامعہ اشرفیہ کے تعلیمی وانتظامی امور میں کسی طرح کی خامی اور کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کو مثبت انداز میں دور کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جاتی ہے-

سوال :- تعلیم عام ہونے کے ساتھ ہر جگہ علم کم ہونے کی رفتار جو بڑھتی جا رہی ہے، اس کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں، خصوصاً دینی مدارس کے تناظر میں-

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی :- بلاشبہ یہ افسوس ناک اور تشویش ناک صورت حال ہے، تعلیم

بڑھنے اور علم کم ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ پہلے اساتذہ خلوص ،محنت اور لگن سے
بڑھاتے تھے اور طلبہ ذوق وشوق اور محنت سے پڑھتے تھے، پیشہ ورانہ انداز نہ ہوکر خدمت کا
جذبہ کارفرما ہوتا تھا-تعلیم تجارت نہ تھی، آج زاویۂ نگاہ بدل چکا ہے، بیشتر اساتذہ وطلبہ محض
خانہ پری کرتے ہیں-

منتظمین ادارہ بھی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ،محض کنبہ پروری
،اقربا نوازی اور جلب منفعت کے جذبے سے اساتذہ کی تقرری کرتے ہیں،طلبہ کا داخلہ بھی
نذرانوں اور سفارشوں کا مرہون ہوتا ہے- سوچیے! جب اساتذہ ہی نا قابل وغیر ذی
استعداد ہوں گے تو پڑھائیں گے کیا؟ طلبہ بے ذوق، نا اہل اور تساہل پسند ہوں گے تو
پڑھیں گے کیا؟ اور اگر طلبہ باذوق ،زیرک اور محنتی ہوں بھی تو جب اساتذہ ہی اس لائق نہ
ہوں گے تو ان سے کما حقہ استفادہ ہی کیا کرسکیں گے؟ اس معاملہ میں دینی وغیر دینی مدارس
کی کوئی قید نہیں ،دونوں ہی کا حال یکساں ہے-

لیکن دینی مدارس میں تعلیم کا انحطاط اور اساتذہ وطلبہ کی تساہلی و بے رغبتی زیادہ
افسوس ناک اور تشویش ناک ہے، اس لیے کہ دنیوی تعلیم کے بالمقابل یہاں دین وملت کی
خدمت اور دینی ومذہبی تعلیم کا دینا اور دلانا دونوں ہی عبادت اور کار ثواب کا درجہ رکھتے ہیں
اور اس میں کسی طرح کی کوتاہی، خامی اور نا اہلی اسلام کی تبلیغ واشاعت پر منفی اثر مرتب
کرنے کا سبب بنتی ہے-

سوال :-عہد حاضر کے مطالبات اور اسلامی فکر کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعلیم نسواں کے
تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی:-طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم و مسلمه مرد
اور عورت دونوں کے لیے حصول علم ضروری ہے، بغیر علم کے فکر وشعور کی بالیدگی، بہتر سماج و
معاشرہ اور تہذیب واخلاق کی تشکیل نیز حقوق وفرائض کی ادائیگی ناممکن ہے، علم کے بغیر نہ
کوئی اچھا شہری بن سکتا ہے، نہ قوم وملت کی فلاح وبہبود کا فریضہ انجام دے سکتا ہے-
مرد اگر خواندہ ہو اور عورت ناخواندہ تو حسن معاشرت اور تہذیب وتمدن کا خاکہ بے

کیف، بے رنگ اور نامکمل ہوگا- ہاں! مرد وزن کی تعلیم کی نوعیت میں فرق وامتیاز ضرور ملحوظ
رکھنا ہوگا اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی تعلیم وتربیت کا ایسے نہج پر ہونا ضروری ہے جس سے
وہ دینی احکام وعقائد کی بنیادی اور ضروری معلومات کے ساتھ بالخصوص خانہ داری کے امور،
والدین کے حقوق، شوہر کے فرائض ، اولاد کی تعلیم وتربیت اور ان کے اخلاق وعادات کو
سنوارنے کا حق ادا کرسکے- عہد حاضر کے مطالبات سے اغماض کسی طرح بھی دانش مندی
نہیں- اگر عورت شرعی حدود وقیود میں رہتے ہوئے جدید عصری علوم وفنون حاصل کرے،
جس سے وہ قوم وملت کے لیے مفید ثابت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، اسلام اس پر کوئی قدغن
نہیں عائد کرتا، بلکہ بعض مواقع پر اس کی شدید ضرورت ہوتی ہے- مثلاً عورت اگر ڈاکٹر اور
ٹیچر ہو تو بلاشبہ وہ طبقۂ نسواں کے لیے بہترین نعمت ہے-

سوال :-اس شکایت سے آپ کو کتنا اتفاق ہے کہ علمائے دین کو مسلمانوں کی عصری
تعلیم اور اقتصادی پسماندگی کا کچھ بھی خیال نہیں ہوتا؟

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی: -دیکھیے! بنیادی بات یہ ہے کہ ہر ایک طبقے کا اپنا ایک مخصوص
دائرہ ہوتا ہے اور اس کی سرگرمیوں کا اصل محور ومرکز وہی ہوتا ہے- علمائے دین کا دراصل
دائرہ عمل دینی واسلامی تعلیم اور اس کی تبلیغ واشاعت ہے، اصولی طور پر علمائے کرام اپنا یہی
منصبی فریضہ انجام دینے میں منہمک رہتے ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی
عصری تعلیم اور اقتصادی پسماندگی کو یکسر نظر انداز کررہے ہیں-

آج دینی مدارس ومکاتب میں عصری تقاضوں کے تحت جدید علوم وفنون کا انتظام کیا
جارہا ہے، مسلمانوں کو کسب حلال ، جائز صنعت وحرفت اور ٹکنالوجی کے حصول کی طرف
راغب کیا جارہا ہے- عصری علوم کے حصول اور اقتصادی ومعاشی بہتری کے ذریعہ ہی آج
اسلام مخالف چیلنجز کے جوابات اور اپنے دفاع وتحفظ کا انتظام کیا جاسکتا ہے، ترقی وکامیابی
کی منزلیں طے کی جاسکتی ہیں، قوم وملت کو استحکام اور دعوتی وتبلیغی مشن کو بہتر طور پر انجام دیا
جاسکتا ہے-

اقتصادی پسماندگی تو دنیاوی تنزلی وبربادی کے ساتھ ساتھ دینی امور کی انجام دہی

میں بھی خامی وکوتاہی کا سبب بن جاتی ہے۔حضرت سعدی نے سچ فرمایا ہے:

شب چوں عقد نماز می بندم   چہ خورد بامراد فرزندم

لیکن یہ شکایت بھی بالکل غلط نہیں کہ علمائے کرام کو جس قدر اور جس منظّم انداز میں اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ابھی وہ اس کی طرف اتنی توجہ نہیں مبذول فرما رہے ہیں۔

سوال:- جام نور اور اس کے کارواں کے لیے کوئی پیغام؟

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی:- جام نور ایک معیاری مذہبی وادبی جریدہ ہے، مذہبی صحافت کی دنیا میں اس نے ایک خوش گوار انقلاب برپا کیا ہے، فکر وشعور کی نئی شمعیں روشن کی ہیں، عصری تقاضوں کو پورا کیا ہے، صوری ومعنوی خوبیوں کا آئینہ دار ہے، عصر حاضر کے مسائل پر بے لاگ اور بے باک تبصرہ اس کی خصوصی شناخت ہے، خضر راہ کا نیا کالم طلبہ کے اہداف کے تعین اور ان کی دینی وعصری تعلیم کی رہنمائی کے لیے بے حد سودمند ہے۔فکر ونظر کے نئے نئے گوشوں کی تلاش آپ کی ذہانت وطباعی کی دلیل ہے۔

خامہ تلاشی کا سلسلہ بے حد مفید اور معلوماتی تھا، جام نور کے مشمولات کے اسقام و معائب سے خود قلم کار اور عام قارئین کو آگاہی ہوتی تھی۔ جنوری وفروری ۲۰۰۷ء کے شماروں میں زبان وبیان کی مختلف خامیاں در آئی ہیں، آخر ان کی نشاندہی اب کون کرے گا؟ تعاقب کا نیا کالم بہت خوب ہے لیکن تعاقب نگار بقول خویش دیگر جرائد ورسائل کا ہی تعاقب کرے گا، جام نور کا نہیں۔آخر کیوں؟ کیا اب جام نور کے قلم کاروں سے غلطیوں کا صدور نہ ہوگا؟ یا ان کی اصلاح کی اب کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی؟

آخر میں میری دلی دعا اور تمنا ہے کہ کاروان جام نور اپنی تمام تر خوبیوں، صلاحیتوں اور توانائیوں کے ساتھ ارتقائی منزلیں پوری بصیرت وسلامت روی کے ساتھ طے کرتا رہے۔□□□

(شمارہ مارچ ۲۰۰۷ء)

ڈاکٹر شمس بدایونی

ہندستان کے مردم خیز شہروں میں ایک بڑا نام بدایوں کا ہے جس نے ہر عہد میں علمی، ادبی اور روحانی نمائندگی کی ہے۔ماضی میں بدایوں سے اٹھنے والی علمی وادبی شخصیات میں فانی بدایونی، شکیل بدایونی، دلاور فگار، آل احمد سرور اور عرفان صدیقی کے نام اور کام سے ایک جہان واقف ہے۔اسی طرح ہم عصر علمی شخصیات میں تحقیق وتنقید کے حوالے سے ڈاکٹر شمس بدایونی (پ۱۹۶۱ء) محتاج تعارف نہیں۔موصوف بیک وقت ادیب، شاعر، ناقد اور محقق ہیں۔ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے ندوۃ العلما کے لیے رخت سفر باندھا، وہاں سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گئے اور ۱۹۸۴ء میں ایم اے کیا۔۱۹۹۲ء میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی نے آپ کو ''نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ابتدا میں آپ شعر وسخن کی طرف مائل تھے جس کے نتیجہ میں آپ کا شعری مجموعہ ''اجنبی خواب'' منظر عام پر آیا۔بعد کے ادوار میں آپ کی وابستگی تحقیق وتنقید سے ہوئی اور یہی آپ کا نشان امتیاز بن گئی۔اپنے ابتدائی ادبی دور میں صحافت سے بھی آپ کا تعلق رہا اور برسوں تک آپ نے بدایوں کے علمی وادبی جریدہ ''روشن'' کی ادارت فرمائی۔شعر وادب کے علاوہ تاریخ وتصوف بھی آپ کی دل چسپی کے خاص موضوعات ہیں، اب تک آپ کے قلم سے ڈیڑھ درجن سے زائد علمی وتحقیقی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں خاص طور پر دید ودریافت (۱۹۸۱ء) شعری ضرب الامثال (۱۹۸۴ء) اور اردو نعت کا شرعی محاسبہ (۱۹۸۸ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔کتابوں کے علاوہ ہندوپاک کے نمائندہ علمی وادبی رسائل وجرائد میں بھی چھپتے رہے ہیں۔مذہب وادب دونوں پر آپ کی یکساں نگاہ ہے جو بہت سے ادیبوں سے آپ کو ممتاز کرتی ہے۔

سوال:- بدایوں کی علمی وادبی تاریخ پر اجمالاً روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:- بدایوں کی بسیط تاریخ کو اپنے جلو میں بعض خاص تاریخی واقعات، بعض حکمرانوں کی تقدیریں، بعض مقدس نفوس کی علمی وتبلیغی کوششیں، شعرا وادبا کے تصنیفی کارنامے اور قدیم آثار وکتابت کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتی ہے، صفحے دو صفحے میں پیش کرنا مشکل ہے- شمالی ہند میں گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں ابھرنے والی زبان لسانیات کی اصطلاح میں پری اردو (Pre-Urdu) کہلاتی ہے- اسی پری اُردو کا ایک نمونہ بدایوں میں بھی دستیاب ہوا- حضرت شاہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۳۵۶ء) سے منقول ہے کہ جب مولانا علاء الدین اصولی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۲۶۴ء) نے حضرت خواجہ علی مولا بزرگ (ف ۱۲۴۹ء) کے دست مبارک سے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۳۲۴ء) کے سر پر دستار بندھوائی تو اس وقت مولا علی بزرگ نے بہ زبان ہندوی کہا: ''ارے مولانا یہ بڑا ہوسی'' (یعنی یہ بزرگ ہوگا) مولانا اصولی کے استفسار پر مزید فرمایا کہ ''جو منڈا سا باندھے سو پائن پسرے'' (یعنی جو دستار باندھ رہا ہے وہ اس کے پاؤں پڑ رہا ہے) یہ اردو کے اولین جملوں میں سے ہیں-

اسلامی ہند کے دور اول سے مغلوں کے عہد شباب تک بزرگان دین کی ایک بڑی جماعت بدایوں میں متوطن نظر آتی ہے- اس دور کے جتنے بھی تصنیفی، تالیفی وشعری کارنامے ہیں وہ انھیں بزرگوں کے ہیں- معروف اسماء صاحب مشارق الانوار مولانا رضی الدین حسن صغانی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۲۵۲ء) اور خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۳۲۴ء) ہیں- اس جماعت میں شیخ شہاب الدین مہمرہ (ف ۱۲۸۷ء)، امیر حسن سجزی (ف ۱۳۳۷ء)، شیخ ضیاالدین نخشبی (ف ۱۳۵۰ء)، فارسی کے ممتاز شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں- اکبر اعظم (ف ۱۶۰۵ء) کے عہد کے ممتاز شعرا میں جمال الدین خاں ناصحی (ف ۱۵۶۱ء)، شمس الدین خاں جھجار زاہد (ف ۱۵۸۲ء)، ملا عبدالقادر بدایونی (ف ۱۵۹۵ء) کے نام اہم ہیں- شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی بدایوں بھی اردو شاعری سے

روشناس ہوا- اٹھارھویں صدی کے شعراے بدایوں کے متعدد نام اردو تذکروں میں ملتے ہیں: عبدالحئی تاباں (ف ۱۷۴۹ء)، معین الدین معین (ف ۱۷۶۰ء)، شاہ محمدی بیدار (ف ۱۷۹۶ء)، اکرام اللہ محشر (ف ۱۸۰۵ء)، نواب ظہور اللہ خاں نوا (ف ۱۸۳۰ء) کے نام معروف ہیں-

انیسویں صدی میں بدایوں میں باقاعدہ شعر وادب کی بساط سی بچھ گئی- شعراے بدایوں نے اساتذہ دہلی ولکھنؤ سے سلسلہ تلمذ قائم کیا- دہلوی اساتذہ میں ذوق، غالب، معروف، عارف، راسخ، ظہیر، داغ، حالی وشیفتہ وغیرہ اور لکھنوی اساتذہ میں آتش، افضل، تسلیم، امیر، جلال، فراق وغیرہم سے استفاضہ واستفادہ کیا- اس طرح بدایوں میں دہلی اور لکھنو دونوں کے لہجے اور شعری اسالیب، طرز اظہار و بیان مقبول ومروّج ہوا، لیکن بدایوں کے شعری ماحول پر لکھنؤ کے مقابلے دہلی اسکول کا اثر غالب رہا- ذوق، غالب، ظہیر، داغ، اور احسن مارہروی کے تلامذہ نے اس رنگ کو یہاں پروان چڑھایا اور یہ سلسلہ ابر احسنی (ف ۱۹۷۳ء) اور جامی بدایونی (ف ۱۹۶۵ء) کے تلامذہ کی صورت میں آج بھی موجود ہے-

اس شعری تسلط کے باوصف علمی رجحان بھی مفقود نہیں ہوا تھا چنانچہ صاحب معیار البلاغت منشی دیبی پرشاد سحر (ف ۱۹۰۲ء) صاحب تذکرہ شمیم سخن عبدالحئی صفا (ف ۱۹۱۴ء) صاحب کنز التاریخ رضی الدین بسمل (ف ۱۹۲۵ء)، صاحب تنقید لسان الغیب ابو الحسن صدیقی (ف ۱۹۲۸ء) صاحبِ مسئلہ علم مسلم مفکرین کی نظر میں مولانا یعقوب بخش راغب (ف ۱۹۲۹ء)، صاحب مضامین میر محفوظ علی (ف ۱۹۴۳ء)، صاحب قاموس المشاہیر نظام الدین حسین نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) وغیرہ اس علمی وادبی رجحان کی ایک علامت قرار دیئے جاسکتے ہیں-

سوال:- جہادِ آزادی میں اہل بدایوں کی جدوجہد پر کچھ روشنی ڈالیں؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:- جہادِ آزادی میں اہل بدایوں کی جدوجہد کی داستان خاصی طویل ہے جس پر مولوی محمد سلیمان بدایونی نے ایک کتاب باسم بدایوں ۱۸۵۷ء میں (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء) سپرد قلم کی تھی- یہ کتاب اب کمیاب ہے لیکن میں یہاں ایک ایسے فارسی

قصیدے کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس پر ابھی تک تحقیقی گفتگو نہیں ہو سکی ہے۔

اس فارسی قصیدے کے خالق ہیں نواب ظہور اللہ خاں نوؔا (ف ۱۸۳۰ء)، نوؔا حکیم بقاء اللہ بقاؔ کے نامور شاگرد تھے۔ قصیدہ نگار اور فارسی گو کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ جرأت و شاگردانِ جرأت سے شاعری میں چھیڑ چھاڑ رہی ہے اور نوبت ہجویات تک جا پہنچی۔ عرصہ دراز تک لکھنؤ میں قیام کیا۔ ان کی خاندانی تاریخ باسم ''تاریخ بنی حمید'' (قلمی) میں ان کا ترجمہ شامل ہے۔

نوؔا ہندوستان کا وہ فرزند جلیل ہے جو قصیدے کی صورت میں ہندوستانی سیاست کا نقشہ پیش کر کے شاہِ ایران فتح علی خاں قاچار (دورِ حکومت ۱۷۹۷ تا ۱۸۳۴ء) سے جنگ آزادی سے نصف صدی پیشتر ہندوستان پر مع لاؤلشکر حملہ آور ہونے کی درخواست کرتا ہے اور وطن کو انگریزوں کے راج سے آزاد کرانے کی پُر زور سعی وسفارش کرتا ہے۔ نوؔا کے ایران جانے کا زمانہ ۱۸۰۷ء سے ۱۸۱۰ء کے آس پاس رہا ہوگا۔ نوؔا کے اس قصیدے سے اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے تقریباً نصف صدی پیشتر اس کے وقوع کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور بدایوں کے ایک فرزند نے اس کو بہتر طور پر محسوس کر کے ایک قصیدے کی صورت میں محفوظ کر دیا تھا۔ عرصہ دراز تک یہ قصیدہ آزادی پر کام کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔ ۱۹۶۰ء میں مولوی سلیمان نے اس کا متن اپنی کتاب میں نقل کیا۔ ۲۰۰۸ء میں راقم الحروف نے اس قصیدے کا تحقیقی وتاریخی جائزہ لیتے ہوئے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا۔ معارف اعظم گڑھ (دسمبر ۲۰۰۸ء) میں شائع ہوا۔

بدایوں کے وہ اکابر جن کا جہادِ آزادی میں نمایاں کردار رہا ان میں مولانا فیض احمد رسوؔا (ف ۱۸۵۷ء)، مولوی اشرف علی نفیسؔ (ف ۱۸۵۸ء) کا نام ممتاز ہے۔

سوال:۔ بدایوں کی شعری، ادبی اور علمی شمع مدھم پڑ چکی ہے، کیا یہ کہنا صحیح ہوگا؟ اگر ہاں، تو کیوں؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:۔ یہ صحیح ہے کہ بدایوں کی شعری، ادبی اور علمی شمع مدھم پڑ چکی ہے لیکن اس کی وجوہ کئی ہیں:

(الف) بدایوں کے علمی خانوادوں کے افراد کا ملازمت یا معاشی ضرورتوں کے تحت مغربی تعلیم سے آراستہ ہونا اور وطن کو خیرآباد کہہ دینا یعنی ترکِ وطن کر لینا۔

(ب) علمی و ادبی ماحول کو پروان چڑھانے والے خاندان، مدارس اور خانقاہوں وغیرہ کے نظم کا ٹوٹ جانا اور معاشرے پر ان کی گرفت کا کمزور پڑ جانا۔

(ج) بدایوں کے فنکاروں کا مقامی سیاست اور مقامی روایت تک خود کو محدود کر لینا، علم وادب کے نئے دریچوں اور نئے دروں کو خود پر بند کر لینا اور مقامی علمی وشعری روایت پر مطمئن اور نازاں رہنا۔

سوال:۔ اپنے ادبی اور تحریری سفر کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:۔ میرے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۷۴ء میں شاعری سے ہوا۔ ابتدا میں مقامی شعری نشستوں میں حصہ لیتا رہا۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں میرے بڑے بھائی خالد بدایونی نے ''روشن'' کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا، جو جدیدیت کا علم بردار تھا۔ میں نے اس میں تبصرے لکھنا شروع کیے، اسی دوران کچھ تبصرے ماہنامہ کتاب نما (دہلی) میں بھی ماہ بہ ماہ لکھے۔ اس رسالے اور تبصرہ نگاری کے توسط سے ہندوستان کے ممتاز قلم کاروں سے میرا رابطہ قائم ہو گیا، جس نے میرے لکھنے پڑھنے کے ذوق کو مہمیز کیا۔ ۱۹۸۱ء میں میں نے ''روشن'' بدایوں کا ''فانیؔ نمبر'' مرتب کیا جسے علمی وادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ ۱۹۸۳ء میں میں نے روشن کو تحقیقی وتنقیدی ادب کے لیے مختص کر کے اس کی ادارت خود سنبھال لی۔ روشن ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک آٹھ سال جاری رہا۔ اس درمیان میرے تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی ملک کے موقر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ شاعری سے بھی شغف رہا بعض ادبی موضوعات پر مستقل تصانیف بھی سپردِ قلم کیں۔

سوال:۔ وہ کیا عوامل یا اسباب تھے جنھوں نے آپ کو ادبی تحقیق کی راہ پر ڈالا؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:۔ میں نے طالب علمی کے زمانے میں متعدد علوم وفنون خصوصاً ادب کا مطالعہ سلسلے وار اور اصناف وار کیا تھا یعنی پہلے شاعری کی متعدد اصناف کو پڑھا، پھر تاریخ وتذکرہ، سیرت وسوانح، ناول وافسانہ اور آخر میں تنقید وتحقیق کی جملہ معیاری کتب کو

ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ مطالعے کا حصہ بنایا- تاریخ، فلسفہ، اسلامیات اور ادب میرے پسندیدہ موضوعات رہے ہیں اور آج بھی ہیں- اس طور ادب پاروں، ادبی شخصیات، ادبی مسائل وامکانات کومجموعی طور پر دیکھنے اورمختلف زاویوں سے پرکھنے کا میرا مزاج تشکیل پا گیا- یہی مزاج ادبی تحقیق کی راہ پرڈالنے کا قبلہ نما بن گیا- یہ تو وہ بات ہے جسے میں نے عمر کے پانچ دہوں کا سفر طے کرنے کے بعد محسوس کیا ہے- ایک اور پہلو بھی ہے جو اس راہ پرڈالنے کا فطری سبب ہوسکتا ہے میرے اور اسعد بدایونی (ف۲۰۰۳ء) کے درمیان ایک خاموش چشمک تھی- اس چشمک کا سبب رسالہ روشن بدایوں سے بطور مدیر میری وابستگی تھی- میں نے اس چشمک کا تفصیلی تذکرہ اسعد کی وفات پر لکھے ایک تاثراتی مضمون ''ایک مدمقابل دوست اسعد بدایونی کی موت'' (ہماری زبان دہلی، ۲۲ تا ۲۸ مئی ۲۰۰۳ء) میں کردیا ہے-اس مضمون کے آخر میں میں نے لکھا تھا:

''اسعد اس معنی میں میرے محسن تھے اگر وہ مجھے اپنا حریف اور مدمقابل نہیں سمجھتے تو شاید میں شاعری سے توجہ ہٹا کر نثر کی طرف مائل نہیں ہو پاتا- اُن کے منفی تبصرے اور ریمارک میرے لیے ادبی سفر کی سمت متعین کرنے میں معاون بنے- میں نے شاعری کا میدان ان کے لیے چھوڑ دیا اور تحقیق وتنقید کی سنگلاخ وادیوں کو اپنے لیے منتخب کرلیا- ان کی موت ایک محسن کی بھی موت ہے جس کی یاد کوفراموش نہیں کیا جاسکتا''-

سوال :-ایسا مانا جاتا ہے کہ فانی بدایونی، شکیل بدایونی، دلاورفگار، آل احمد سرور، عرفان صدیقی، طارق سبزواری، اسعد بدایونی اورخود آپ جیسی درجنوں ادبی شخصیتیں ایسی ہیں جو بدایوں میں پیدا ہوئیں، مگر بدایوں سے باہر نکلنے کے بعد ہی انھیں شہرت ومقبولیت اور علمی وادبی مقام حاصل ہوا، جبکہ وہ ادبا، شعرا اور اہل علم وقلم جو بدایوں میں ہی رہ گئے انھیں وہ حیثیت نہیں مل سکی، آخر ایسا کیوں؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:- میں آپ کے اس سوال سے اتفاق نہیں کرتا- میری ادبی شہرت تو بدایوں میں قیام کے دوران ہی ہوگئی تھی- بریلی ۱۹۹۳ء میں متوطن ہوا- میرا بیشتر ادبی کام دورانِ قیام بدایوں کا ہے جس نے مجھے ادبی دنیا سے متعارف کرایا- بات دراصل یہ ہے کہ

وطن سے باہر ہمارا رابطہ غیروں سے قائم ہوتا ہے اس صورت میں ہم اپنی جانب زیادہ بہتر طور پر دیکھ پاتے اور سوچ پاتے ہیں اور غیروں کے درمیان اپنی ممتاز حیثیت بنانے کی سعی و کاوش کرتے ہیں- وطن میں ہمارا رویہ اپنے بزرگوں کی عظمتوں کے سہارے آگے بڑھنے کا ہوتا ہے- بڑے شہروں میں بسنے کے بعد ہماری زندگی کی رفتار، معیار اور سوچ میں جو فرق واقع ہوتا ہے وہ ان اسباب و وسائل کے حصول میں بڑا معاون ہو جاتا ہے جو شہرت و حیثیت کو مستحکم کرنے میں معاون بنتے ہیں- بڑے شہروں میں وسائل کی فراوانی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا- یہی وجہ ہے کہ چھوٹے شہروں کی بہ نسبت بڑے شہروں میں بسے لوگ زیادہ پُرعزم واعتماد، زیادہ فعال ومتحرک ہوتے ہیں اور بایں وجہ اپنے نصب العین کے قریب جلدی پہنچ جاتے ہیں-

سوال:-موجودہ دور میں علمی وادبی تحقیق کا معیار آپ کی رائے میں کتنا اطمینان بخش ہے؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:-زندگی کے وسائل اور علم کے شعبوں سے روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے- سائنسی نقطہ نظر اب طرز فکر بن چکا ہے، لیکن بایں ہمہ ہماری اخلاقی زندگی میں گراوٹ کے آثار بڑھتے چلے جارہے ہیں- ہم پہلے سے زیادہ کم محنتی، پہلے سے زیادہ بددیانت، پہلے سے زیادہ علمی تنگ ودو اور معاملات میں ذاتی پسند وناپسند کے حصار میں قید ہوتے جا رہے ہیں- ہم سستی شہرت اور ذاتی مفاد کو علمی تلاش وجستجو، غواصی اور بقول پروفیسر آل احمد سرور ''شیریں دیوانگی اور مقدس سنجیدگی'' پر ترجیح دینے لگے ہیں- ظاہر ہے جب ہمارا ادبی سروکار ہی بدل جائے گا تو معیار اطمینان بخش کیسے رہ سکے گا-

جہاں تک علمی وادبی تحقیق کے معیار کا سوال ہے تو اسے صرف جامعات کے شعبہ ہائے اردو کے پروفیسروں کے کاموں سے جوڑ کر دیکھا جانے لگا ہے- یونیورسٹیز سے باہر جو علمی وتحقیقی کام ہورہا ہے وہ معیار تحقیق کے لحاظ سے کیسا ہی بلند و بالا ہو مختلف محاذوں پر اسے دنیا دارانہ سفّاکیوں اور بے اعتدالیوں سے واسطہ پڑتا ہے- وہ پذیرائی اور مقبولیت کی اس آخری حد تک نہیں پہنچ پاتا جہاں پروفیشنل لکھنے والے پہنچ جاتے ہیں-نتیجہ یہ ہے کہ معیار

کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال ہی آج خطرے سے دوچار ہے- اس صورت میں ادبی تحقیق کا معیار آج اطمینان بخش نہیں-

سوال:- مشاعرے فروغِ ادب کا ذریعہ تھے مگر آج تماشہ بن گئے، اسی طرح ادبی سیمینار تحقیق وتنقید کی نئی راہیں کھولنے کے لیے شروع کیے گئے تھے، آج کے سیمیناروں کے معیار اور کامیابی کے بارے میں آپ کتنے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:- میں نے ۱۹۸۸ء کے بعد نہ کوئی بڑا مشاعرہ پڑھا اور نہ سنا- اِی ٹی وی اُردو پر کبھی کبھی مشاعرے دیکھنے کا اتفاق ضرور ہوا- لہٰذا میں شاعروں کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں- البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ماضی بعید میں مشاعرے فروغِ ادب کا ذریعہ تھے لیکن آج یہ محض فروغِ زبان کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں- شاید ہمارا عوامی ذوق اسی کا خواہش مند ہے- جہاں تک سیمیناروں کا تعلق ہے تو یہ بھی مشاعروں کی روش پر چلنے لگے ہیں- بیشتر قلم کار صرف سیمینار میں شرکت اور اجرتِ شرکت کو کافی سمجھتے ہیں- سیمینار منعقد کرنے والے ادارے بھی تعداد شرکا اور مقالہ نگاروں میں معروف ومشہور ناموں پر اکتفا کرتے نظر آتے ہیں- علم وادب میں نئے امکانات کی تلاش، ان پر مکالمے اور مباحثے، علوم و ادب کے ثقہ اور معتبر ماخذ ومتن پر گفتگو یہ ساری چیزیں عموماً اب سیمیناروں سے رخصت ہو چکی ہیں- ہم کیا لکھیں، کیا لکھ رہے ہیں ہمیں خود ہی معلوم نہیں- صرف انشاپردازی، تقریروں اور ستائش باہمی کے سہارے ہمارا سفر جاری ہے اور شاید آئندہ بھی اسی طور جاری رہے گا-

سوال:- تنقیدِ نعت میں آپ کی کتاب ''اردو نعت کا شرعی محاسبہ'' ۱۹۸۸ء میں سامنے آئی، وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے آپ کو نعت کے شرعی محاسبے پر آمادہ کیا؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:- راقم الحروف نے جس زمانے میں تاریخ ادب اردو کا مطالعہ کیا خصوصاً شاعری کا، تب اس نے محسوس کیا کہ نعت نگاری بلا امتیاز مذہب وملت ہر شاعر کی بسم اللہ بنی ہے- لیکن محض تبرکاً ہزاروں لاکھوں شعرا کی صف میں چند شعرا کا اس صنف میں اختصاص مستثنیات میں سے ہے، دوسری بات جو اُس نے محسوس کی وہ یہ کہ جو شعرائے اردو

نعت لکھ رہے ہیں یا لکھ چکے ہیں ان کی توجہ نعت کے موضوع پر کم نعت کے اسلوب پر زیادہ رہی ہے- جس طرح واعظین اور مقررین نے اپنی تقریروں کو آراستہ کرنے کے لیے پُراثر واقعات وروایات کا سہارا لیا اسی طرح ہمارے شعرا نے بھی آں حضور (ﷺ) کی ذات مبارکہ سے منسوب روایات وواقعات کو شعری جامہ پہنانے میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا- اس طرح نعت کے موضوعات میں بعض ایسی غیر معتبر روایات اور شاعرانہ نکتہ آفرینیاں شامل ہوتی چلی گئیں جنھوں نے کثرت وتواتر سے نظم کیے جانے کے سبب نعت کے مستقل مضمون کا درجہ حاصل کر لیا اور یہ مضامین نعت کے متداول مضامین کے طور پر قبول کر لیے گئے جب کہ فی نفسہ وہ قرآن وحدیث اور سیرت مبارکہ سے متعارض ہیں-

راقم الحروف نے ۱۹۸۷ء تک نعت پر لکھے جا چکے کام کا جائزہ لیا، صرف ایک کتاب اردو کی نعتیہ شاعری (ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ، پٹنہ ۱۹۷۴ء) نظر سے گزری جو نعت پر ابتدائی نوعیت کی معلومات پر منحصر پہلی کتاب تھی جبکہ مرثیے پر اُس وقت تک کئی اچھی کتابیں منظر عام پر آ چکی تھیں- چنانچہ میں نے نعتیہ ادب کا مطالعہ کر کے عہد وار ایسے نعتیہ اشعار جمع کیے جن میں مذکورہ مضامین تواتر کے ساتھ نظم کیے گئے تھے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ اشعار قرآن وحدیث اور سیرت مبارکہ سے کہاں کہاں اور کس طرح متعارض ہو رہے ہیں- میں نے اپنی کتاب میں معروف مضامین کا جائزہ لیا، الحمدللہ اس کا اثر یہ ہوا کہ نعت نگاری کے فن، اسلوب اور مضامین پر گفتگو ہونے لگی- ورنہ اس سے پیشتر نعتیہ ادب پر تنقید کرنا سوئے ادب سمجھا جاتا تھا-

سوال:- آپ کی اس کتاب کے بعض مندرجات پر تنقیدیں بھی ہوئیں اور یہ کہا گیا کہ آپ کو ادبی تحقیق سے مطلب رکھنا چاہیے، شرعی محاسبہ آپ کا منصب نہیں، اس پر آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:- کسی بھی ایسی کتاب کو تنقید کا ہدف بننا ہی پڑتا ہے جو جمود کو توڑنے اور گمشدہ اصل علمی روایت سے جوڑنے کی بات کرتی ہو، لیکن اس کتاب پر تنقید کرنے والے افراد میں مجھے کوئی علمی پہچان رکھنے والی شخصیت نظر نہیں آئی- البتہ اس کی تحسین

کرنے والوں میں ادب کی کئی نامور ہستیوں کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر خلیق انجم، شمیم طارق وغیرہ- رشید حسن خاں نے اپنے تبصرے میں جو بات لکھی تھی وہ آج بھی اس کتاب کے تعلق سے وہی اہمیت رکھتی ہے، انھوں نے لکھا تھا:

''یہ مختصر سی اچھی کتاب ہے جس کا مطالعہ نعت گو شعرا کے لیے بھی ضروری ہے اور سنجیدہ طبع قارئین کے لیے بھی- یہ صحیح ہے کہ ایسی تحریروں سے غیر تربیت یافتہ ذہن اور غیر قابو یافتہ جذباتیت رکھنے والوں کو ذرا بھی فائدہ نہیں ہوا کرتا کیوں کہ وہ ان باتوں کو صحیح معنی میں سمجھ ہی نہیں سکتے مگر وہ خوش ذوق سلیم الطبع جو سنجیدگی کے ساتھ تحریروں کو پڑھا کرتے ہیں اور بات کو سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب ایک اچھا تحفہ ثابت ہوگی-

(تبصرے سے اقتباس غالب نامہ دہلی جنوری ۱۹۸۹ء)

جو شخص شریعتِ اسلامیہ کا واقف کار ہو اور وہ دیکھ رہا ہو کہ ادب کے نام پر شریعت اسلامی کے بعض حصوں کو غلط تعبیرات و تشریحات، معانی و مفاہیم میں پیش کیا یا منظوم کیا جا رہا ہے اور وہ اس کا محاسبہ کرتا ہے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے ہاں البتہ محاکمے کا حق بحق مفتی محفوظ ہے-

سوال:- نعتیہ شاعری کے حوالے سے ہند و پاک کے شعری تخیل اور اسلوب میں نمایاں فرق نظر آتا ہے، اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:- راقم الحروف نے گزشتہ چند سالوں میں خصوصیت کے ساتھ شعری ادب کا مطالعہ نہیں کیا اس لیے ان اسباب کو بتانے سے قاصر ہوں-

سوال:- ماہنامہ جام نور کے قارئین اور اس کی مجلس ادارت کے لیے آپ کا کوئی پیغام، تاثر یا مشورہ؟

ڈاکٹر شمس بدایونی:- ماہنامہ جام نور کے مدیر جناب خوشتر نورانی ذی علم و ذی شعور فرد ہیں- قوم و ملت کے لیے کچھ کر گزرنے کا ان کا جذبہ بھی صادق ہے- اگر وہ اعتدال، میانہ روی اور توازن کے ساتھ اپنا تحریری سفر جاری رکھیں گے تو یقیناً ان کی علمی و عملی کاوشیں

بارآور اور دیر پا ثابت ہوں گی- خوشتر صاحب سے میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ اُن اختلافی مسائل کو رسالے میں زیر بحث نہ لائیں جو امت مسلمہ میں تفریق کا سبب بنتے رہے ہیں- ان کو مشتہر کر کے ملت اسلامیہ کو بانٹا تو جا سکتا ہے جوڑا نہیں جا سکتا-

مدیر جام نور کو اصلاح عقائد، اصلاح معاشرت، تطہیر نفس کی کوششوں کو ایک مشن کے طور پر ''صوفیانہ تدبر'' کے ساتھ جاری رکھنا چاہیے- میرا اپنا یہ خیال ہے کہ تصوف سے شغف کے بغیر علم و عمل کی تکمیل نہیں ہوتی، یہی ایک راستہ ہے مسلکی، ملکی، لسانی، مذہبی عصبیت پر قابو پانے کا، باقی اللہ حافظ و ناصر ہے- ❑❑❑

(شمارہ نومبر ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر صابر سنبھلی

سابق ریڈر، شعبہ اردو، مرادآباد یونیورسٹی، مرادآباد، یوپی

ڈاکٹر صابر سنبھلی بیک وقت مذہب وادب سے جڑے ان لوگوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریریں ادبی حلقے سے زیادہ مذہبی ومسلکی حلقے میں توجہ سے پڑھی جاتی ہیں- ڈاکٹر سنبھلی ایک ایجاز پسند نثر نگار اور آسان بحروں میں سادہ اشعار کہنے والے ایک شاعر ہیں-ایک ہزار اشعار پر مشتمل ان کا مجموعۂ کلام ''دیوان صابر'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہو چکا ہے- موصوف کی نگارشات مذہبی رسائل و جرائد اور قومی اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں-ان کا ایک علمی مضمون ''کنزالایمان کا ادبی ولسانی جائزہ'' جسے رضویات کے باب میں ایک اہم اضافہ کہا جاتا ہے، اپنے قارئین سے داد و تحسین وصول کر چکا ہے- ڈاکٹر سنبھلی نے پہلی بار کنزالایمان کا ادبی ولسانی جہت سے تفصیلی مطالعہ کیا اور اس کا دوسرے اردو تراجم سے تقابل کر کے ''کنزالایمان'' کی ادبی عظمت کو اجاگر کرنے کی اپنے طور پر بھرپور کوشش کی ہے، پہلے یہ مضمون سہ ماہی ''افکار رضا'' ممبئی میں قسط وار شائع ہوا، اس کے بعد کتابی شکل میں چھپ کر منظر عام پر آیا-موصوف طویل عرصہ تک مرادآباد یونیورسٹی میں اردو ادب کے استاذ رہ کر اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، مگر اس پیرانہ سالی میں جبکہ عمر کے تقاضے کے پیش نظر انہیں بعض امراض بھی لاحق ہیں، قرطاس وقلم سے ان کا رشتہ استوار ہے-

سوال:-''کنزالایمان کا ادبی ولسانی جائزہ'' آپ کی شاہکار تحریر تھی جسے ہند و پاک میں شوق سے پڑھا گیا، جب کہ کنزالایمان پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر اس کے باوجود اس تحریر کی محرک کون سی بات بنی؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:- پہلے تو آپ کو یہ بتادوں کہ یہ سلسلہ اب کتابی شکل میں شائع ہونے والا ہے، کمپوزنگ ہو چکی ہے، پروف ریڈنگ چل رہی ہے، اس کے مقدمے میں اس کے بارے میں لکھ چکا ہوں، آپ پوچھ رہے ہیں تو عرض کرتا ہوں کہ سنبھل میں میرے ایک کرم فرما ہیں، سید خلیق احمد صاحب، امام احمد رضا کے عاشق ہیں، امام احمد رضا پر لکھنے کے لیے مجھے عنوانات دیتے رہتے ہیں، انہوں نے ہی یہ عنوان دیا تھا، اپنی مصروفیات کے باعث بہت دنوں تک تو اس کو ٹالتا رہا، جب اصرار زیادہ بڑھا تو لکھنے کا ارادہ کیا، خیال تھا کہ دو تین قسطوں میں اس کو نپٹا دیا جائے گا، مگر پہلی قسط شروع ہی کی تھی کہ سنبھل سے ایک کتاب امام احمد رضا کے خلاف شائع ہوئی، کتاب کا لب ولہجہ کچھ زیادہ ہی شوخ تھا، اس میں امام احمد رضا کی زبان دانی پر بھی دو بے بنیاد اعتراض کیے گئے تھے، ان اعتراضوں نے اس تحریک کو دھار دے دی اور دھار بھی ایسی دی کہ میری تحریر کا انداز ہی بدل گیا، اس میں جو رنگ ہے وہ میرا اسلوب نہیں ہے، نتیجہ آپ کے سامنے ہے، کتاب تیار ہو گئی-

سوال:-''کنزالایمان'' کے حوالے سے ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ اس کی زبان اور بعض لفظیات قدیم ہونے کے سبب جدید ادبی معیار پر نہیں اترتے، آپ اردو ادب کے ایک بلند پایہ استاذ ہونے کی حیثیت سے اس بات سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:- کنزالایمان کی تصنیف کو ۹۶ ر برس ہو گئے، اتنی مدت میں زبان میں بہت تبدیلیاں ہو جاتی ہیں، کنزالایمان میں چند الفاظ ہی ایسے ہیں، جو اب متروک ہو گئے ہیں، ایک خاص لفظ جس پر مخالف بہت واویلا کرتے ہیں وہ ''کڑوڑا'' ہے، میں نے اس پر مفصل بحث کی ہے، مگر وہ ایک جگہ نہیں تین چار جگہ ہے، اس کے خاص حصے کو یکجا کر کے میں نے ''ماہنامہ اشرفیہ'' مبارکپور میں شائع کرا دیا تھا، پھر اس کے بعد کچھ اور بھی لکھا

بلکہ بعد کی بحث تابوت کی آخری کیل کا درجہ رکھتی ہے، اس کو پھر اشرفیہ والے مضمون میں جوڑ کر شائع کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں، مگر وقت نہیں ملتا-

''کنزالایمان'' جیسا ترجمہ کرنے والا اب کوئی نہیں ہے، اس لیے یہی کافی ہے- متروکات کے معنی پاورق میں درج کردیے جائیں تو مسئلہ حل ہوجائے، ہاں! مولانا عبد المبین نعمانی رضوی قادری صاحب یہ کام کرچکے ہیں، مالیگاؤں سے شائع ہونے والے نسخے میں، افسوس اس بات کا ہے کہ ''کنزالایمان'' میں چند متروک الفاظ دیکھ کر چیں بہ جبیں ہونے والے اس ترجمے کے بارے میں کچھ نہیں کہتے جو علامہ محمود حسن صاحب سے منسوب ہے اور متروکات کا مجموعہ ہے-

سوال:-آپ نے کنزالایمان کے علاوہ دیگر متعدد اردو تراجم قرآن کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے، اس کے بعد جدید اردو لب ولہجہ کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ نگاری قرآن کے حوالے سے کیا کہتے ہیں؟ کیا آج کسی نئے ترجمے کی ضرورت ہے؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:-میری رائے میں کسی جدید ترجمۂ قرآن کی کوئی ضرورت نہیں، اب بھی ''کنزالایمان'' کے بعد نیا ترجمہ کرنا منہ چڑانا ہے-

سوال:-امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کنزالایمان کے علاوہ مذہبیات پر ہزاروں صفحات لکھ کر اردو کے فروغ میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، مگر حلقۂ نقد وادب نے اس قسم کی کوششوں کو فروغ اردو کی تاریخ میں کیوں نہیں شامل کیا؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:-اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں، اول تعصب دوم یہ کہ سماج میں قصے کہانیوں اور عشقیہ شاعری کی ہی زیادہ قدر ہے، ویسے یہ بات لوگوں کو عام طور سے معلوم نہیں کہ امام احمد رضا پر اب تک دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں ۱۸/ پی ایچ ڈی کی ڈگریاں ایوارڈ ہوچکی ہیں ۱۱/ پر کام چل رہا ہے، ایم فل کے لیے ۷/اسکالرز کام کررہے ہیں، ڈی لٹ کے لیے بھی کام ہو رہا ہے- اس طرح وہ غالب، اقبال اور پریم چند کے زمرے میں شامل ہیں (موضوعات تحقیق کے لحاظ سے) کچھ یونیورسٹیوں میں ان کی نعتیں اور نثر

پارے بھی شامل نصاب ہیں-

سوال:-یہ صحیح ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کی علمی نثر کا جو انداز ہے وہ عہد حاضر میں مقبول نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں جو شگفتگی، برجستگی، مرصع نگاری اور محاورے کی کثرت اور برمحل استعمال ہے، اس کے پیش نظر وہ ادبی ولسانی جہت سے باغ و بہار جیسی فکاہیہ نثروں سے کسی طرح کم نہیں، پھر بھی ان کے ساتھ اہل اردو کا تجاہلانہ سلوک؟ آخر کیوں؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:-''باغ و بہار'' داستان ہے، علمی تحریریں اکثر ذہنوں پر بار ہوتی ہیں، علمی نثر کبھی بھی ابن صفی کی ناولوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی- دوسری وجہ وہی تعصب ہے اور تیسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ امام احمد رضا کا لٹریچر ابھی تک دستیاب ہی کہاں تھا، اب اشاعت سے مزین ہو رہا ہے، ان شاءاللہ تعالیٰ مقبول ہوگا-

سوال:-مذہبی تحریروں کو ادب میں شامل کرنے میں تو اردو دنیا کے مسند نشینوں کے پاس ڈھیر ساری کٹھ حجتیاں اور تاویلات ہیں مگر کیا مذہبی تحریروں کے ذریعہ فروغ اردو کی ناقابل فراموش خدمات کو بھی فراموش کیا جاسکتا ہے؟ آپ کیا کہتے ہیں؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:-اردو کا آغاز مذہبی تحریروں سے ہی ہوا ہے، اس سے کون انکار کرسکتا ہے، اردو ادب کی تاریخ صوفیائے کرام کے کارناموں کو کبھی نظر انداز اور فراموش نہیں کرسکتی-

سوال:-آج کا اردو ادب زوال آمادہ ہے یا ارتقا پذیر، نیز عالمی ادب میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:-میری نظر میں اردو ادب اس وقت انحطاط پذیر ہے، پہلے کے لکھنے والے اب نہیں رہے، اب نئے لکھنے والوں کا ماڈل یورپی زبانیں اور ادبیات ہیں، عالمی ادب میں برصغیر کی کسی زبان کے ادب کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے، خواہ اپنے منہ میاں مٹھو کوئی بن لے-

سوال:-کہتے ہیں کہ مذہب کو ادب اور سیاست سے الگ کرنے کی پالیسی اہل

مغرب کی ہے جن کی تقلید میں اہلِ مشرق بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، اس تعلق سے آپ کی رائے کیا ہے؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ اس پالیسی کے مثبت یا منفی اثرات کیا ہوئے؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:- اگر یہ بات درست ہے کہ یہ پالیسی اہلِ مغرب کی ہے تو اہلِ مشرق کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہی ہوگا، اس لیے کہ ہم نے ان کو ماڈل بنا رکھا ہے اور ان کی تقلید کے علاوہ ہمیں کچھ سوجھتا ہی نہیں، اب اہلِ مشرق میں مقلد ہی رہ گئے ہیں، ادب کے مجتہد ناپید ہیں-

سوال:- اردو شاعری جس میں آج ہر دن نئی نئی صنفوں اور صنعتوں کا اضافہ ہو رہا ہے، آپ اس سے کہاں تک مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:- اردو میں نئی نئی اصناف کا تو اضافہ ہو رہا ہے، مگر نئی صنعتوں کے بارے میں لاعلم ہوں، نو پیدا اصناف سے میں مطمئن نہیں ہوں، میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی زیادہ طویل نہیں ہوگی-

سوال:- اردو نعتیہ شاعری پر محدث بریلوی کے بلاغت نظام نعتیہ شاعری کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ نیز آج کی نعتیہ شاعری زبان و آہنگ اور فکر و فن کے لحاظ سے کیسی ہے؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:- اردو کی نعتیہ شاعری پر محدث بریلوی کی نعتیہ شاعری کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعد میں نہ ان جیسا کوئی عاشقِ رسول ہوا اور نہ ایسا عالم، ہاں! زبان میں ضرور اصلاحات ہوئی ہیں، بھارت میں اردو نعت اپنے پرانے ڈھرے پر چل رہی ہے، البتہ پاکستان میں بہت ترقی کر رہی ہے، وہ بھارت سے پچاس سال آگے ہے، وہ بھی نئی فکر، اشاریت اور ایمائیت کے باعث، محدث بریلوی کا اس پر بھی کوئی اثر نہیں، بنگلہ دیش کا حال معلوم نہیں-

سوال:- اردو ادارے فروغِ ادب کے نام پر آج جو کچھ کر رہے ہیں ان سے اردو کو کتنا فروغ ہو رہا ہے؟ خصوصاً آج ہر صبح ایک نئے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا جو رواج چل پڑا ہے اس سے اردو کا کتنا فائدہ ہو رہا ہے؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:- کچھ نہ کچھ فروغ تو ضرور ہو رہا ہے، ان اداروں کا وجود بےکار محض نہیں، رہی شعری مجموعوں کی اشاعت کی ریل پیل کی بات تو ان سے صرف شاعری کی تسکینِ قلب ہوتی ہے، یہ مجموعے خریدے نہیں جاتے، مفت تقسیم ہوتے ہیں اور مفت ملی کتابوں کو کم ہی لوگ پڑھتے ہیں، اگر کسی نے پڑھنے کا حق ادا کیا تو پیش لفظ پڑھ لیا جس میں مجموعے کے منتخب اور عمدہ اشعار شامل ہوتے ہیں-

سوال:- آپ اردو کے استاذ ہیں، اس لیے اردو کی نصابی کتابوں پر آپ کی گہری نظر ہے؟ کیا آپ ان پر کوئی تبصرہ کرنا چاہیں گے؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:- جی ہاں! اردو کی نصابی کتابوں کا معیار لگاتار گر رہا ہے، اب سے سو برس پہلے درجہ پانچ پاس کرنے والے کی اہلیت کو آج کل کا گریجویٹ نہیں پہنچ سکتا، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی درجہ پانچ کے لیے لکھی گئی کتاب آج کے انٹر پاس کے سر سے گزر جاتی ہے، جب بھی نصاب کی تدوینِ نو ہوتی ہے، اس کو سہل اور ہلکا کرنے پر ہی زور دیا جاتا ہے، اردو کے ممتحنین کی دریا دلی نے اردو طلبہ کے معیار کو کچھ زیادہ ہی متاثر کیا ہے-

سوال:- ماہنامہ جامِ نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

ڈاکٹر صابر سنبھلی:- میں کیا اور میرا پیغام کیا؟ مگر آپ کے سوال سے آپ کی بیچارگی جھلکتی ہے، جو ہستیاں پیغام دینے کے اہل اور لائق ہیں ان کے انٹرویوز آپ چھاپتے ہیں، ایسے مزید صاحبانِ نظر تک اب آپ کی دسترس نہیں ہے، تبھی تو مجھ جیسے ادنیٰ قلم کار کو مخاطب بنایا ہے اور اس سے پیغام کے طلب گار ہیں، جو اس کا اہل نہیں، مگر میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا- سب سے پہلے تو قارئین جامِ نور کو میرا سلام پہنچا دیں، اس کے بعد عرض کرتا ہوں کہ مال، دولت، عزت اور شہرت پر ایمان کو ترجیح دیں اور ہر طرح اس کی حفاظت کریں، دوسری درخواست یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام حتی الامکان اردو میں کریں، اردو زبان کی بقا کا یہی طریقہ ہے، تیسری درخواست یہ ہے کہ میرے لیے دعائے خیر فرمائیں-□□□

(شمارہ جنوری ۲۰۰۶ء)

سید صبیح الدین صبیح رحمانی

مدیر: نعت رنگ، کراچی، پاکستان

نعتیہ ادب کی ترویج و اشاعت اور تحقیق و تنقید کے حوالے سے کراچی پاکستان کے معروف نعت گو، نعت خواں اور نعت پسند شاعر سید صبیح الدین صبیح رحمانی کا نام سب سے نمایاں ہے، جو ۱۹۹۵ء سے ''نعت رنگ'' کے ذریعے نعتیہ شاعری کے جداگانہ ادبی تشخص اور فنی حیثیت کو تسلیم کرانے کے لیے نہ صرف سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں، بلکہ مقصود تک رسائی کے لیے جو اسباب و ذرائع لازم تھے، ان کی طرف عملی پیش رفت بھی کر رہے ہیں۔ ''نعت رنگ'' اب محض ایک علمی و تحقیقی مجلہ نہیں رہا، رفتہ رفتہ یہ اردو دنیا کے ادیبوں، شاعروں، تحقیق کاروں اور ناقدین کا نیٹ ورک بن گیا ہے۔ سید صبیح الدین صبیح رحمانی کی ولادت ۱۹۶۵ء میں کراچی، پاکستان میں ہوئی، آپ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (سیاسیات) ہیں اور اس وقت Qtv میں بحیثیت ڈائرکٹر آف پروگرامنگ کام کر رہے ہیں۔ آپ نے دوران طالب علمی نویں کلاس سے ہی نعتیہ شاعری کا آغاز کر دیا تھا اور اب تک دو مجموعے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے ۱۹۹۵ء میں ''اقلیم نعت ریسرچ سینٹر'' کی بنیاد رکھی اور ''نعت رنگ'' کی اشاعت کا آغاز کیا ''اقلیم نعت ریسرچ سینٹر'' سے اب تک ''نعت رنگ'' کے ۲۱ شماروں کے علاوہ نعتیہ ادب پر تیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ نعتیہ کانفرنسوں میں شرکت کے لیے کنیڈا، دوبئی، سعودی عرب، وغیرہ ملکوں کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی نعتیہ شاعری پر تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، دو رسائل نے تو خصوصی نمبرات بھی شائع کیے ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں آپ پاکستان کے صدارتی ایوارڈ سے سرفراز ہوئے جب کہ اس سے قبل ۲۰۰۳ء میں حکومت کنیڈا اسے اعزازی ایوارڈ حاصل کیا۔

سوال:۔ ایک مومن کے لیے نعت کتنی اہمیت رکھتی ہے اور نعت کہنے کے لیے اس کے مذہبی اور فنی لوازم کیا ہیں؟

سید صبیح رحمانی:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایمان کا جوہر ہے، اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت کا اظہار، ایمان کے اظہار کا درجہ رکھتا ہے اور جہاں تک نعت کے فنی و شرعی لوازم کا تعلق ہے تو ایک نعت کہنے والے کے لیے دونوں سے واقف ہونا حد درجہ ضروری ہے، اس لیے کہ نعت ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو شریعت میں بھی نہایت محترم ہے اور اس میں ہم اپنے عقیدے کا اظہار بھی کرتے ہیں، ہماری تاریخ رہی ہے کہ جن نعت گو شعرا نے ان دونوں لوازم کو خوبصورتی سے برتا انہیں مقبولیت اور عزت ملی۔

سوال:۔ آج کل ہندو پاک میں اہل سنت کے مذہبی اسٹیجوں پر جو پیشہ ور نعت خواں نعتیں پڑھ رہے ہیں، ان کے انداز و اطوار، لحن و طرز اور انتخاب کلام کے تعلق سے آپ کیا کہیں گے؟

سید صبیح رحمانی:۔ دیکھیے! ہندوستان کے حالات کا تو مجھے علم نہیں ہے لیکن پاکستان میں نعت کے تعلق سے مذہبی اسٹیجوں میں کچھ انحطاط آیا ہے، آپ نے ابھی اپنے سوال میں لفظ ''پیشہ ور'' استعمال فرمایا ہے، وہ بہت توجہ طلب ہے، کیونکہ ہم جن نعت خوانوں کو اپنے اجلاس میں مدعو کرتے ہیں ظاہر ہے ان کے روزگار کی اور کوئی صورت رہ نہیں جاتی، وہ اپنی مقبولیت کے باعث دن رات اسی کام میں مصروف ہیں اس لیے ان کو اپنا روزگار بھی یہیں سے ہی حاصل کرنا پڑتا ہے، جہاں تک کلام، طرز اور انداز و اطوار کی بات ہے تو ایک بڑا طبقہ بے ادبی کا مرتکب ہو رہا ہے، نبی کی بارگاہ مقدس میں حاضری کے جو آداب ہیں وہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کے آداب ہیں، اپنے عقیدے کے مطابق ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھتے ہیں اس لیے ان کی بارگاہ میں نعت کا نذرانہ لیے اسی آداب و احترام کے ساتھ پیش ہونا چاہیے جس طرح کے آداب ہمیں قرآن نے سکھائے ہیں، لہٰذا جب ہم کوئی کلام کا انتخاب کرتے ہیں تو اس کے لب و لہجے میں بھی وہ

ادب ہونا چاہیے جو نعت کے لیے ضروری ہے اور اس کے ادا کرنے میں بھی وہ شائستگی اور طہارت ہونی چاہیے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بزم میں یا ان کے روضۂ اطہر پر حاضری کے وقت ہمارے انداز و اطوار میں ہوتی ہے- اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو ہمیں نعت جیسی عظیم صنف سے علیحدہ رہنا چاہیے- اب تو نعت خوانی میں بہت سی ایسی حرکات وسکنات داخل ہوگئی ہیں جسے آپ نوٹنکی سے تشبیہ دے سکتے ہیں، اب تو آپ عوام کے جذبات کو ابھارنے کے لیے اداکاری بھی کر رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ نعت کی بے ادبی ہے، اس سے ہمیں اجتناب کرنا چاہیے-

سوال:- آج جدید عہد میں ایک نعتیہ شاعر کا مستقبل کیا ہے؟

سید صبیح رحمانی:- اگر آپ نعتیہ شاعر کا مستقبل مذہبی حوالے سے پوچھ رہے ہیں تو اس کا مستقبل کل بھی روشن تھا اور آج بھی روشن ہے، کیونکہ اس نے ایک ایسے راستے پر قدم رکھا ہے جہاں نور ہی نور ہے اور روشنی ہی روشنی ہے لیکن اگر آپ ادبی زاویے سے پوچھ رہے ہیں تو نعت کا کوئی مستقبل ادبی طور پر تو اب تک تھا نہیں- آپ اردو ادب کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اس میں کسی بھی نعت گو شاعر کو کوئی بھی ادبی مقام نہیں دیا گیا، یہاں تک کہ امیر مینائی اور محسن کاکوروی کا جن کا ادب میں بطور نعت گو شعرا کے ہی ذکر ہوتا ہے، کوئی مقام و مرتبہ متعین نہیں کیا گیا- اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کو ہم اپنے اکابر نعت گو شعرا میں گردانتے اور مانتے ہیں اور بلاشبہ وہ ہیں بھی، مگر اس کے باوجود اردو ادب نے ان کو قبول نہیں کیا، اگر ہم ادبی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ان کے ذکر سے خالی ملتی ہے، مولانا حسرت موہانی نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''تذکرۃ الشعرا'' لکھی جس میں بڑے بڑے شعرا اور ادبا کا تذکرہ ملتا ہے لیکن اس میں بھی موصوف کا تذکرہ نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا کہ اس عہد میں ان کی ادبی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا یا اس وقت تک وہ بطور شاعر منوائے نہیں جاسکے، اس سے اعلیٰ حضرت کی ادبی حیثیت پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن ایک عظیم نعت گو شاعر کے تذکرے سے ادب کا دامن خالی ہونا ایک بہت بڑا المیہ ہے- اسی خیال کے پیش نظر ہم نے نعت کو تنقیدی رویوں سے آشنا کرنے کی کوشش کی تا کہ ادب میں اسے صنف کی حیثیت

حاصل ہو اور اس کا اعتبار قائم ہو-

سوال:- ''نعت رنگ'' جیسے منفرد اور روایت شکن جریدے کی اشاعت کا خیال کیسے دل میں آیا؟ نیز کب اور کن حالات میں آپ نے اسے نکالنا شروع کیا؟

سید صبیح رحمانی:- جس وقت میں نے نعت گوئی کو اختیار کیا اور یہ عزم کرلیا کے اب مجھے صرف نعت ہی کہنی ہے، نعت کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہنا، مگر اس کے ساتھ یہ خیال بھی بار بار آتا تھا کہ میں ابھی نعت کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہوں، اگر اس میدان میں آگے چل کر کچھ کر بھی لیا تو ادب کے کس خانے میں میں آسکوں گا؟ میری ادبی سطح پر بقا کیا ہوگی؟ کیونکہ ادب نے تو بطور نعت گو شاعر کسی کو تسلیم ہی نہیں کیا اور نہ ہی اس کا ذکر ملتا ہے تو ایک نئے آنے والے کے لیے اس صنف میں طبع آزمائی کے لیے کیا دلچسپی ہوگی؟ یہ بات مجھے بار بار پریشان کرتی تھی تو اس پر میں نے غور وفکر کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نعت گو شعرا کی تخلیقات کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھا نہیں جا رہا ہے اسی وجہ سے ان کا ادبی اور علمی مقام متعین نہیں ہو پا رہا ہے- اس خیال کے آتے ہی میں نے حکومت پاکستان کی جانب سے جو سالانہ سیرت پاک کا جلسہ ہوتا ہے، اس میں پاکستان کے نامور نعت گو شعرا کے سامنے جن میں پروفیسر حفیظ تائب مرحوم اور مظفر وارثی جیسے جید شعرا موجود تھے، یہ تجویز رکھی کہ ہمیں نعتیہ شاعری کو تنقید سے گزارنا چاہیے، اس پر حفیظ تائب صاحب نے کہا کہ اس میں خطرہ بہت ہے، ممکن ہے اس خوف سے لوگ نعت کہنے سے دور ہو جائیں یا اس میں مسالک کی جنگ شروع ہوجائے، میں نے کہا کہ نہیں، ان شاء اللہ ہم نہایت اخلاص کے ساتھ اس کام کو شروع کریں گے اور ان سبھوں سے بالاتر ہو کر کریں گے- یہ بات ہے ۱۹۹۴ء کی اور میں نے ۱۹۹۵ء میں ''نعت رنگ'' کا پہلا شمارہ ''تنقید نمبر'' کے نام سے شائع کیا، اس کے بعد سے الحمدللہ! اب تک ۱۷ شمارے منظر عام پر آچکے ہیں، ان شماروں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ہم نے صحیح سمت سفر شروع کیا اور منزل اب قریب نظر آتی ہے، جب نعت اور نعت گو شعرا کا اردو ادب میں اپنا ایک مقام ہوگا- نعت کے تعلق سے لوگ افراط وتفریط میں محتاط ہوئے ہیں اور نعت کے لسانی اور ادبی پہلوؤں پر غور کیا جا رہا ہے- آج ادب بھی ہم پر توجہ دے رہا

ہے، ادباءِ نعت گو شعرا اور نعت کو اہمیت دے رہے ہیں اور دنیا ہمیں دلچسپی سے پڑھ اور سن
رہی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہماری کامیابی ہے۔ یہ سفر اگر کامیابی کے ساتھ یونہی ہوتا رہا
تو ان شاء اللہ نعت ادب کی ایک توانا صنف ضرور تسلیم کر لی جائے گی۔

سوال:۔ ''نعت رنگ'' نکلنے کے بعد کیا اہل سنت کے مذہبی اور علمی حلقوں سے آپ
کو تعاون ملا؟

سید صبیح رحمانی:۔ یہ بڑا تکلیف دہ سوال ہے، دراصل اہل سنت کا جو پڑھا لکھا اور علمی
طبقہ ہے وہ بڑا محدود ہے، کیونکہ اس پوری جماعت نے ان کی پذیرائی نہیں کی، ظاہر ہے
جب پذیرائی نہیں ہوئی تو اس کی نشو ونما بھی نہ ہو سکی، لوگوں نے علمی سرگرمیوں میں دلچسپی لینا
ترک کر دیا اور جو علمی طبقہ ہے بھی تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس کا مسئلہ بھی ادب اور شاعری
ہو۔ رہی بات تعاون کی تو جہاں ہم سماج اور ادب کے تنقیدی رویوں پر گفتگو کرتے ہیں تو
بہت سے لوگ خوف فسادِ خلق کے باعث خاموش رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں، یہ ایسا معاشرہ
ہے کہ ہم کسی بھی ایسی بات میں پڑنے سے ڈرتے ہیں جہاں کوئی اعتراض ہو سکے، اس لیے
جب ہم نے ''نعت رنگ'' نکالنا شروع کیا تو بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، ابتداء میں
بہت سے لوگ تحفظات رکھتے تھے اور اب تک رکھتے ہیں، لیکن اس کے بعد الحمد للہ ایک نیا
طبقہ تیار ہوا جس نے کھل کر لکھنا شروع کیا۔

سوال:۔ میرا سوال اب تک ادھورا ہے کہ آپ کو اب تک اہل سنت سے کتنا تعاون
ملا؟

سید صبیح رحمانی:۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں میرے جریدے کے ساتھ جن
لوگوں نے علمی تعاون کیا ان میں سرفہرست مولانا ملک الظفر سہسرامی، پروفیسر طلحہ رضوی
برق، ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی اور ڈاکٹر شمیم گوھر وغیرہ ہیں جن لوگوں نے نعت رنگ کے لیے
کافی لکھا اور میری بہت مدد کی اور ظاہر ہے کہ یہ اہل سنت و جماعت کے نمائندہ افراد ہیں،
پاکستان میں جو علماء کا طبقہ ہے وہ شعری اور نثری ادب سے کافی دور ہے لیکن ان میں بھی دو
شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی، ان میں علامہ محمد عبد الحکیم شرف

قادری اور پیرزادہ اقبال احمد فاروقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنھوں نے بڑا تعاون کیا
اور نعت رنگ کو متعارف کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا، ان کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ
مولانا کوکب نورانی صاحب نے ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے والی تخلیقات کا اپنے خطوط
کے ذریعے علمی اور ادبی جائزہ پیش فرما کر ہزاروں افراد کو جریدے کی طرف متوجہ کیا۔ ان
کے علاوہ اگر آپ پوچھیں گے تو مجھے بے حد تکلیف کے ساتھ یہ بتانا پڑے گا کہ اہل سنت
کے حلقوں میں نہ تو لکھنے کا شوق ہے اور نہ پڑھنے کا جذبہ، پھر تعاون تو دور کی بات ہے۔

سوال:۔ اہل سنت کی کوئی بڑی شخصیت نے کبھی آپ کے منفرد کام کے حوالے سے
کوئی مثالی تعاون پیش کیا؟ کہ آپ ایک انوکھا کام کر رہے ہیں تو آپ کی پذیرائی ہونی
چاہیے؟

سید صبیح رحمانی:۔ اصل میں یہ تو آپ کہہ رہے ہیں کہ میں ایک منفرد کام کر رہا ہوں
لیکن ہمارے یہاں تو لوگ دو چار کلمات کہنے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں، چہ جائیکہ مالی
تعاون؟ میرے ساتھ پریشانی یہ تھی کہ میں نے اسے کسی ایک خاص مسلک کا ترجمان نہیں
بنایا ہے گو کہ میں اہل سنت و جماعت سے تعلق رکھتا ہوں مگر میں نے ''نعت رنگ'' کو مسلکی
چھاپ سے دور رکھا ہے، کیونکہ میرا موضوع نعت ہے اور نعت کو ہم بین المسالکی تناظر میں
دیکھتے ہیں، ہم نے اپنی بات دوسروں تک پہنچائی ہے اور ان کی باتیں ہم تک پہنچ رہی ہیں،
اس لیے ہم کسی نتیجے پر پہنچ رہے ہیں اور یہی نعت رنگ کی کامیابی بھی ہے اور زندگی بھی۔ اس
ضمن میں مجھے کسی قسم کا تعاون حاصل نہیں ہوا ہے اور نہ ہی مجھے اس کی شکایت ہے کیونکہ
تعاون کے بغیر بھی الحمد للہ! ''نعت رنگ'' چل رہا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے فضل سے
یہ کامیاب ہے۔

سوال:۔ اس کی مسلسل اشاعت کے بعد آپ کو عالمی سطح پر اپنے مقاصد میں کتنی
کامیابی ملی؟

سید صبیح رحمانی:۔ الحمد للہ! ''نعت رنگ'' کی پہلی اشاعت کے بعد پوری اردو دنیا نے
خواہ وہ مذہبی ہو یا ادبی اس کو نہایت سنجیدگی اور توجہ سے لیا، دونوں طبقوں میں ''نعت رنگ''

سے دلچسپی کا ہی نتیجہ ہے کہ اس کی نگارشات پر مشتمل کئی کتابیں الگ سے منظرِ عام پر آئیں جن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، پروفیسر شفقت رضوی صاحب نے نعت رنگ کے ۷ ارشماروں کا جوتنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے اس کی پذیرائی میں مزید اضافہ ہوا ہے اور اب الحمدللہ! نعت رنگ پر ایم فل کا مقالہ لکھا جا رہا ہے- آپ دنیا کے ان تمام حصوں میں چلے جائیں جہاں اردو بولی اور پڑھی جاتی ہے وہاں آپ کو نعت رنگ مل جائے گا، آپ کو جاپان میں اسلامک کلچرل سینٹر، مکہ میں ام القریٰ یونیورسٹی، ملیشیا، انڈونیشیا، بنگلہ دیش اور ہندستان میں آپ کو نعت رنگ ملے گا، ہمارے جہاں جہاں وسائل ہیں، کنیڈا، امریکہ، انگلینڈ اور ہالینڈ، وہاں ''نعت رنگ'' پہنچ رہا ہے اور اس کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعتیہ ادب کو جو بین الاقوامی سطح پر پھیلانے اور مقام دلانے کا ہمارا جو مقصد تھا وہ پورا ہو رہا ہے-

سوال :-''نعت رنگ'' کی کامیابی میں آپ کن لوگوں اور کن چیزوں کو اہم سمجھتے ہیں؟

سید صبیح رحمانی:-'نعت رنگ'' کی سب سے بڑی کامیابی اس کے بے لاگ تبصرے اور اس پر کسی خوف کا سایہ نہ ہونا، کیونکہ ہم اس فکر کے ساتھ کام کر رہے ہیں کہ ہمیں اس کے عوض کسی سے کچھ لینا نہیں ہے اور جب کسی سے کوئی توقع وابستہ نہیں ہوتی ہے تو انسان کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے، نعت رنگ کے سر پر دنیاوی طور پر کسی کا ہاتھ تو تھا نہیں اس لیے ہم نے بے باکانہ قدم بڑھایا، ہم نے وہی لکھا اور وہی چھاپا جو لکھنا اور چھاپنا چاہتے تھے، جو سچ تھا اسے پیش کر دیا، اس پر بہت سے لوگوں کو اعتراضات بھی ہوئے، اس طرح کے کاموں میں اعتراضات ہوتے بھی ہیں مگر ساتھ ہی قبولیت کی صورت بھی ہوتی ہے اور قبولیت کی صورت اللہ کے فضل سے زیادہ ہے، میں اپنے کام سے بہت مطمئن ہوں-

سوال :-مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ نعت کا سب سے اہم پہلو کون سا ہے؟ کیا اس کے بے لاگ تبصرے ہیں؟ یا پھر کچھ اور؟

سید صبیح رحمانی:- دیکھیے! نعت رنگ کوئی پہلا جریدہ نہیں ہے جو نعت پر کام کر رہا ہے

بلکہ اس سے پہلے بھی بہت سے رسائل وجرائد تھے جو اپنے طور پر کام کر رہے تھے، مگر ہمارا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نعت کا ادبی فروغ ہو، اس سے پہلے نعت پر جتنے بھی رسائل نکلے یا نعت نمبرز شائع ہوئے، ان میں صرف نعت کا فروغ تھا، ہم نے نعت کے ادبی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے اس کو تنقیدی رویوں سے گزارنے کا عمل شروع کیا اور نعت کے شرعی حدود اجاگر کرنے کے لیے پیمانہ بنایا اور ظاہر ہے اس عمل کے لیے سچائی کے ساتھ لکھنے کی بہت ضرورت تھی اس لیے ہم نے اس کو مسلکی چھاپ سے بھی دور رکھا- ہم اپنی زندگی میں بہت سی چیزوں اور کمیوں کو محسوس کرتے ہیں مگر اس کے اظہار کے لیے جس جرأت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت مشکل ہوتی ہے- ہم بہت سے مسائل کے بارے میں سوچتے ہیں کہ یہ غلط ہو رہا ہے، مگر اس کو کھل کر لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، نعت رنگ نے الحمدللہ! اس تنقیدی رویوں کو عام کیا، ایک زمانے میں لوگ جن مسائل کو سننا نہیں چاہتے تھے آج الحمدللہ! اس کو سن رہے ہیں اور برداشت بھی کر رہے ہیں- شاید نعت رنگ کا یہی اہم پہلو ہے-

سوال:- اچھا! آپ بار بار ذکر کر رہے ہیں کہ ہم نے اس کو مسلکی چھاپ سے دور رکھا ہے، یہ ایک ایسا فورم ہے جہاں ہر ایک مسلک کا آدمی نعت کے حوالے سے اپنی بات کہہ سکتا ہے، اگر آپ اس کو خالص مسلک اہل سنت و جماعت کے لیے ہی رکھتے تو کیا نقصان ہوتا؟

سید صبیح رحمانی:- دیکھیے! نعت کے حوالے سے جب بھی گفتگو ہوگی تو خواہ اس پر مختلف مسالک کے لوگوں نے لکھا ہو مگر جو سب سے اہم اور نمایاں نام سامنے آئے گا وہ مسلک اہل سنت و جماعت کا ہی ہوگا، کیونکہ حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کے اظہار کی جتنی شدت اور صورتیں آپ کو یہاں ملیں گی اور کہیں بھی نہیں مل سکتیں یا جتنا والہانہ انداز آپ کو یہاں ملے گا وہ دوسری جگہ نہیں مل سکتا، لیکن نعت رنگ ایک نعتیہ ادب کا رسالہ ہے اس پر ہم مسلکی قید و بند نہیں لگا سکتے، اب مثال کے طور پر اہل تشیع حضرات نے بھی نعتیں لکھی ہیں، ہمیں ان کے عقائد و معمولات سے تو انکار ہو سکتا ہے مگر جو نعتیں لکھی ہیں ان

کےفنی،لسانی اورادبی پہلوؤں پرتو بہرحال گفتگو کی جائے گی،کیونکہ ہمارامسئلہ تو نعت ہے،
ہاں!یہ اور بات ہے کہ نعت کہنے والے ۸۰ فیصد افراد اہل سنت و جماعت ہی سے تعلق رکھتے
ہیں،اب اس کی بنیاد پر یہ کہنا کہ یہ اہل سنت کا پرچہ نہیں ہے، یہ صحیح نہیں ہے، حالانکہ آپ
دیکھیں تو حلقۂ اہل سنت کے جید علماء اس تحریک کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، آپ مولانا
کوکب نورانی صاحب کو ہی لے لیں، آج جس طرح انہوں نے نعت رنگ کی نگارشات کا
علمی اور فنی محاسبہ کیا ہے اس سے اہل سنت کا علمی وفکری قد اونچا ہوا ہے، اگر ہم اس کو خالص
مسلکی ترجمان بنادیتے تو اپنی بات دوسروں تک نہیں پہنچا پاتے اور نہ ہی ہمیں اپنے مقصد
میں اتنی کامیابی ملتی، ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہم اپنی باتیں اور عقائد دوسروں تک پہنچا
رہے ہیں، اگر ہم اپنے ہی گھر میں لکھتے اور پڑھ کر خوش ہوتے تو کیا فائدہ ہوتا؟ آپ نے
ان کو اپنے پلیٹ فارم پر دعوت دے کر اپنے نظریات کو ان کے سامنے رکھنے کے لیے راستہ
ہموار کرلیا اور دعوت وتبلیغ کا صحیح منہج بھی تو یہی ہے، مجھے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی
ہے کہ جب آپ ان سے ہاتھ ملانے کے ہی روادار نہیں تو پھر آخر اسلام اور سنیت کا پیغام
ان تک کس طرح پہنچائیں گے؟ لیکن اس کے باوجود اگر کہیں سے اعتراضات آتے ہیں تو
یہی ہیں، ہمارے یہاں تحمل، برداشت کا مادہ نہیں ہے، ہم اپنے فن پاروں پر تنقید برداشت
نہیں کر پاتے، اگر آپ نے پچاس غزلیں لکھیں ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ مجھے پچاسوں
پسند آئیں، ان میں سے مجھے دو پسند نہیں ہے تو مجھے حق بنتا ہے کہ میں اگر اڑتالیس غزلوں کی
تعریف کروں تو دو پر تنقید بھی کروں کیونکہ آپ نے عوام کے لیے لکھا ہے، اس لیے آپ کو
دونوں پہلوؤں کو سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے، اگر آپ ایسا نہیں کر پاتے تو آپ کو انہیں
شائع کرنے کا حق نہیں پہنچتا-

سوال:-مثبت تنقید کو آپ ادب، صحافت اور معاشرے کی ترقی کے لیے کتنا
ضروری سمجھتے ہیں؟

سید صبیح رحمانی:-دیکھیے! تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ آپ کو کھوٹے اور کھرے کی پہچان
کراتی ہے اور اچھے اور برے کی تمیز کراتی ہے، یہ کسی بھی سطح پر ہو خواہ وہ ادب میں ہو،

صحافت میں شاعری میں یا پھر زندگی میں، اسی کے ذریعے آپ اپنی زندگی میں یہ فیصلے
کر پائیں گے کہ مجھے کیا اختیار کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے، تنقید کے بغیر تو میں سمجھتا ہوں کہ
زندگی جنگل بن کر رہ جائے گی- آپ یہی دیکھیے کہ سب سے بڑا نقاد انسان خود اپنی تخلیق کا
ہوتا ہے، جب وہ اپنی نگارش کا ایک لفظ ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ رہا ہوتا ہے تو یہ عمل کیا
ہوتا ہے؟ شعر کہتے ہوئے ہم لفظوں کا ردوبدل کرتے ہیں، مضمون لکھتے ہوئے پوری پوری
لائن کاٹ کر اس کی جگہ دوسری لائن لکھتے ہیں، یہ عمل کیا ہے؟ یہی تو تنقید ہے؟ اور میرا خیال
ہے کہ یہ سب سے زیادہ مثبت عمل ہے-

سوال:-''نعت رنگ'' میں شعروسخن کے تعلق سے اکابر اور معاصر شعرا کے کلام پر
تنقیدیں ہوتی ہیں اور ان کے فنی ولسانی معیار پر بھی لکھا جاتا ہے، اسے اہل سنت کے افراد
اور آپ کے عام قارئین کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

سید صبیح رحمانی:-اس معاملے میں اہل سنت و جماعت اور دیگر مکاتب فکر کے مذہبی
حلقوں کا تقریباً ایک ہی رویہ رہا ہے، ہمارے یہاں مذہبی ادب میں نہ تو تنقید ہوئی ہے اور
نہ ہی ہم نے اسے برداشت کیا ہے، اگر کسی نے تنقید کی بھی تو وہ تنقید نہیں رہی بلکہ تنقیص تھی
جس کا مقصد تھا کہ دوسروں کو نیچا دکھایا جائے-

سوال:-میرا خیال ہے کہ بات ادھوری رہ گئی ہے، میں نے پوچھا تھا کہ اکابر کی
تخلیقات پر ''نعت رنگ'' کے تنقیدی رویوں کو اہل سنت کے افراد اور آپ کے قارئین کس
نظر سے دیکھتے ہیں؟

سید صبیح رحمانی:-تنقید کو کوئی بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، اس کی اہمیت سب سمجھتے ہیں
، تنقید دوسروں پر ہو رہی ہے تو سبھوں کو اچھی لگتی ہے مگر خود پر ہو رہی ہو تو ایک لفظ برداشت
نہیں کرتے، اس میں سبھوں کا معاملہ ایک جیسا ہے، لیکن ہمیں نفس پرستی سے تھوڑی دیر
الگ رہ کر یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کس کی بارگاہ میں حاضر ہو رہے ہیں اور کس کے سامنے اپنا
کلام پیش کر رہے ہیں، کیونکہ یہ کوشش تو انسانی ہے اسی لیے اس میں عیب کا باقی رہنا عین
ممکن ہے مگر ہمیں اپنے طور پر پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارا کلام حتی الامکان عیوب سے

پاک ہو، ان ظاہری عیوب سے کلام کو پاک کرنے کے لیے ہی ان کو تنقیدی عمل سے گزارا جاتا ہے اور لکھنے والے میں اچھائی اور برائی کا شعور پیدا کیا جاتا ہے تاکہ دوبارہ وہ غلطیاں نہ رہ جائیں-

سوال:- عالمی پیانے پر آپ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی نعتیہ شاعری پر ایک نہایت منفرد ضخیم ادبی نمبر نکالنے جارہے ہیں، اس کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس کی تیاریوں میں آپ کو کن دشواریوں کا سامنا ہے؟

سید صبیح رحمانی:- اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کی نعتیہ شاعری ہمارے یہاں عوام میں اتنی مقبول اور اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ کسی دوسرے نعت گو شاعر کو اردو میں وہ مقبولیت اور عظمت حاصل نہیں ہوئی ہے، لہٰذا مقبولیت کے حوالے سے مولانا نمائندہ شعرا میں فرد واحد ہیں، ایسے شاعر کے بارے میں اب تک جو کچھ بھی گفتگو ہوئی یا جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ بہت رسمی انداز میں- ان سے عقیدت رکھنے والوں نے اب تک جو کچھ بھی لکھا ہے، میں سمجھتا ہوں وہ ادب نہیں ہے بلکہ عقیدت ہے، ان سے عقیدت ہونی بھی چاہیے کیونکہ جب ہم ان کو ان کے مجموعی کام کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ان سے محبت بڑھ جاتی ہے، مگر جب ہم کسی فن پارے کو ادبی اور فنی کسوٹی پر پرکھتے ہیں تو یہ اس فن پارے کے ساتھ انصاف ہوتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں جو کچھ سمجھ رہے ہیں وہ صحیح طور پر لکھیں، اس تناظر میں میں سمجھتا ہوں کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب پر کام کرنے والوں پر ایک خوف کا سایہ ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری کو اگر ہم تنقیدی رویوں سے گزاریں گے تو ہمارے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا، جب کہ میرا خیال یہ ہے کہ اس تاثر کو ختم کرنا چاہیے- دیکھیے! غالب اردو کا ایک عظیم شاعر ہے، اگر اس کے حق میں دو سو کتابیں لکھی گئیں ہیں تو اس کے فن کے خلاف بھی دو سو کتابیں وجود میں آئی ہیں مگر شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کے قد پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ تنقیدی کسوٹی سے گزر کر اس کی شاعری دن بدن فن کے نئے پہلوؤں سے ہمیں آشنا کر رہی ہے- اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب کی شاعری اتنی بڑی، اتنی وقیع اور مقبول ہے کہ ان کے سر سے کلام کی مقبولیت اور عظمت کا تاج اب کوئی چھین نہیں

سکتا، لیکن مولانا کی شاعری پر کھل کر گفتگو نہ کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ اب تک ان کا کوئی ادبی مقام متعین نہ ہوسکا، میں نے اس سے قبل اپنے عہد کی معتبر اور موثر کتاب ''تذکرۃ الشعرا'' کا ذکر کیا کہ مولانا حسرت موہانی نے اپنی اس کتاب میں بھی فاضل بریلوی کا تذکرہ نہیں کیا، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی وہابی یا کچھ اور تھے، اگر ایسا ہوتا تو ان کے چھوٹے بھائی مولانا حسن رضا خاں کا تذکرہ وہ اپنی اس کتاب میں کیوں کرتے؟ ایسے میں اب ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم مولانا کو ادبی سطح پر اس طرح پیش ہی نہیں کرسکے جس طرح مولانا کی شاعری کا حق ہے، ہم نعت رنگ کے اس نمبر کے ذریعے مولانا کی نعتیہ شاعری کی ادبی حیثیت کو متعین کرانے کی کوشش کررہے ہیں اور ان شاءاللہ اس کے بہت اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور ان کی نعتیہ شاعری پر ادب کی مختلف جہتوں سے کام کرنے کے امکانات روشن ہوں گے- (ان شاءاللہ)

سوال:- اس کی تیاریوں میں آپ کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے؟

سید صبیح رحمانی:- اس کی تیاری میں مجھے دشواریاں ہی دشواریاں آرہی ہیں، میں یہ سمجھتا تھا کہ مولانا کی نعتیہ شاعری پر جب میں نمبر مرتب کرنے کے لیے بیٹھوں گا تو بے شمار قلمی تعاون مجھے ملے گا، مگر عام افراد تو الگ رہے پاکستان میں ان کے نام سے چلنے والے معروف اداروں نے بھی اس سلسلے میں میرا کوئی قابل ذکر تعاون نہیں کیا، بلکہ اس کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی، اس کے پیچھے کیا عوامل تھے وہ مجھے نہیں معلوم کہ خوف ہے، تعصب ہے یا پھر عدم دلچسپی، لیکن مجھے ان کی شاعری سے دلچسپی ہے اس لیے ان کے کلام کی عظمت کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ ان کا ادبی مقام متعین ہو، اس لیے اپنی نوعیت کا یہ منفرد نمبر مرتب کررہا ہوں-

سوال:- ہندوستان اور پاکستان کے مابین آپ نعت گوئی میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

سید صبیح رحمانی:- میرے پاس ہندوستان سے بہت ساری نعتیں ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے کے لیے آتی ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہاں کے شعرا نعت

کوشعوری طور پر ادب کی ایک صنف سمجھ کر نہیں لکھتے، شخصی جذب و کیف کا اثر تو وہاں کی نعت
میں ہے، مگر ملی و معاشرتی مسائل، استغاثے کا پہلو اور سائنسی تجربات، لفظیات اور افکار
کے نئے پہلوؤں کی روشنی وہاں کی نعتیہ شاعری میں نظر نہیں آتی، جب کہ پاکستان میں ادب
کی طرح آپ ان کو اپنے اپنے لہجوں سے ان کے نعتیہ کلام کو پہچان سکتے ہیں- آپ پروفیسر
حفیظ تائب اور مظفر وارثی یا دیگر بڑے شعرا کے شعر کو ایک ہزار اشعار میں ملا کر رکھ دیں مگر
وہ بتائے گا کہ میں حفیظ تائب یا مظفر وارثی کا ڈکشن ہوں جو اپنے اپنے لفظیات سے پہچانے
جاتے ہیں- ہندوستان سے ہمارے پاس مختلف شعرا کی نعتیں آتی ہیں، وہ کم و بیش ایک ہی
لب و لہجے کی شاعری ہوتی ہے جس سے لگتا ہے کہ وہاں کی نعتیہ شاعری ایک جگہ ٹھہر گئی ہے
اور اس میں وہ کوئی نیا تجربہ نہیں کر پائے یا کوئی ایک خاص طبقہ ہی ہے جو نعتیں کہہ رہا ہے اور
ادب کا طبقہ اس سے دور ہے، وہ ہم تک نہیں پہنچ پا رہے ہیں یا ہم ان تک نہیں پہنچ پا رہے
ہیں، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہاں کے ادباء یا ادب کی فضا میں جو لوگ رہتے
ہیں ان کی نعتیں ہمارے سامنے آئیں تب جا کر نعت میں تجربات کا عمل شروع ہوگا جو مذہبی
حلقے کی نعتیں ہیں وہ ایک خاص اور پرانی روایت کے زیر اثر ہیں-

سوال :- اخیر میں ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کی جانب سے
کوئی پیغام؟

سید صبیح رحمانی:- میں ہندوستان و پاکستان کے بے شمار رسائل و جرائد کو دیکھتا ہوں،
انہیں دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے کہ بڑے بڑے علماء و مشائخ کی زیر نگرانی نکلنے والے
رسائل کا حال اچھا نہیں ہے، عصری مسائل سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہے، عالم اسلام کے کیا
مسائل ہیں، ملت کو صحیح نہج پر چلانے کے لیے کس طرح کے مضامین اور تحریروں کی ضرورت
ہے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا ہے- پہلی بار ماہنامہ ''جام نور'' کو جب دیکھا تو حیرت زدہ رہ
گیا، خاص طور پر جب میں نے آپ کا ''جہاد نمبر'' دیکھا تو دیکھتا رہ گیا، یقین جانیں اس
جماعت سے مجھے اس قسم کی توقع ہی نہیں تھی کہ یہ جہاد جیسے سلگتے ہوئے موضوع کی طرف بھی
آ سکتی ہے- آپ کا یہ پرچہ میری مطالعاتی زندگی میں ایک انقلابی موڑ بن کر آیا، مجھے حیرت

ہے کہ آپ نے ایسے ایسے موضوعات کو اپنے قلم کے ذریعے چھیڑا ہے جن کو ہم بند کمروں
میں بھی کہتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم پر دیو بندیت کی مہر نہ لگ جائے، کیونکہ ہماری
جماعت نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہم اپنے ہر پڑھے لکھے آدمی کو دیو بندی بنا کر ہی چھوڑیں
گے، اس لیے آپ کی جرأت کو میں سلام پیش کرتا ہوں- مجھے یقین ہے کہ آپ کی انقلابی
تحریروں سے جب یہ طبقہ جاگے گا تو بہت بڑے بڑے کام ہوں گے کیونکہ ان میں صلاحیت
بہت ہے، کیونکہ یہ حق پر ہے اور یہ جب بھی کام کرنے کے لیے اٹھے گا تو بہت سلیقے سے
کرے گا- آپ یونہی کام کرتے رہیں، الحمدللہ! اب اہل سنت میں فکری انقلاب کی آہٹ
محسوس کی جا رہی ہے- اس کے علاوہ میری رائے میں آپ کو بھی پاکستان کی طرح
ہندوستان میں نعت ریسرچ سینٹر قائم کرنا چاہیے تاکہ وہاں بھی نعت کے حوالے سے
ہمارے شعرا کا شعور بیدار رہو اور وہ اس میں نئے نئے تجربات کریں، یہ کام آپ ڈاکٹر فضل
الرحمٰن شرر مصباحی اور مولانا ملک الظفر سہسرامی جیسے افراد کی مدد سے کر سکتے ہیں، ہندوستان
میں نعتیہ ادب کے حوالے سے کتابیں بھی میسر نہیں ہیں، ان پر بھی کام ہونا چاہیے-□□□

(شمارہ مئی ۲۰۰۵ء)

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق

سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ (بہار)

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق چشتی خانقاہی روایتوں کے امین، اردو اور فارسی ادب پر گہری نگاہ رکھنے والے بزرگ ادیب، ایک سخن ور اور ایک پختہ فکر شاعر ہیں- ادب اور تدریس کے ساتھ ساتھ آپ کا تعلق تصوف اور بحیثیت سجادہ نشین ایک موقر خانقاہ سے بھی ہے، جس خانقاہ کی بنیاد دانا پور، پٹنہ میں آپ کے جد اعلیٰ حضرت سید شاہ مبارک حسین جاجنیری نے ۱۷۴۵ء میں رکھی تھی- آپ کی ولادت دسمبر ۱۹۳۸ء میں آپ کے ننھال پھلواری شریف میں ہوئی- آپ کے والد مولانا سید محمد قائم رضوی قتیل دانا پوری فارسی و اردو کے شاعر اور انگریزی زبان اور بائبل پر دسترس رکھنے والے ایک معروف عالم تھے، آپ کی فارسی، اردو اور انگریزی میں درجنوں قابل قدر تصنیفات اور دواوین ہیں- پروفیسر طلحہ رضوی برق کی ابتدائی مذہبی اور عصری تعلیم اپنے وطن دانا پور میں ہی ہوئی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے پٹنہ یونیورسٹی میں داخل کیے گئے جہاں سے آپ نے اردو اور فارسی میں بی اے اور ایم اے کیا، اس کے بعد اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور پھر فارسی زبان میں ''صوفیۂ فارسی گویان بہار بالخصوص سجادہ نشینان و اہل خانقاہ'' کے عنوان سے D.Lit کا مقالہ لکھا، جس پر ایرانی حکومت نے آپ کو ایران مدعو کیا جہاں آپ نے ایک ماہ قیام فرما کر کئی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اعزازی لکچرز دیے- اب تک فارسی و اردو میں آپ کی متعدد تصنیفات اور تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''اردو میں نعتیہ شاعری'' قابل ذکر ہے، جو برصغیر میں نعتیہ ادب پر پہلی مستقل کتاب تسلیم کی گئی ہے- اس کے علاوہ ''نقد و بخشش'' کے نام سے غزلوں کا مجموعہ اور ''شہاب سخن'' کے نام سے رباعیوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکے ہیں-

سوال: - پچھلی کئی دہائیوں سے آپ اردو ادب کی تحریری و تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، آپ کی نظر میں آج اردو بحیثیت زبان معاشرے میں کس مقام پر کھڑی ہے؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق: - زبان کا جو اپنا مقام ہوتا ہے وہ من حیث زبان ہے ہی لیکن عوام میں اس کی مقبولیت میں بڑی نمایاں کمی ہوئی ہے- مقبولیت میں کمی کا سبب عدم واقفیت ہے- وہ خانوادے جس کے سربراہان اردو درس و تدریس میں مستقل لگے رہے- ان کے گھروں سے اردو اپنی چٹائی لپیٹ رہی ہے- ان کے بچوں کی مادری زبان اگر چہ اردو ہے، لیکن میں یہ کہوں کہ ان کی مادری زبان اب ہندی ہوتی جارہی ہے- وہ ہندی ہی میں سب کچھ پڑھ رہے ہیں، نیز انگلش میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کا جو رواج شروع ہو گیا ہے، اس نے اردو کو بہت نقصان پہنچایا ہے- اردو کی کتابیں بہت چھپ رہی ہیں، فروخت بھی ہو رہی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس میں صرف نمود و نمائش کو دخل ہے- لوگ پڑھ نہیں رہے ہیں اور جو ریڈنگ کلچر ہے وہ کلچر تو نئی نسل سے بالکل رخصت ہے- وہ اس وقت اردو کی ابتدائی کتابوں سے ناواقف ہیں- چہ جائیکہ ایسی اخلاق آموز اور نصیحت آموز کتابیں جو ہم لوگ فارسی میں پڑھتے تھے انہیں پڑھیں- اردو مادری زبان ہوتے ہوئے اس کی ادبی کتابیں پڑھنے سے پہلے ہی ہم لوگ گلستاں، بوستاں وغیرہ پڑھ لیتے تھے اور اس کے اشعار از بر ہوا کرتے تھے جس کا کردار و شخصیت پر اچھا اثر پڑتا تھا- یہ تمام قدریں اردو کی اس وقت کی کتابوں میں ناپید ہوتی جارہی ہیں اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ ذوق ہی نہیں رہا اور اردو جاننے والے لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ اساتذہ جن کی اردو پڑھانے کے لیے تقرری ہو رہی ہے اور جس طور پر ہو رہی ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، ان کا شین قاف درست نہیں ہے اور ان کی تحریر! وہ خود شرماتے ہیں لکھتے ہوئے الا ماشاء اللہ کہ جن کو اللہ نے یہ ذوق ودیعت فرمایا ہے، وہ مضمون بھی لکھ رہے ہیں، شاعری بھی کر رہے ہیں، مضامین ان کے چھپ بھی رہے ہیں، لیکن عملاً اردو سے بڑی دوری بڑھتی چلی جارہی

ہے-آپ کو بتاؤں کہ ایک بار میں ایک مسجد میں گیا، وہاں گوشوارہ آمد وخرچ ہندی زبان میں آویزاں تھا، میں نے وہاں کے مصلیوں سے پوچھا کہ ارے بھئی ! آپ جب ہر چیز ہندی میں پڑھ رہے ہیں اور ابجد سے ناواقف ہیں تو ناظرہ اور قرآن کیسے پڑھیں گے؟ اور جب قرآن اور آیت کریمہ آپ کو یاد نہ ہوگی تو نماز کیسے پڑھیں گے-لہٰذا اردو کی تعلیم کا تعلق صرف تہذیب وثقافت ہی سے نہیں بلکہ میرے دین و مذہب سے بھی ہے-

سوال :-غالباً نعتیہ ادب پر برصغیر میں سب سے پہلی کتاب لکھنے والے آپ ہی ہیں، اگر یہ صحیح ہے تو آپ ہمیں بتائیں کہ کب اور کیسے آپ اس طرف متوجہ ہوئے؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:- یہ بات ۳۵/سال پہلے کی ہے، جب جام نور کلکتہ سے نکل رہا تھا- حضرت علامہ ارشد القادری مجھے بے حد چاہتے تھے- میرے اباجان حضرت قتیل داناپوری سے ان کے گہرے تعلقات تھے- پٹنہ میں جب ادارۂ شرعیہ کا قیام عمل میں آیا تو میں اکثر و بیشتر حضرت علامہ کی خدمت میں رہتا تھا- انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ اردو میں نعتیہ شاعری پر کوئی مضمون لکھوں- میں نے ایک مضمون لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے اسے جام نور کلکتہ میں شائع کیا- اس وقت میرے لکچر رشپ کو کئی سال گزر چکے تھے اور ریڈر شپ کی امیدواری میرے ساتھ بھی تھی- میں ریڈر شپ کے لیے درخواست دے چکا تھا- اس میں ایک شرط یہ تھی کہ ریڈر شپ اسی کو ملے گی جو صاحب تصنیف ہو، اس وقت میرے پاس کوئی تصنیف نہیں تھی- میں نے جلدی جلدی اسی مضمون کو کچھ مفصل کرتے ہوئے ایک سو صفحات کی کتاب بنا کر اسے شائع کر دیا- اللہ کا شکر ہے کہ اس کتاب کو ان لوگوں نے تسلیم کیا اور ریڈر شپ کے لیے مجھے منتخب کر لیا- اس طرح یہ کتاب چھپ گئی، حالانکہ اس موضوع پر یہ ایک تشنہ کتاب ہے- ضرورت ہے کہ ہم اس پر مزید نظر ثانی کے بعد اسے مزید مواد اور ضخامت کے ساتھ پیش کریں-

سوال:- گویا اس کتاب نے آپ کو ریڈر شپ تک پہنچانے میں بڑی مدد کی؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:- بالکل ! ابھی حال ہی میں ''نعت رنگ'' پاکستان میں ایک بحث چھڑی کہ نعتیہ ادب میں سب سے پہلی کتاب کون سی ہے؟ دراصل ڈاکٹر فرمان فتح

پوری نے بھی اسی نام سے ایک کتاب چھاپی تھی اور غالباً وہ بھی ۱۹۷۶ء میں چھپی تھی- بحث چلی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب اور دو تین اور لکھنے والے ہیں انہوں نے کہا کہ نہیں، اس کتاب پر اولیت کا سہرا طلحہ برق کی کتاب کو ہی جائے گا، اس لیے کہ انہوں نے اس میں مہینہ بھی دیا ہے یعنی جنوری ۱۹۷۶ء، مان لیا کہ ان کی کتاب بھی ۷۶ء میں چھپی ہے لیکن کوئی مہینہ اس میں نہیں دیا گیا ہے- اس لیے متفقہ طور پر اس کو تسلیم کر لیا گیا- اور جو کچھ بھی میری خامہ فرسائی رہی اس عنوان پر وہ رسائل و جرائد میں چھپتی رہی- اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری پر میرا مضمون اسی زمانہ ۷۳-۱۹۷۲ء میں چھپا اور امام احمد رضا نمبر میں شائع ہوا- اس کو لوگوں نے پسند بھی کیا- چونکہ ذوق تھا اور دل لگا کر میں نے لکھا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں بھی کامیابی عطا فرمائی- نعتیں بھی لکھتا ہوں، نعتیں چھپتی بھی ہیں-

سوال :- کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد دنیائے ادب سے آپ کو کیسے تأثرات ملے اور اردو ادب پر اس کتاب کا کتنا اثر مرتب ہوا؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:- یہ کتاب یوں سمجھئے کہ میری پہلی کتاب تھی- ہم نے بڑے دل سے بہت اچھے انداز میں اسے چھپوایا تھا- ساڑھے سات سو کتابیں شائع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر اس کی مانگ بڑھی کہ وہ ساری کتابیں ختم ہوگئیں- کچھ کتابیں پاکستان بھی گئیں- ہندوستان میں دیگر یونیورسٹیوں میں جو اس موضوع پر کام کر رہے تھے وہ Reference کے طور پر مجھ سے یہ کتاب طلب کر رہے تھے- اب یہ کتاب گویا ختم ہو چکی ہے- خدا کرے اس کا دوسرا ایڈیشن اضافہ کے ساتھ آجائے-

سوال:- پاکستان میں اردو ادب کے درمیان نعت پاک کو صنف سخن کی حیثیت دلوانے کے لیے کئی رسائل و جرائد نہایت اہم کردار ادا کر رہے ہیں، جن میں ''نعت رنگ'' اور ''سفیر نعت'' وغیرہ قابل ذکر ہیں، مگر اب تک ہندوستان میں اس طرح کی پیش قدمی نہیں ہوئی ہے- آپ کے نزدیک کیا وجوہات ہوسکتی ہیں؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:- اصلاً نعت پر ابتداء جو کام ہوا وہ ہندوستان ہی میں ہوا- اور ڈاکٹر نعیم صاحب نے نعت پر پہلی تھیسس ناگپور یونیورسٹی سے داخل کروائی اور اس پر ان

کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی- گویا نعتیہ ادب کی جانب پہلا قدم ہندوستان میں اٹھایا گیا- پاکستان میں تو یہ سب بعد میں ہوا، لیکن اس زور و شور اور اس شان سے ہوا کہ آج آپ کے سامنے ہے- یہاں کچھ سرد مہری اردو کتابوں کی طباعت پر آنے والے خرچ کی وجہ سے ہوئی- کوئی ایسا بڑا مکتبہ نہیں ہے جو مشن کے طور پر اس کام کو لے کر آگے بڑھے- اس لیے انفرادی طور پر چونکہ خسارہ کا سودا نظر آتا ہے اس لیے کسی نے یہ کام نہیں کیا، لیکن بعض رسائل جیسے ''الکوثر'' ''سہسرام'' جام نور دہلی'' ''اشرفیہ'' مبارک پور ہے، یہ وہ رسائل ہیں جنہوں نے نعت کے اوپر بہت سے مضامین چھاپے ہیں، المیزان نے بھی چھاپا ہے، لیکن منظّم طور پر مشن بنا کر جو وہاں ہو رہا ہے یہاں نہیں ہو سکا ہے- یقیناً وہ باعث تقلید ہے، یہاں ہونا چاہیے-

سوال:- گویا اجتماعی اور منظّم کام نہ ہونا ہی اس کی بنیادی وجہ ہے؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:- میرا تو خیال ایسا ہی ہے، اس لیے کہ میرے پاس جو چیزیں ہیں میں اپنے طور پر اسے چھپوانا چاہوں تو ایک سرمایہ کی ضرورت ہوگی، مجھے کوئی ایسا ناشر نہیں ملتا جو اپنا پیسہ لگا کر اس کو شائع کرے یا میری تساہلی ہے کہ میری رسائی ان لوگوں تک نہیں ہوئی-

سوال:- اس کے لیے آپ مذہبی رجحانات رکھنے والے اردو کے ادبا و شعرا کو کتنا ذمہ دار مانتے ہیں؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:- مذہبی رجحانات رکھنے والے پروفیسرز، ریڈرز، ادبا، سبھی ہیں، لیکن جو ماحول اس وقت سیکولر بنا ہوا ہے اس نے دینی اور مذہبی ذہنیت رکھنے والے ادیبوں اور قلم کاروں کو بہت نقصان پہنچایا ہے- اب کلاس اور نصاب میں نعتیہ ادب پر کوئی توجہ نہیں رہی ہے- جیسا آپ نے ابھی فرمایا کہ نعت کو ایک صنف سخن کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے یا نہیں اور نعت کو اگر ایک صنف سخن مانا جائے تو اس کا پیرائے اظہار کیا ہوگا؟ اس کے لیے ایک خاص ہیئت ہونی چاہیے، جیسے غزل کی ہیئت ہے، قصیدہ کی ہیئت ہے، مثنوی کی ہیئت ہے- تو میں عرض کروں گا کہ نعت جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و

ستائش کا نام ہے تو جس پیرائے میں کہیئے گا وہ نعت ہوگی- چاہے وہ غزل کے پیرائے میں ہو یا مثنوی کے پیرائے میں اور قصیدہ تو بہر حال ہے ہی- رباعی اگر آپ کہتے ہیں تو ہے تو وہ رباعی مگر نعتیہ رباعی ہوگی، اس لیے کہ صنف نعت بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے اور سارے اصناف سخن کی جتنی ہیئتیں ہیں سب پر وہ حاوی ہے-

سوال:- ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک اور مشن اگر اردو کے شعرا اور ادبا چلاتے ہیں تو ان کو کامیابی ملتی ہے، کیونکہ ان کے تعلقات اور مراسم کافی وسیع ہوتے ہیں- مثلاً ''نعت رنگ'' ہی ہمارے سامنے ہے- ''نعت رنگ'' کے مدیر محترم صبیح رحمانی کے بارے میں ہم نے خود پروفیسر شفقت رضوی کی کتاب پڑھی ہے کہ بڑی بے سروسامانی کے عالم میں وہ ان کے پاس گئے، انہوں نے ایک تحریک ایک مشن کے طور پر اس کو لیا اور اس کام کو آگے بڑھایا- نتیجتاً آج پاکستان کے نعتیہ ادب پر کام کرنے والے جو رسائل و جرائد چھپ رہے ہیں ان میں ''نعت رنگ'' سر فہرست ہے، جب کہ ان کے پاس مضبوط وسائل و ذرائع نہیں تھے، لیکن وہ صرف اپنی لگن اور محنت سے اس منزل تک پہنچے- تو میں سمجھتا ہوں کہ مذہبی رجحانات رکھنے والے اردو کے ایسے شعرا اور ادبا ہیں جو اس کام کو بہتر طور سے کر سکتے ہیں، لیکن وہ کرتے نہیں، آخر ایسا کیوں ہے؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:- آپ نے صحیح فرمایا- دیکھیے! صبیح رحمانی صاحب نے اس مشن کو چلایا اور ان کو سپورٹ ملا- آپ نے شفقت صاحب کا نام لیا کس محنت سے وہ تحقیقی مضامین اس موضوع پر لکھ رہے ہیں- نیز کشفی صاحب اور دیگر اہل قلم حضرات بھی اس موضوع پر وہاں کام کر رہے ہیں- ہندوستانی قلم کاروں کو بھی وہاں سراہا جا رہا ہے، مثلاً ظہیر غازی پوری، ڈاکٹر یحیی نشیط اور ڈاکٹر ابوسفیان وغیرہ، جن کے مضامین وہاں چھپ رہے ہیں- یعنی ہندوستان میں رہ کر پاکستان میں ہماری چیزیں چھپ رہی ہیں، لیکن ہندوستان میں ہماری چیزیں اس طور پر نہیں چھپ رہی ہیں، کیونکہ یہاں ایسا کوئی ادارہ یا مشن نہیں ہے، جس طرح صبیح رحمانی نے ادارہ اور مشن چلایا، یہ ان کا ایک Devotion تھا، جس کے لیے انہوں نے خود کو وقف کر دیا اور وہ کام آگے کی طرف بڑھ رہا ہے-

سوال:-تساہلی آپ مانتے ہیں؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:-تساہلی تو ہے- یہاں بھی اگر کوئی یہ علم لے کر آگے بڑھے تو یقیناً ان کو لکھنے والے ملیں گے اور ضرور ملیں گے اور جس طرح ہندوستان کے اہل قلم حضرات وہاں چھپ رہے ہیں، مجھے یقین ہے کہ اسی انداز سے جب یہاں پرچے اور ڈائجسٹ چھپنے لگیں گے تو پاکستان کے اہل قلم بھی اس طرف رجوع کریں گے اور اپنے مضامین بھیجیں گے-

سوال:-تحریری طور پر دعوت وتبلیغ کا کام انجام دینے والوں کے لیے اردو ادب اور انشا پردازی کی رعایت کتنی اہمیت رکھتی ہے؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:-اردو ادب اور انشا پردازی کی طرف چونکہ لوگوں کی رغبت زیادہ ہے، اس لیے دو ایسے مضامین آپ لیجیے کہ ایک مضمون میں آیات کریمہ قرآن حکیم سے متن کے ساتھ Qoute کر دی گئی ہوں تو لوگ یہ سمجھ کر پڑھنے سے گریز کریں گے کہ یہ تو مذہبی موضوع ہے اور اس پر یہ مضمون لکھا گیا ہے- لیکن اس کے مطالب، اس کے مفاہیم پیش کرتے ہوئے اگر آپ سادے طور پر دوسرا مضمون لکھیں تو اس کو لوگ اطمینان سے پڑھتے ہیں- ایسا لگتا ہے کہ اس زوال یافتہ یا زوال آمادہ قوم کو مذہب کی طرف سے اپنی ناواقفیت اور بے خبری کی وجہ سے ایک Alergy ہو گئی ہے اور اسی کا خمیازہ ہم لوگ بھگت رہے ہیں- لیکن ادباء اور انشاء پرداز وہ دینی قدریں اور اسلامی قدریں جس سے انسانیت پنپتی ہے اس کو اگر افسانوی طور پر (افسانہ ہم اس کو نہ کہیں) یا انشاء کے طور پر پیش کریں تو وہ یقیناً سودمند اور زیادہ کارآمد ہوگا- مثلاً ایک افسانہ پاکستان کے ایک صوفی صاحب کا تھا، جس کا عنوان تھا ''حلالہ'' - اب حلالہ جیسا عنوان رکھ کر اتنا کامیاب افسانہ انہوں نے لکھا تھا کہ خواہ مخواہ اس کے جزئیات کو جاننے کی طرف ذہن مائل ہوتا ہے اور پوچھتا ہے آدمی کہ یہ کیا چیز ہے، یہ کیوں ہے؟ تب یہ حقائق جب سامنے آتے ہیں تو از خود انسان واقف ہو جاتا ہے- تو اسی طریقہ سے زکوٰۃ کا معاملہ ہو، طلاق کا معاملہ ہو، ارث کا معاملہ ہو، عصبہ کا معاملہ ہو اور انہیں قصہ کہانی کے طور پر مفروضہ بنا کر بھی پیش کیا جائے تو

یقیناً اس سے واقفیت پیدا ہوگی اور اس کو جاننے کی چاہت پیدا ہوگی اور یہ سلسلہ یقیناً کامیاب ہوگا-

سوال:-آپ ایک مؤقر خانقاہ کے سجادہ نشین بھی ہیں ایسے میں موجودہ خانقاہی نظام، دعوت واصلاح کے لیے کتنا مؤثر ہے؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:-اصلاً خانقاہوں کی بنیاد ہی اسلامی قدروں کی احیاء اور تبلیغ کے لیے پڑی تھی اور یہ چھپی بات نہیں ہے کہ باہر سے آنے والے صوفیۂ کرام اور مشائخ عظام نے کیسی کیسی قربانی دے کر اسلام کو ہندوستان میں پھیلایا- اس وقت خانقاہوں سے صداقت کی کرنیں زیادہ پھوٹ رہی تھیں- یقیناً وہ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کی شکل میں خانقاہ تھیں لیکن جب یہ فلک شگاف عمارتوں میں تبدیل ہو کر خانقاہ معظم بن گئیں تو میں اپنے تمام احترامات اور عقیدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی چور دروازے سے وہاں شیطان گھس گیا ہے اور اس نے ہمارے نفس پر حملہ کر دیا ہے اور ہم میں حلول کر کے وہ خناس (جس سے ہمیں پناہ مانگنے کی دعا سکھائی گئی ہے) اپنا عمل جاری کیے ہوئے ہے- اور ہم بندۂ نفس ہو کر رہ گئے ہیں، اور شاید اسی پس منظر کو دیکھتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

مست رکھو ذکر وفکر صبح گاہی میں انہیں
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں انہیں

مزاج خانقاہی سے مراد یہ ہے کہ وہاں ایسی تساہلی اور ایک منفی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ صحیح تحریک اور مشن اور مقصد وغایت جو خانقاہوں کا تھا وہ پس پشت پڑ گیا ہے-

سوال:-کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ تصوف پر تنقید وملامت موجودہ خانقاہی رسم وروایات کا نتیجہ ہے؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:-تصوف میں آپ غور فرمائیے اور صرف ایک محفل سماع کو لیجیے جو خانقاہ کی ایک خاص چیز ہے بالخصوص چشتیہ سلسلہ کی، ابوالعلائیہ سلسلہ کی اور اب تو قادریہ سلسلہ میں بھی یہ چیز ہے- تو محفل سماع کے جو قواعد اور اس کی جو شرطیں ہیں، جو

حضرت محبوب الٰہی نے اور بزرگان دین نے اپنی کتابوں میں لکھ دیا ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس کی پامالی ہو رہی ہے- کتنی شرطیں ہیں کہ سماع میں کیا چیزیں پڑھی جائیں، کیسے لوگ پڑھیں اور کیسے لوگ سامع ہوں، یہ سب در کنار، اب وہ صرف بقول ایک بزرگ کے برف کی ایک گھنٹی ہے جب تک گھنٹی بجے گی نہیں برف کے خریدار پہنچے گے نہیں- تو اس ظاہر داری نے بہت نقصان پہنچایا ہے خانقاہی مشن کو الا ماشاء اللہ- اس وقت وہ خانقاہیں جہاں از سر نو دینی اور دنیاوی دونوں تعلیم ساتھ ساتھ دی جا رہی ہے تو وہاں نئ کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا- بہار کی چند خانقاہیں ایسی ہیں میں نام نہیں لوں گا کہ وہاں کے سجادگان نے خانقاہی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے ایثار سے کام لیا ہے، اس وقت وہ دنیاوی علوم میں بھی آگے ہیں اور ان کو ورثہ میں جو دینی علوم ملے ہیں اس کے ذریعے وہ تبلیغ دین متین کا کام بھی کر رہے ہیں، لیکن عام طور پر دکھاوا اور نمود و نمائش وہیں زیادہ ہے جہاں علم کا فقدان ہے، علم کی کمی ہے- ان لوگوں کے ذریعے مفت میں خانقاہیں بدنام ہو رہی ہیں-

سوال:- خانقاہ کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے کن ممکنہ اقدام کی ضرورت ہے؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:- سب سے پہلے تو یہ کہ خانقاہوں میں دینی تعلیم مذہبی تعلیم ضرور ہونی چاہیے اور جو اس کے وارث بنائے جائیں، جو اس کے متولی بنائے جائیں، جو اس کے سجادہ نشین بنائے جائیں ان کو دینی علوم سے بہرہ یاب ہونا چاہیے، تبھی وہ صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز کے فرق کو سمجھ سکیں گے اور اپنے بعد آنے والے لوگوں تک اس ورثہ کو، اس امانت کو صحیح طور پر پہنچا سکیں گے، ورنہ خانقاہی نظام میلے ٹھیلے میں گم ہو کر رہ جائے گا-

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

پروفیسر سید طلحہ رضوی برق:- میری تمنا، میری خواہش اور دلی دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ جام نور کو روز افزوں ترقی عطا فرمائے- جام نور جس مشن کو لے کر چلا ہے یقیناً وہ جام نور ہے اور اسم با مسمیٰ ہے- نور کا تعلق قلب سے ہے، نور کا تعلق ایمان سے ہے، نور کا تعلق عقیدے سے ہے، جب قلب درست ہو جائے گا ایمان بھی درست ہو جائے گا- جام نور کے صاحب

زبان اور صاحب قدرت مدیر مولانا خوشتر نورانی جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے جد کریم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی وراثت سونپی اور ودیعت فرمائی ہے، وہ اس کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں، یہ یقیناً بڑی امید افزا بات ہے- مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ ترقی کرے گا اور اس سے عوام وخواص کی فکری، ذہنی اور عملی نشو و نما ہوگی- اس کی طرف عامۃ المسلمین راغب ہوں گے اور اس مشن کو اللہ کامیابی عطا فرمائے گا- □□□

(شمارہ جولائی ۲۰۰۴ء)

محمد عارف اقبال

مدیر اعلیٰ: ماہنامہ ''اردو بک ریویو'' نئی دہلی

عارف اقبال اردو حلقے کے ایک اردو دوست قلم کار اور صحافی ہیں، اردو دوستی کو میں نے ان کا تعارفی نشان اس لیے قرار دیا کہ ان کا مطمح نظر کسی خطے، کسی علاقے یا کسی گروپ کی پبلیسٹی یا تشہیر نہیں ہے بلکہ انہیں ہر اس کتاب سے پیار ہے جو اردو میں ہو اور ہر وہ قلم کار عزیز ہے جس کا ذریعہ اظہار اردو زبان ہے- موصوف کا وطن مظفر پور بہار ہے، آپ کی ولادت ۲۶/ مارچ ۱۹۶۲ء کو ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد بہار یونیورسٹی سے آپ نے B.com کیا، جبکہ M.com کی تکمیل نہیں ہوسکی، درجہ ہفتم سے ہی ادبی و مذہبی کتابوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی- ۱۹۷۹ء سے تحریر سے وابستگی ہوئی، جس کے نتیجے میں اب تک مختلف دینی، علمی، ادبی، سماجی، تاریخی کتابوں پر ۴۰۰/ سے زائد تبصروں اور ۸۰ سے زائد اداریوں کے علاوہ متعدد مضامین ہند و پاک کے اردو اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں- آپ اردو قلم کاروں میں ابن صفی کو ذاتی طور پر بہت پسند کرتے ہیں، اس لیے آپ نے ابن صفی کے ناولوں کی جمع و ترتیب کا کام بھی کیا ہے، آپ کی ترتیب کے بعد ابن صفی کے ناولوں کا ۱۲/ واں مجموعہ زیر طبع ہے، آپ نے ہر مجموعہ کے لیے اردو بک ریویو میں ایک اداریہ بھی سپرد قلم کیا ہے- اس کے علاوہ بھی بہت سے گراں قدر مضامین کے مجموعے ترتیب دیے ہیں، جن میں بابری مسجد: شہادت سے قبل، بابری مسجد: شہادت کے بعد، عراق: ماضی، حال، مستقبل، بوسنیا سے بغداد تک، سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عملی تقاضے، اہم ہیں- پچھلے ۱۴/ سالوں سے اردو بک ریویو کی کامیاب ادارت نے رسالے کے ساتھ ساتھ آپ کے ادبی اور صحافتی قد کو بھی بہت بلند کر دیا ہے-

سوال:- سب سے پہلے تو اردو بک ریویو کی دس سالہ کامیاب ادارت پر ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، کیا ہم آپ سے توقع رکھ سکتے ہیں کہ آئندہ دس سالوں تک اردو بک ریویو اسی طرح فروغ اردو میں مصروف رہ سکے گا؟

عارف اقبال:- دیکھیے! دس سال تو اللہ اللہ کر کے پورا ہو گیا، لیکن آئندہ کے لیے ابھی کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن میری کوشش ہوگی کہ جب تک میں زندہ رہوں نکلتا رہے، اس کے علاوہ اردو بک ریویو کی جو موجودہ شکل ہے میں اس میں بھی Imrpovement چاہتا ہوں، کیونکہ اس رسالے کے اجرا کے پیچھے جو مقاصد تھے وہ ۴۰ یا ۵۰ فی صد ہی حاصل ہو سکے ہیں، میری کوشش رہی ہے کہ ہمیشہ اس کو Improve کرتا رہوں، لیکن وہ اب تک مکمل نہیں ہو پایا، یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ اردو بک ریویو اول روز سے ہی ماہنامہ ہے، لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ اب تک یہ دو ماہی ہی نکل رہا ہے، ماہنامہ نہیں ہو سکا، تو ان شاء اللہ مستقبل میں میری کوشش رہے گی کہ آئندہ یہ اپنے صحیح نہج پر آ سکے-

سوال:- آپ ایک طرف یہ اعلان کرتے ہیں کہ اردو ایک زندہ زبان ہے، دنیا کے ہر خطہ میں لاکھوں کروڑوں انسان اس کے بولنے والے موجود ہیں، دوسری طرف آپ یہ کہتے ہیں کہ اردو معاشرہ میں اردو سے چاہت مفقود ہو گئی ہے اور اردو کے فروغ کے نام پر جو ادارے یا افراد کام کر رہے ہیں ان میں ۹۹/ فی صد اردو کے سوداگر ہیں، تو کیا ایسے میں ہم یہ سمجھیں کہ اردو فی الوقت زندہ ہے مگر آنے والے دنوں میں جلد ہی اس کا وجود مٹ جائے گا؟

عارف اقبال:- دراصل میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا ''اردو زبان کے سوداگر'' یہ ''کتاب نما'' کا اداریہ بنا، پھر میں نے ایڈٹ کر کے لوگوں کی خواہش کے مطابق کئی رسالوں کو بھیج دیا تھا، اس کو انہوں نے شائع بھی کیا، اردو دنیا نے بھی اسے شائع کیا، سیاست نے بھی اسے شائع کیا، پاکستان کا ایک رسالہ ہے ''اردو اخبار'' اس نے بھی شائع کیا، اس میں میں نے لکھا تھا کہ اردو زبان اور اردو ادب دو الگ الگ چیزیں ہیں،

زبان کا تعلق عوام اور سماج سے ہے جب کہ ادب کا تعلق سماج کے اس حصے سے ہے جو زبان کے ذریعے علوم کے حصول اور فروغ میں لگے رہتے ہیں، ظاہر سی بات ہے کہ ہر زبان کا ایک ادب ہوتا ہے، اسی طرح اردو زبان کا بھی ایک ادب ہے، ہر جگہ پہلے زبان کے فروغ کے سلسلے میں کوششیں کی جاتی ہیں پھر ادب پر، لیکن ہمارے یہاں الٹا ہوا، زبان کے فروغ کے سلسلے میں کوئی کوشش نہیں ہوئی، ادھر کسی کی توجہ ہی نہیں رہی، جو کچھ باقی رہا وہ ادب کے نام پر باقی رہا، اردو کے شعبے میں اردو کو شامل نصاب کرنا یا اردو کے شعبے کھولنا، ادھر ہماری توجہ زیادہ رہی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوامی سطح سے یہ زبان کمزور ہوتی چلی گئی- جہاں تک اردو کی بقا کے تعلق سے آپ کا سوال ہے اس کے بارے میں عرض کر دوں کہ یقیناً اردو ایک زندہ زبان ہے، یہ زندہ رہے گی اور عالمی سطح پر زندہ رہے گی، لیکن ادب کا کیا ہوگا؟ اس تعلق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا، خاص طور سے پچھلے پچاس سالوں سے ادب کو جو مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے اس سے اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے، لیکن ان شاءاللہ اردو زندہ رہے گی، یہی وجہ ہے کہ اردو میں چھپنے والی کتاب خواہ جس موضوع میں ہو لوگ اس کا استقبال کرتے ہیں، لوگوں میں اب ذوق بھی بڑھا ہے، بالکل جمود نہیں ہے، ہاں پچھلے ۲۵ رسالوں سے جو ایک سکتہ کی کیفیت رہی ہے اس سے نکلنے میں کچھ وقت لگے گا، اور ان شاءاللہ لوگ اس سے نکلیں گے اور جو نسل آگے آئے گی وہ اردو کا استقبال کرے گی-

سوال:- اردو ادب کے زوال سے آپ کی کیا مراد ہے، جہاں تک تخلیقی ادب کی بات ہے تو ماضی کی طرح آج بھی تخلیقات ہو رہی ہیں، ہر قسم کے مضامین لکھے جا رہے ہیں، پھر ادب کے زوال کا کیا مطلب؟ آپ کی نظر میں کمزوری کہاں پر ہے؟

عارف اقبال:- کمی کا آغاز فکر سے ہوتا ہے، فکر ایک چیز ہے اور تخلیق ایک الگ چیز ہے، تخلیقی ادب اپنی جگہ پر لیکن تخلیق کا تعلق فکر سے ہے، تو جس فکر کے حاملین ہوتے ہیں تخلیق بھی اسی معیار کی ہوتی ہے، جب فکر میں تبدیلی آئے گی تو تخلیقات میں تبدیلی آئے گی اور وہی تخلیق یا تخلیقات زندہ رہ سکتی ہیں جن کی فکر پائیدار ہو-

سوال:- اردو بک ریویو اردو کتابوں کا تعارف و تبصرہ کر کے انہیں متعارف کرانے

والا منفرد رسالہ ہے، لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ اپنی عمر کے دس سال پورے کرنے کے بعد بھی اسے اپنے قارئین کی توجہ نہیں مل سکی؟

عارف اقبال:- میرا خیال ہے کہ ریویو کا تعلق عوام سے شروع سے ہی بہت زیادہ نہیں رہا ہے، ایک خاص طبقہ ہے جو ریویو کو جانتا ہے یا اسے پسند کرتا ہے، انگریزی میں بھی ریویو کے لیے جو رسالے نکل رہے ہیں ان کا سرکولیشن بھی بہت زیادہ نہیں ہے، تھوڑا ہے، ایک رسالہ برطانیہ سے، اسلامک بک ریویو کے نام سے نکلتا ہے، اس کے بارے میں بھی یہی سنتا ہوں کہ وہ کبھی ۶ مہینے پر نکلتا ہے تو کبھی ۷ رمہینے پر نکلتا ہے، جب کہ شروع میں وہ ماہنامہ ہی تھا تو جب انگریزی میں ریویو کے رسالے اس طرح نکل رہے ہیں تو ظاہر ہے اردو کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو قارئین اردو کے پاس ہیں یا جو محبان زبان اردو ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے، اور کم تعداد میں بھی ایک Selective Approach ہوتا ہے، اس میں لوگ اسے پڑھتے ہیں، اردو کے کئی ایسے رسالے میرے علم میں ہیں کہ وہ پچیس سال سے نکل رہے ہیں مگر ان کا سرکولیشن پانچ سو سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اردو بک ریویو کا سرکولیشن اگر یہ کہوں کہ پندرہ سو ہے تو یہ کہتے ہوئے مجھے اطمینان ہے، اس لیے بھی اطمینان ہے کہ اس تعداد کے باوجود یہ ہر اس ملک میں پڑھا جاتا ہے، جہاں اردو کے محبین موجود ہیں، ہر باذوق کے ٹیبل پر یہ پڑھا جاتا ہے، وہ ہر لائبریری جہاں لوگ اردو پڑھنے جاتے ہیں وہاں یہ رسالہ موجود ہوتا ہے بلکہ ایک لائبریری میں اگر ایک رسالہ جاتا ہے تو درجنوں افراد اس کو پڑھنے والے ہوتے ہیں، میرا رسالہ جاپان کی ایک لائبریری میں بھی جاتا ہے جہاں تقریباً دو سو افراد اسے پڑھتے ہیں-

سوال:- اردو بک ریویو کے توسط سے آپ پچھلے دس سالوں سے اردو دنیا سے وابستہ ہیں، اس طویل تجربہ کے بعد آپ کے خیال میں کس قسم کی کتابیں اردو میں زیادہ شائع ہو رہی ہیں؟ اور کن سے اردو کا زیادہ فروغ ہو رہا ہے؟

عارف اقبال:- ابھی غالباً ۱۸ر مارچ کو اردو اکیڈمی نے ایک دو روزہ سمینار رکھا تھا، جس کا موضوع ہی تھا Popular Literature اکیڈمی نے ایک عنوان پر مقالہ پیش

کرنے کے لیے مجھے بھی مدعو کیا تھا، اتفاق سے میں اس دوران بیمار ہوگیا اور مقالہ نہیں لکھ سکا، میں نے اس کے کنوینر سے دریافت کیا کہ Popular Literature پر سمینار کرانے کی کیا وجہ ہے؟ اردو اکیڈمی نے ایسے موضوع پر تو اس سے پہلے کبھی کوئی سمینار یا سمپوزیم نہیں کیا، تو انہوں نے برجستہ یہ کہا کہ اردو کی ترقی میں Popular Literature ہی کا رول ہے، اب ہم لوگ مجبور ہوگئے ہیں یا یہ کہیے کہ اب ہمیں اس بات کا احساس ہوگیا ہے کہ اس کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے، اس لیے ہم لوگوں نے طے کیا کہ اس پر سمینار کیا جائے، تاکہ حقیقت سامنے آسکے، میں نے ان سے یہ بھی دریافت کیا کہ آپ نے کیا سمجھ کر مجھے مذہبی پوپولر لٹریچر پر لکھنے کے لیے کہا ہے جب کہ اس سمینار میں مجھ سے بڑے بڑے اسکالر اور عالم وفاضل شخصیتوں کا نام شامل ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے محسوس یہ کیا کہ مذہبی لٹریچر پر آپ زیادہ اچھا لکھ سکتے ہیں، وجہ صاف ہے کہ یہ لوگ مختلف علوم وفنون کو اپنے دماغ میں اتار تو رہے ہیں لیکن یہ مذہبی لٹریچر کے قریب سے بھی نہیں گزرے ہیں، ایسے ہی جو لوگ آج ادب پر قابض ہیں، یہ غالب ومیر پر تو لکھ سکتے ہیں، یا ادب کے دیگر اصناف اور شخصیتوں پر تو وہ لکھ سکتے ہیں مگر مذہب پر نہیں لکھ سکتے، اس لیے انہوں نے مجھے اس کے لیے مدعو کیا، میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آپ اگر ابن صفی کی تحریروں کے حوالے سے لکھنے کو کہیں تو میں لکھ دوں، تو انہوں نے کہا کہ ان کی تحریروں پر بھی لکھا جارہا ہے، ان پر دوسرے صاحب لکھ رہے ہیں، یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ چلو ایک فراموش ادیب پر بھی کم از کم اب کچھ لکھا تو جارہا ہے، تو میں نے آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ واقعہ اس لیے سنا دیا کہ یہ بالکل تازہ ترین ہے- آج جو تبدیلی ہورہی ہے اس کے تناظر میں سب محسوس کرنے لگے ہیں کہ آج اردو کی جو زندگی ہے یہ صرف پوپولر لٹریچر سے ہے، ان کا جو ادب ہے، ان کی جو ادبی کتابیں ہیں، ان کے پڑھنے والے اب انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے ہیں، کیونکہ ادب کے نام پر کوئی چیز ان کے یہاں ایسی نہیں رہی ہے جسے لوگ دلچسپی اور توجہ سے پڑھیں، تو اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس کے باوجود آج اردو کیسے زندہ ہے؟ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ آج کل اردو کے فروغ کے لیے جو کوششیں ہورہی ہیں یہ ان لوگوں کی

طرف سے ہیں جو ادب کے اساتذہ نہیں ہیں، یہ عوام ہیں، محبان اردو ہیں، یا مدارس کے اساتذہ ہیں، یا اس طرح کے دوسرے لوگ ہیں، تو میرا خیال ہے کہ آج جو یہ محسوس کررہے ہیں کہ ادب کے زوال کے باوجود اردو زندہ ہے، تو اس کو زندہ رکھنے میں جو پہلی چیز ہے وہ ہے مذہبی لٹریچر، لیکن ہم مذہبی لٹریچر کو اولیت صرف اس پس منظر میں دے سکتے ہیں جو پچھلے ۲۰/۲۵ سالوں سے تبدیلیاں ہوئی ہیں، اس سے پہلے جو لٹریچر سب سے زیادہ پڑھا جاتا تھا اس میں دو تین نام زیادہ نمایاں ہیں، تاریخی ادب اور جاسوسی ادب، تاریخی ادب میں جو نام نمایاں ہیں آپ انہیں جانتے ہیں، نسیم حجازی ہیں، صادق صاحب ہیں، ان کے بعد التمش ہیں جنہوں نے ''داستان ایمان فروشوں کی'' لکھی، جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ کروڑوں لوگوں نے اس کو پڑھا، اور آج بھی یہ کتاب تیزی کے ساتھ فروخت ہورہی ہے، مائل ملیح آبادی کا بھی اچھا رول ہے، اسی طرح جاسوسی ادب نے بھی اردو کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، ابن صفی کی جو شخصی تحریریں ہیں، یا انٹرویوز ہیں، ان کو پڑھیے، آپ کو اندازہ ہوگا کہ انہوں نے جاسوسی ادب کیوں لکھا اور اس کو لکھ کر کون سی خدمات انجام دیں-

سوال:- یہاں درمیان میں ایک ضمنی سوال کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ ادب سے ابن صفی کو کیوں نظر انداز کیا گیا، نہ ان کی تحریریں کہیں شامل نصاب ہیں اور نہ ان پر مضامین وغیرہ لکھے جاتے ہیں، تو آخر اتنے بڑے ادیب کو ادبی حلقے میں اس طرح نظر انداز کیوں کردیا گیا؟

عارف اقبال:- ابن صفی کو نظر انداز کرنے کی صرف ایک وجہ ہے اور اس کا تعلق مذہبی اقدار سے ہے، ابن صفی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو اندر سے خالص مسلمان تھی، مثالی اقدار کا فروغ اس کا نصب العین تھا، انہوں نے اسی نصب العین کو سامنے رکھ کر اپنے کام کا آغاز کیا، ان کے تمام ناولوں میں یہ چیزیں بہت صاف نظر آئیں گی، میں آپ کے سامنے صرف ایک مثال دوں، ابن صفی اپنے ایک ناول میں اپنے ایک کردار سے ایک جملہ کہلواتا ہے، ہوتا یوں ہے کہ ایک لڑکی ایک کلب میں ابن صفی کے ایک کرادر کیپٹن حمید کے لیے شراب کا آرڈر دیتی ہے، تو وہ کہتا ہے کہ ''نہیں! میرے لیے کافی منگوائیں'' لڑکی کو حیرت

ہوتی ہے کہ وہ شراب نہیں پیتا ہے، تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ ''اپنے وجود کی مستی کیا کم ہے کہ کسی نشے کا سہارا لیا جائے؟'' اس طرح کے ابن صفی کے ہزاروں جملے ہیں اور یہ تو استعارہ ہے، بعض جگہوں پر تو ابن صفی نے بالکل کھول دیا ہے، تو ظاہر سی بات ہے کہ ایسا ادیب ایسا تخلیق کار جو اسلامی اقدار کی دعوت دے رہا ہو وہ کیسے ان لوگوں کے درمیان چل پھر سکتا ہے جو خدا پر کبھی ایمان نہیں رکھتے؟ ۱۹۴۷ء کے بعد ادب جن لوگوں کی مٹھیوں میں گرفتار ہوا ہے تقریباً ان سب کا حال ویسا ہی ہے- ایک بزرگ ادیب ابھی قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہیں، تقریباً ۷۵؍سال ان کی عمر ہو رہی ہوگی، لیکن اپنی زبان سے وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں لے سکتے، وہ ایسے موضوعات پر قلم کو حرکت بھی نہیں دے سکتے، لیکن ادب اور تنقید کے میدان میں ان کی باتیں آج بھی مستند ہیں، آج بھی ان میں وہ خوب لکھ رہے ہیں، یہ تو اکیسویں صدی ہے، فتنے کی صدی ہے، لیکن جس شخص کا یہ حال ہے یہ پیدا تو ۷۵؍سال پہلے ہوا تھا، وہ کون سا دور تھا، اور اس دور میں ادب کے نام پر کیا کچھ ہو رہا تھا، لیکن سوچیے اس دور میں بھی ابن صفی ۱۹۵۲ء سے جو تحریک لے کر اٹھا تھا وہ عام روش سے بالکل مختلف تھی، ایسے میں ابن صفی کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟

سوال :-ادب کے تعلق سے تو ایک بڑے طبقے کی رائے یہ ہے کہ مذہب اس سے خارج ہے، اس لیے ادب کی جہاں بات آئے وہاں مذہب کو نہیں لایا جا سکتا، لیکن جہاں تک اردو زبان کے فروغ کا مسئلہ ہے تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مذہبی کتابیں اس میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں، پھر اردو کے فروغ کی جہاں بات آتی ہے وہاں بھی لوگ مذہب کا نام لیتے ہوئے جھجکتے ہیں، آخر ایسا کیوں؟

عارف اقبال:- مذہبی تحریروں کے اعتراف نہ کرنے کی جو بنیادی وجہ ہے اس سے آپ بھی بخوبی واقف ہیں، ابھی ابھی اس کا میں نے اظہار بھی کیا، یعنی اسلام سے کد، اس وقت اردو ادب پر جن لوگوں کا غلبہ ہوا خواہ وہ اشتراکیت سے متاثر ہونے والے ہوں، یا ابا حیت پسند ہوں، ان سارے لوگوں کا تعلق اسلام سے تو تھا نہیں، بلکہ برعکس اس کے یہ اسلام کو اپنا دشمن سمجھتے تھے، یہ دیکھ رہے تھے کہ جس شخص کا نام اردو کے محققین میں آ رہا ہے وہ تو

خود ایک مولوی ہے، مولوی عبدالحق، یا اردو سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے لوگ سب مولوی ہیں، تو انہوں نے ایک دوسری ترکیب نکالی، وہ یہ کہ اردو ادب کو انہوں نے اولیت دی اور اردو زبان کو ثانوی حیثیت دے دی، اور آہستہ آہستہ زبان کو یہ چھوڑتے گئے، اس طور سے کہ ادب اوپر ہو گیا اور زبان نیچے ہو گئی اور ادب پر اجارہ داری ایسے ہی لوگوں کی ہو گئی- جو مولوی حضرات تھے بھی وہ آہستہ آہستہ الگ ہوتے گئے، بالکل نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ وہاں اگر کوئی عبدالکریم نام کا شخص بھی ہوتا ہے تو اس کے لب ولہجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہو سکتا، میں ایسے بہت سے لوگوں سے واقف ہوں جو اردو پڑھاتے ہیں، مگر ان کی شکل، ان کا رہن سہن اردو تہذیب سے بالکل مختلف ہے، یہاں تک کہ اب خود ان کے بچے اردو نہیں پڑھتے، وہ انہیں انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، تو صاف لفظوں میں میں کہہ دوں کہ مذہبی لٹریچر سے بے توجہی میں اصل کد اسلام ہے، اس بات کو اب خوب خوب سمجھنا ہوگا، لیکن اس کے ساتھ یہ ایک افسوسناک صورت حال ہے کہ مدارس نے پچھلے پچاس ساٹھ سالوں میں اردو کی غیر محسوس خدمت کی، ان کی خدمت بالکل غیر شعوری ہے، پاکستان کے ایک صاحب ہیں جسٹس تقی عثمانی صاحب، انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے ''مدارس اسلام کے قلعے ہیں'' اگر ان سے سوال کیا جائے کہ ذرا آپ اسلام کے قلعوں کی تاریخ بتا دیجیے تو شاید وہ پورے طور پر نہ بتا سکیں، مدارس سو سال پہلے تو اسلام کے قلعے تھے، مگر اب پورے طور پر نہیں ہیں، اس لیے نہیں ہیں کہ قلعے سے نمائندگی ہوتی ہے، قلعے سے باہر سے نمائندگی نہیں ہوتی ہے اور یہ مدارس اب اسلام کے نمائندگی میں مکمل کامیاب نہیں رہے، اس لیے باہر سے تحریکات اٹھیں، اگر قلعہ کے باہر سے تحریکات اٹھ رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے جس سے پوری نمائندگی نہیں ہو پا رہی ہے، کچھ ایسے تقاضے ہیں جو پورے نہیں ہو رہے ہیں، اس لیے تحریکات اٹھتی ہیں، اردو کے تعلق سے بھی یہی کچھ ہوا، اہل مدارس ابتداء میں اردو زبان و ادب کی جو نمائندگی کر رہے تھے وہ نمائندگی بعد کے دور میں نہیں رہی، یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق کے بعد کوئی دوسرا بابائے اردو سامنے نہیں آیا، آپ کسی ایک ایسی کتاب کے بارے میں بتائیے جسے بعد کے علماء نے اردو

قواعد کے تعلق سے لکھی ہو، یا اردو زبان وادب کے کسی خاص پہلو پر کوئی اہم کتاب لکھی ہو، صرف یہ کہنا کہ ہمارے یہاں اردو زبان میں تدریس ہوتی ہے، درخواستیں لکھی جاتی ہیں، رجسٹر پر کیے جاتے ہیں، صرف یہ کہنا کافی نہیں، ہمیں حالات اور زمانے کے تحت آگے بڑھنا چاہیے، اہل ادب نے جن اصناف کو متعارف کرایا تھا، ان پر ہمیں بھی کھل کر گفتگو کرنی چاہیے تھی، اس طرح اپنا Contribution دینا چاہیے تھا، خلاصہ کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مدارس نے یقیناً اردو کی بے پناہ خدمات انجام دیں مگر یہ سب غیر شعوری طور پر تھیں، اس لیے زیادہ توجہ ادھر نہیں ہوسکی۔

سوال:- اردو بک ریویو کی ادارت کو دس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا، اگر آپ سے سوال ہو کہ فروغ اردو کے لیے پسینے بہانے کے عوض میں آپ کو کیا ملا؟ تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

عارف اقبال:- (ہنستے ہوئے) آپ نے میرا وہ اداریہ پڑھا ہوگا جس میں میں نے اس واقعے کا ذکر کیا تھا کہ ایک صاحب پاکستان سے آئے ہوئے تھے اور وہ اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے جس طرح آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، وہ کراچی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں، وہ جس وفد کے ساتھ یہاں آئے تھے وہ سو افراد پر مشتمل تھا، انہوں نے بتایا کہ میرے پروگرام میں یہ طے تھا کہ اردو بک ریویو کے مدیر سے ملاقات کروں گا، دہلی آکر انہوں نے مجھے فون کیا اور میرے دفتر میں آئے، لائٹ کٹی ہوئی تھی اور وہ اندھیرے میں باہر کھڑے تھے، میں ان سے ملا اور ان کو اس تاریکی میں جان بوجھ کر اسی تنگ وتاریک کوٹھری میں بٹھایا، انہوں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رسالہ دیکھ کر جو میں نے اندازہ کیا تھا میرا وہ تصور آپ کے اس دفتر کو دیکھ کر بالکل پاش پاش ہوگیا، میں نے کہا میں جو کر سکتا ہوں، جو میرے بس میں ہے وہ کر رہا ہوں، سب کو میرے حالات سے واقفیت ہے، میں اللہ کی مدد کے سہارے جو کر سکتا ہوں کرتا جا رہا ہوں، میں اللہ سے اس کی دعا بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں زیادہ آزمائش میں نہ ڈالے، میرے دہلی آئے ہوئے بیس سال ہوگئے مگر آج تک کرائے کے مکان میں رہتا ہوں اور جو لوگ میرے بعد آئے وہ تین چار سالوں میں اپنا

فلیٹ خرید لیے، لیکن جو کچھ کرنا ہے بہر حال کرنا ہے، مجھے اس بات سے خوشی بھی ہے کہ بہر حال اللہ تعالیٰ مجھ سے کچھ کام لے رہا ہے، میں بار بار غور کرتا ہوں کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ آخر کیوں کر رہا ہوں؟ اس پر اجر ملے گا یا نہیں؟ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ میں آج وہ کام کر رہا ہوں جو کوئی نہیں کر رہا ہے، ظاہر سی بات ہے کہ امت جو مختلف علوم وفنون کی ترویج واشاعت اور مختلف کاموں پر مامور ہے، میں سوچتا ہوں کہ امت میں جو کام دوسرے نہیں کر رہے ہیں یا جس کام کو بڑے پیمانے پر نہیں کر رہے ہیں، اسی کام پر اللہ تعالیٰ نے مجھے مامور کر رکھا ہے، آپ یقین مانیے کہ اگر مجھے اس کا احساس ہو جائے کہ آخرت میں مجھے اس کام پر کوئی اجر نہیں ملے گا تو میں اسی دن اس کام کو بند کر دوں گا۔

سوال:- مشرف عالم ذوقی کو آپ سے شکایت ہے کہ آپ صرف مذہبی کتابوں کا تعارف شائع کرتے ہیں، ان کی شکایت کا پس منظر کیا ہے؟ اور ان کی شکایت کتنی معقول ہے؟

عارف اقبال:- ذوقی صاحب سے میری اچھی ملاقات ہے، اچھی سے میری مراد یہ ہے کہ ان سے میری پانچ چھ ملاقاتیں ہو چکی ہیں، پہلی ملاقات انہوں نے خود ٹیلی فون پر کی تھی، یہ پانچ یا چھ سال پہلے کی بات ہے، انہوں نے پوچھا کہ آپ کا دفتر کہاں ہے، میں آؤں گا اور بھی کافی باتیں کیں، میں نے کہا آپ ضرور تشریف لائیں، لیکن بہر حال وہ اب تک دفتر نہیں آسکے، اس کے علاوہ کئی دوسری مجلسوں میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں، انہوں نے اردو بک ریویو کی ممبر شپ حاصل کی اور ریویو ان کو جاتا رہا، اس کے ایک سال بعد جب ان کا زرتعاون ختم ہوگیا تو معمول کے مطابق اردو بک ریویو کے ساتھ یاد دہانی کے خطوط جاتے رہے، لیکن میں نے رسالہ بھیجنا بند نہیں کیا، ایک سال اور گزر گیا، رسالہ بھی جاتا رہا اور اس کے ساتھ یاد دہانی کا خط بھی جاتا رہا، اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک خط لکھا، میں نے یہ سوچ کر کہ یہ ایک ایسے شخص کا خط ہے جس کا تعلق اردو سے ہے اور اردو کے لیے وہ اپنے طور پر کوشش بھی کر رہا ہے، اس کے احساسات وخیالات عوام تک پہنچنے چاہیے، میں نے ان کا خط من وعن چھاپ دیا، خط میری خطوط کی فائل میں اب بھی محفوظ ہے، اس خط کو

جب قارئین نے پڑھا تو اس پر وہ اپنے تاثرات لکھ بھیجے، میں نے ان کو بھی چھاپ دیا، میری غلطی صرف یہ ہے کہ میں نے ان کے خط کا براہ راست جواب نہ دے کر دوسرے طور پر جواب دیا یعنی ان کے خط کو اور اس پر دوسرے تاثراتی خطوط کو من وعن چھاپ دیا-

سوال:-انہوں نے اپنے خط میں لکھا کیا تھا؟

عارف اقبال:-وہ چھپا ہوا ہے، ویسے ابھی مجھے اس کے الفاظ تو یاد نہیں ہیں، مگر اتنا یاد ہے کہ انہوں نے اس میں اسلام کی تضحیک کی تھی، پھر ایک صاحب نے مجھے ریاض سے خط لکھا کہ ''اگر ذوقی صاحب زرتعاون نہیں دینا چاہتے ہیں تو نہ دیں، لیکن وہ ایسا خط نہ لکھیں، ان کی طرف سے میں ان کا زرتعاون تاحیات کے لیے دے دیتا ہوں اور آپ انہیں برابر رسالہ بھیجتے رہیں'' تو میں نے ان کے خط کو بھی چھاپ دیا اور رجسٹر میں جہاں ذوقی صاحب کا Address تھا وہاں میں نے لکھ دیا......فلاں Gifted by، یہ ہے پوری سرگزشت، اس کے علاوہ ذوقی صاحب سے نہ تو میری کوئی دشمنی ہے اور نہ کوئی کسی طرح کا معاملہ ہے، اب آپ خود فیصلہ کر لیجیے کہ میرا جرم کیا ہے؟

سوال:-قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے مختلف موضوعات پر ہزاروں کتابوں کی اشاعت، مختلف اردو چینلوں کا اجرا، اخبارات ورسائل اور اردو ویب سائٹس کا افتتاح، کیا اردو کے تابناک مستقبل کی ضمانت نہیں ہیں؟

عارف اقبال:-اردو کونسل نے جو کچھ کیا ہے بہرحال ہم اسے اردو کے فروغ کی راہ میں اچھی کوشش ہی کہیں گے، اور اردو کے تابناک مستقبل کی ضمانت بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ ایک اداراتی کوشش ہے، اس کے علاوہ اور بھی دسیوں اداروں نے اس طرح کی اچھی کوششیں کی ہیں، لیکن ہم اداراتی کوشش کو کل کے اعتبار سے کسی زبان کی تابناکی کی ضمانت نہیں کہہ سکتے ہیں-

سوال:-اردو بک ریویو کے بعض تبصرہ نگار تعصب میں خلاف واقع باتیں لکھ جاتے ہیں، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں کے تعلق سے کسی نے ایسی ہی کچھ خلاف واقع باتیں لکھی تھیں، میرا خیال ہے کہ ایسی تحریریں آپ شائع نہ کریں تو بہتر ہے، تنقید جیسی بھی ہو

اور جس پر بھی ہو خلاف واقع نہیں ہونی چاہیے؟

عارف اقبال:-دیکھیے! میں اپنی ہر ممکن کوشش سے اتحاد امت کو اولیت دیتا ہوں اور کسی طرح کا بھی جو مسلکی معاملہ ہے اس سے اوپر اٹھ کر کچھ کہنے اور سننے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن میں بھی ایک انسان ہوں، کس کے دل میں کیا ہے میں نہیں جانتا، کسی نے اگر کبھی ایسا لکھ دیا تو یہ بہرحال غلط ہے-کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سہواً بہت سی چیزیں رہ جاتی ہیں، ان پر نظر نہیں پہنچ پاتی اور ہم انہیں چھاپ دیتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ میں نے اس کے لیے ہمیشہ دروازہ کھولے رکھا ہے کہ اگر کسی غلط بات کی نشاندہی کی جاتی ہے، اس پر تنقید کی جاتی ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں اور اسے چھاپ دیتا ہوں، میرا خیال ہے کہ یہ بات اگر پوری امت میں پیدا ہو جائے تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے-

سوال:-(۱۰) ماہنامہ ''جام نور'' کے لیے کوئی آپ کا پیغام؟

جواب:-آپ سے میری ملاقات تو نہیں تھی، لیکن شروع سے آپ کے رسالہ کو پڑھ رہا ہوں اور پسند کرتا ہوں- میں ابتدا سے محسوس کرتا ہوں کہ رسائل کی جو عام روش ہوتی ہے اس سے یہ رسالہ الگ ہے اور بہتر روش پر گامزن ہے- میری آپ سے گزارش صرف اتنی ہے کہ آپ نے جو خوش گوار تبدیلیاں کی ہیں ان کے ساتھ یہ کوشش بھی کریں کہ رسالہ امت کا پرچہ ہو جائے، اس سے پیش کش میں بہتری آئے گی اور جو آپ کا مقصد ہے وہ بھی پورا ہوگا-□□□

(شمارہ جون ۲۰۰۶ء)

پروفیسر عبدالحق

سابق استاذ: دہلی یونیورسٹی، دہلی

''اقبال نے مجھے کسی کام کا نہیں چھوڑا'' ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق یہ بات اتنی معصومیت سے کہتے ہیں جس میں اقبال سے ان کی گہری وابستگی کے ساتھ، اقبال کا عشق اور جذبۂ دروں بھی بولتا نظر آتا ہے- پروفیسر موصوف نے پوری زندگی مطالعہ اقبال میں گزاردی 'اقبال کے شعری اسالیب'، 'فکر اقبال کی سرگزشت'، 'اقبال اور اقبالیات' اور 'تصورات اقبال' سمیت درجن بھر کتابیں لکھنے کے بعد وہ خود کو بحر اقبال کے ساحل پہ پاتے ہیں- پروفیسر صاحب ۲؍مارچ ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے اردو اور فارسی سے ایم اے کیا، اردو سے پی ایچ ڈی کی، تدوین متن پر دہلی یونیورسٹی سے ڈپلوما کیا، دہلی یونیورسٹی میں ایم اے اور تحقیق کے طلبہ کی تدریس ورہنمائی کا ۳۸؍ سالہ تجربہ رکھتے ہیں- مختلف اوقات میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی اور کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں بھی وزیٹنگ پروفیسر رہے، دس سالوں تک آل انڈیا یونیورسٹی اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے صدر رہے، جے این یو، بنارس ہندو یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی سمیت ملک کی ۲۲؍ یونیورسٹیوں کی اکیڈمک باڈیز کے ممبر ہیں- اقبال اکیڈمی حیدرآباد، اردو اکیڈمی دہلی، ایڈوائزری کمیٹی انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی کی رکنیت بھی حاصل ہے- ۲۰۰۵ء سے ۲۰۰۷ء تک یو جی سی کے کئی بڑے پروجیکٹ کے پرنسپل انویسٹی گیٹر رہ چکے ہیں- متعدد ملکی وعالمی سمیناروں میں شرکت کی ہے- ۲۵؍ علمی وتحقیقی کتابیں اور ۱۰۰ سے زائد تحقیقی مقالات ومضامین آپ کے خامۂ زرنگار سے معرض وجود میں آچکے ہیں- ۱۹۷۲ء سے سہ ماہی مجلّہ جمعیت ہند کے ایڈیٹر ہیں- آپ کی نگرانی میں ۱۰ پی ایچ ڈی اور ۱۵؍ ایم فل کی ڈگریاں ایوارڈ ہو چکی ہیں-

سوال:- آج طالبان جو کچھ کررہے ہیں، اس کا اثر اسلام اور مسلمانوں پر کیا پڑ رہا ہے؟

پروفیسر عبدالحق:- میں تو ادب کا آدمی ہوں اور ذہنی طور پر میں اس کے لیے تیار نہیں تھا، خیر اپنی معلومات کی حد تک سیاست اور سماج کے تعلق سے بھی آپ کے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کروں گا- جہاں تک طالبان کا سوال ہے تو میں ان کے بہت سے کاموں کی تائید کرتا ہوں- ہاں! اسلام میں تشدد کی کوئی جگہ نہیں ہے اور تشدد کو کبھی بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا، طالبان نماز وروزہ اور اسلامی اعمال واشغال کی پابندی کی بات کرتے ہیں، اسلامی نظام کے نفاذ کی بات کرتے ہیں- میں اس کے حق میں ہوں-

سوال:- شاید آپ پہلے انسان ہیں جو ہمارے سامنے طالبان کی حمایت کی بات کررہے ہیں؟ ہمیں حیرت ہے! جہاں تک اسلامی اعمال واشغال کو پسند کرنے کی بات ہے، اسلامی نظام کے نفاذ کی خواہش کی بات ہے تو کون مسلمان ایسا ہے جو اسے پسند نہیں کرتا- طالبان کی انفرادیت تو صرف اس میں ہے کہ وہ اس کے لیے طاقت اور تشدد کا استعمال کرتے ہیں؟

پروفیسر عبدالحق:- دیکھیے! بچہ اگر بالغ ہوجائے اور نماز نہیں پڑھتا ہے تو اسلام کا کیا حکم ہے؟

سوال:- اسلام کا حکم تو یہی ہے کہ اسے مار کر نماز پڑھوایا جائے- لیکن یہ حکم صرف پڑھنے اور یاد رکھنے سے زیادہ سمجھنے کا تقاضا کرتا ہے- یہ حکم اخلاقی اور تربیتی نقطۂ نظر سے دیا گیا ہے- فرض کیجیے کوئی بچہ بالکل بضد ہوجائے کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا اور بالغ ہو تو آپ مار پیٹ کر زبردستی اس سے نہیں پڑھوا سکتے اور جہاں تک طالبان کی بات کرتے ہیں تو وہ ہر حکم جس کا نفاذ صرف ریاست وحکومت کرسکتی ہے وہ اپنے ہاتھوں سے کررہے ہیں- سوات میں ان کی حکومت نہیں، وہاں پاکستانی حکومت ہے لیکن وہاں اپنی مرضی کی شریعت نافذ کررہے ہیں- قتل وغارت کا ماحول گرم کررکھا ہے، عوام کے امن کو تباہ کررکھا ہے- یہ

کون سی دینداری ہے؟

پروفیسر عبدالحق:- یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اسلام میں تشدد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے- کسی طور پر بھی تشدد کو برداشت نہیں کیا جا سکتا- یہ طالبان کا دوسرا پہلو ہے- اس سے میرا اتفاق نہیں ہے- میں صرف ایک دینی ماحول، اور دینی احکام کے نفاذ کی بات کر رہا تھا- اس کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ آپ ہر کام کو ریاست پر مت ڈالیے- بہت سی ذمہ داریاں سماج کی ہیں، فرد کی ہیں- فرد سے سماج بنتا ہے اور سماج سے ریاست بنتی ہے- ہر مسلمان بذات خود ایک State ہے- ایک ریاست ہے- ہر شخص ذمہ دار اور نگہبان ہے- کیا اسٹیٹ نہ ہو تو کوئی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا- ہمارے بچپن کے زمانے میں ہمارا مسلم معاشرہ بڑا احساس تھا- معاشرے کا ایک اثر تھا اور جو لوگ سماجی قانون توڑتے تھے ان کا سماجی بائیکاٹ کر کے ان کو درست کیا جاتا تھا- اس لیے میں کہتا ہوں کہ ریاست کی ذمہ داریاں الگ ہیں، ہمیں انفرادی اور معاشرتی طور پر اپنی ذمہ داریوں کا شعور ہونا چاہیے اور اس کے لیے بیدار رہنا چاہیے-

سوال:- اسلام کی توسیع وتبلیغ کے لیے زیادہ خطرناک رکاوٹیں داخلی سطح پر ہیں یا خارجی سطح پر؟

پروفیسر عبدالحق:- میں کہوں گا کہ اسلام کو جتنے خطرات اندر سے ہیں ان سے زیادہ باہر سے ہیں اور جتنے خطرات باہر سے ہیں ان سے زیادہ اندر سے ہیں- اور میں یہ کوئی گول مول بات نہیں کہہ رہا ہوں- میں اسے تفصیل سے بتاؤں- ہمیں اپنے تحفظ وبقا کا کام خود ہمیں کرنا ہے- یہ ذمہ داری ہم کسی غیر پر نہیں ڈال سکتے- کچھ لوگ تو اتنے دلیر ہوتے ہیں کہ وہ اپنی غلطیوں کو قبول ہی نہیں کرتے- سارا وبال تقدیر پر ڈال دیتے ہیں- اپنی کوتاہیوں کی تاویل میں کہیں گے کہ چلیے یہی اللہ کی مرضی رہی ہوگی- اس کا مطلب ہے کہ آپ قصور وار نہیں ہیں- ہم آج کہتے ہیں کہ آج پوری دنیا امریکا کے ہاتھ میں ہے وہ جیسا چاہ رہا ہے ویسا کر رہا ہے- سوال یہ ہے کہ آپ کی اپنی بھی تو کچھ ذمہ داری ہے- مسلمانوں کی فراست کی قسمیں کھائی جاتی تھیں- آج وہ آپ کی فراست کہاں گئی کہ آپ اپنے ہی خلاف غیروں

کا آلۂ کار بنتے ہیں- تو جب آلۂ کار آپ بن رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے بڑا خطرہ اپنے خلاف آپ خود ہیں- آپ خود اپنے دشمن ہیں- لیکن یہ ایک پہلو ہے- دوسرا پہلو یہ ہے کہ کوئی دوسرا یہ نہیں چاہے گا کہ آپ آگے بڑھیں- یہ سچ ہے کہ عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کا بازار گرم ہے- پوری دنیا کسی نہ کسی حیلے اور بہانے سے اسلام کو، اسلامی ثقافت وتاریخ کو اور اسلامی افکار وآداب کو مسخ کرنے کے در پے ہے- ایسے میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کے لیے حساس اور چوکنا رہیں- ہم خود کو دوسروں کا آلۂ کار بننے سے بچائیں- اور اندرونی سطح پر ہر اس کام سے بچیں جس سے اسلام یا مسلمانوں کے مجموعی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہو- اور معاف کیجیے گا چلتے چلتے میں یہ بھی کہوں گا، یہ میرا ماننا ہے اور ایمان کی حد تک ہے، معلوم نہیں آپ اتفاق کریں یا نہ کریں- وہ یہ کہ اسلام کو درحقیقت کوئی خطرہ ہے ہی نہیں- اسلام کو کسی سے بھی کوئی خطرہ نہیں ہے- پچھلے پچاس ساٹھ سالوں سے میں مسلسل یہی سنتا آ رہا ہوں کہ اسلام کو اس سے خطرہ ہے، فلاں سے خطرہ ہے فلاں سے خطرہ ہے- جب کہ اسلام جوں کا توں باقی ہے- سارے مسلمان موجود ہیں اور اپنے طور پر ترقی کر رہے ہیں- دراصل خطرہ اس کو ہوتا ہے جس کی جڑ کمزور ہوتی ہے- اسلام کی بنیاد مضبوط ہے، اس کی فکر مستحکم ہے اور وہ روحانی، علمی، مادی ہر اعتبار سے مضبوط وتوانا ہے- اس لیے میرا ماننا ہے کہ اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہے-

سوال:- براک حسین اوباما پچھلے دنوں امریکہ کے صدر منتخب ہوئے- اسے دنیا کی بڑی تبدیلی کے طور پر دیکھا گیا- آپ ان کی اب تک کی کارگزاریوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس تبدیلی کے حوالے سے کیا رائے رکھتے ہیں؟

پروفیسر عبدالحق:- تکوینی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں لیکن دنیاوی نظام میں تو تبدیلی ہوں گی، اوباما صاحب بش کی پالیسیوں میں ضرور تبدیلی لائیں گے کیوں کہ بش کی پالیسیوں کے منطقی نتیجے کے طور پر ملک کساد بازاری اور دیوالیہ پن کے دہانے پر ہے اب ظاہر ہے اگر اوباما اپنے ملک کو بچانا چاہتے ہیں تو ضرور تبدیلی لائیں گے، اقتصادی پالیسی در اصل ساری پالیسیوں کی اصل ہے، عراق اور افغانستان میں جو کچھ ہوا اس کی وجہ سے امریکی

معیشت وتجارت کی بربادی ہوئی کیوں کہ ظاہر ہے کہ وہاں جوفوج لڑ رہی تھی ان پر پیسے خرچ ہوتے ہیں اب وہ فوجی مارے گئے تو معیشت کو نقصان تو ہوگا ہی- ایک ڈاکٹر پراگر چھ کروڑ خرچ ہوئے اور پھر وہ مرجاتا ہے تو صرف ایک ڈاکٹر کی موت نہیں ہے بلکہ چھ کروڑ روپے کا بھی نقصان ہے- بہر حال اوباما نے اب تک جو کچھ کیا ہے ایک اچھی تبدیلی کی علامت ہے- انہوں نے اگر اسرائیلی وزیر اعظم سے کہا کہ آپ کو مقبوضہ علاقے سے دست بردار ہونا ہوگا تو اس میں جرأت کی ضرورت تھی اور اتنا انہوں نے کر دکھایا اگر چہ لفظی طور پر ہی سہی لیکن اوباما کے پاس کوئی سلیمانی جادو ہو کہ یکسر صورت حال میں تبدیلی آجائے گی تو ایسا ہر گز نہیں ہے- اوباما سے توقعات رکھنی چاہیے اور کم از کم خوش فہمی تو ضرور ہونی چاہیے- اب دیکھنا ہے کہ اسلامی ممالک اور دوسرے ممالک کس حد تک دباؤ ڈال کر اوباما کی آواز کو پرزور بناتے ہیں- کچھ لوگوں کا مطالبہ ہے کہ اوباما کر کے دکھلائیں لیکن انہیں سوچنا چاہیے کہ پہلا مرحلہ سوچنے کا ہوتا ہے، دوسرا کہنے کا اور تیسرا کرنے کا- اگر سوچ اچھی ہے اور قول درست ہے تو عمل بھی خوش آیند ہی ہوگا-

سوال:- ابھی پارلیمانی انتخاب میں ہندوتوا کی شکست اور ہندوستان کی جیت کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سے ہندوتوا ختم ہوگیا ہے؟

پروفیسر عبدالحق:- دیکھیے میں جاء الحق وزھق الباطل والی بات تو نہیں کہتا اور نہ یہ مانتا ہوں کہ ہندوتوا کا زہر ختم ہوگیا وہ زہر اب بھی ہے بلکہ اس میں پھر سے تشدد آسکتا ہے کیوں کہ شکست خوردہ قومیں شکست کے بعد اور خونخوار ہو جاتی ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہندوستان میں ایک نیا نظام اور مزاج پیدا ہو رہا ہے- یہاں کے عوام قتل وغارت کو پسند نہیں کرتے، منافرت کے ماحول کو پسند نہیں کرتے اور دوسری بات یہ کہ کوئی بھی معیشت کو برباد نہیں دیکھنا چاہتا، علی گڑھ میں فساد ہوا، کچھ روز لوگ چپ رہے، کرفیو جھیلتے رہے لیکن معیشت پر اثر پڑا تو سرمایہ داروں نے حکومت سے خود کہا کہ اب کرفیو ختم کیا جائے وہ اس مار کو مزید نہیں جھیل سکتے اور دوسری طرف فرقہ پرست پارٹی کا حال یہ ہے کہ پہلے بابری مسجد کی مسماری اور پھر اڑیسہ میں عیسائیوں کا خون اور پھر بنگلور میں بدتمیزی کی، اب انہیں کون

پسند کرے گا، ہندوستانی عوام نے بتادیا ہے کہ ایسوں کی ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے اور مسلمانوں نے خصوصا اس بار بلوغت ذہنی کا ثبوت دیا ہے- انہوں نے ایک جٹ ہوکر بڑے بڑوں کو سبق سکھا دیا حالانکہ اس بار بھی زرخرید افراد میدان میں لائے گئے لیکن انہوں نے اتفاق کا مظاہرہ کیا، لیکن یاد رہے کہ سیاسی شعور کا یہ مظاہرہ دراصل سیاسی شعور کا پانچ فیصد بھی نہیں ہے اور یہ سیاسی شعور بھی منافرت پھیلانے والی طاقتوں کی مرہون ہے، اقبال نے پتے کی بات کہی ہے:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے

بہر حال اس پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی عوام امن چاہتے ہیں منافرت نہیں، اور جو اس سکون میں حائل ہوگا اس کا خاتمہ ہوگا بلکہ سنگسار بھی کیا جائے گا-

سوال:- اس پارلیمانی انتخابات میں دیکھا جائے تو دلتوں کی نمائندگی، عورتوں کی نمائندگی بڑھی ہے لیکن مسلمانوں کی نمائندگی آزادی کے بعد کی تاریخ میں کم ہوتی جارہی ہے- اس بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

پروفیسر عبدالحق:- دیکھیے اگر آپ پچھلے جواب میں غور کریں تو اس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ ہمارا شعور مائل بہ زوال ہے- ہماری صفوں میں انتشار ہے- کوئی مرکزی تنظیم نہیں جو ہماری رہبری کر سکے- جن تنظیموں، خانقاہوں کی طرف سے مختلف پارٹیوں کے حق میں حمایتی بیان چھپے وہ عموماً زرخرید قسم کی تھیں اور دوسری بات یہ ہے کہ پہلے سیاست ذات پات کی بنا پر نہیں ہوتی تھی، شخصیت وکردار کی بنا پر ہوتی تھی، ذات پات کی سیاست کا آغاز تو چودھری چرن سنگھ نے کیا، پہلے مولانا آزاد جیسے سیاست داں تھے ان کو ہمہ جہت حمایت ملتی تھی اس لیے کامیابی کا تناسب زیادہ تھا- تیسری بات یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں جمہور کو ساتھ لیے بغیر نہیں چل سکتے لیکن لوگوں نے اس نکتے کو فراموش کر دیا، اعظم گڑھ سے علما کونسل نے امیدوار کھڑا کر دیا لیکن وہ اپنی بساط بھول گئے کہ یہاں ہماری اتنی آبادی نہیں ہے کہ جمہور کو ساتھ لیے بغیر آگے بڑھ سکیں اس سے نقصان ہوا- چوتھی بات یہ کہ آج کی ہماری قیادت کم علم، کم نگہ اور جہالت سے بھری ہوئی ہے، جو نمائندگی کے لیے میدان میں

اترتے ہیں ان میں قیادت کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی، ان سارے اسباب کی بنیاد پر نقصان ہوا اور مسلم نمائندگی کے تناسب میں کمی آئی-

سوال: - آپ طویل تعلیمی تجربہ رکھتے ہیں، اس کی رشنی میں بتائیں کہ تعلیم کی ضرورت واہمیت کے حوالے سے مسلمانوں میں کتنی بیداری آئی ہے؟

پروفیسر عبدالحق: - بیداری آئی ہے اور آرہی ہے لیکن شاید وہ بھی ''طوفان مغرب'' کے نتیجے میں ہے، ویسے بھی پورا معاشرہ بدل رہا ہے تو مسلمان اس سے کیسے الگ رہ سکتے ہیں لیکن آبادی کے تناسب کے لحاظ سے خاطر خواہ تبدیلی نہیں آرہی ہے، دہلی یونیورسٹی میں ڈھائی فیصد مسلمان ہیں مجموعی آبادی کے لحاظ سے یہ تناسب کس قدر کم ہے، ہاں ہمارے دینی اداروں نے علم ودانش کا فیضان عام کیا ہے اور کررہے ہیں ان کی وجہ سے بہت سے مدارس کے فارغین یونیورسٹیز میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں، سید حامد صاحب کی کوششیں بھی اس سلسلے میں قابل قدر ہیں لیکن مسلمانوں کی یہ بیداری بھی روزی روٹی سے جڑی ہے اور کسی بھی قوم کا کام اس وقت بنتا ہے جب بیداری کا محرک علمی شغف اور علمی جنون ہو، پہلے علمی جنون تھا تو شبلی نے سیرت النبی کی جلدیں چارپائی پر بیٹھ کر لکھ دیں، اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پچھلے پچیس سالوں میں، دور نہ جائیے، دہلی میں کوئی ایسا مفسر، محدث یا فقیہ نہیں ہے جس کی جانب رجوع کیا جاسکتا ہو، کوئی سیرت کا اسکالر نہیں ہے جس کی بات سنی جائے- اکیڈمیاں اور ادارے تو ہیں لیکن جنون نہیں ہے، بیداری کے حوالے سے مدارس کا معیار تعلیم اور اسلوب تعلیم دونوں تشویس ناک حد تک خراب ہے، اس میں بہتری لائی جانی چاہیے-

سوال: - اردو کی زندگی مذہبی لٹریچر اور مذہبی صحافت پر کس حد تک انحصار کرتی ہے؟

پروفیسر عبدالحق: - مذہب، مذہبی اقدار اور روحانیت کے بغیر کوئی عظیم تخلیقی ادب وجود میں نہیں آسکتا ملٹن کی Paradise Lost، تلسی کی مہابھارت اور ملک محمد جائسی کی پدماوت سب کا مصدر مذہب ہے، مولانا احمد رضا خاں مرحوم کی نعت 'لم یات نظیرک' ادب کا شاہکار ہے- اس کا منبع مذہب ہے، مولانا مودودی کی 'پردہ' شبلی کی سیرت النبی، مولانا علی

میاں کی 'روائع اقبال' قرآن کریم کے تراجم وتفاسیر سب کے مصادر مذہب ہیں- نعت، منقبت، مرثیہ سب کے سب مذہب سے اکتساب فیض کرتے ہیں- حاتم، سودا وغیرہ بڑے دوسرے شعرا وادبا نے مذہب سے اپنے ادب کی آبیاری کی ہے، قرۃ العین حید کو لے لیجیے ان کے یہاں بھی عریانیت وفحاشی کے بجائے مذہبی اقدار کی فراوانی ہے، سب کے ادب میں مذہب کی آمیزش ہے- کہنا یہ ہے کہ مذہب، روحانیت اور مذہبی اقدار کے بغیر نہ ادب وجود میں آتا ہے نہ پروان چڑھتا ہے اور نہ اس کو بقا ودوام ملتا ہے- اردو، مذہب کے احسانات کے زیر بار ہے-

سوال: - آپ کے پاس اس کے کیا دلائل ہیں کہ اردو کی بقا ضروری ہے اور اس کو کیسے باقی رکھا جاسکتا ہے؟

پروفیسر عبدالحق: - دیکھیے! زبان کے بارے میں مشہور مقولہ ہے:

It is a transparent medium for the transmisson of thought

زبان خیالات کے بے کم وکاست اظہار کا مضبوط ذریعہ ہے- مادری زبان میں ترسیل اچھی طرح ہوتی ہے، دوسری بات یہ کہ اردو پندرہ سو سال کی ہماری فکری میراث کا نام ہے- یہ صرف ڈھائی سو سال کی زبان نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ اردو کی پیدائش اس قدیم میراث کا دراصل ایک حصہ ہے کیوں کہ اگر غور کریں تو پتا چلے گا کہ اردو کی ابتدا پندرہ سو سال قبل ہوئی ابن مریم کی تلمیح، وادی ایمن، جلوہ گہ جبریل، یہ ساری تعبیرات پندرہ سو سال قبل کی ہیں، اردو کی بقا اور حفاظت اس لیے ضروری ہے کہ یہ ہمارے ذہنی فروغ کا ذریعہ ہے، اس لیے نہیں کہ ہندی سے ہمیں کوئی بیر ہے وہ تو قومی زبان ہے، لیکن مستقبل میں اگر کوئی دوسرا اقبال پیدا ہوگا تو اردو کی اسی فکری میراث کی وجہ سے، ہندی میں کبیر تو پیدا ہوسکتا ہے اقبال نہیں- تیسری بات یہ کہ اردو زبان میں ہمارا عظیم مذہبی سرمایہ ہے- قرآن و حدیث کے تراجم وتفاسیر، فقہ کی کتابیں اور دوسرے سرمائے، یہ سب عربی میں بھی ہیں لیکن عربی کے ساتھ اردو میں بھی ہیں- اس کے علاوہ مناظراتی ادب کا بھی اردو میں بڑا سرمایہ ہے، مختلف مذاہب آریہ سماج وغیرہ کے ساتھ مناظرات، مختلف مسالک کے باہمی

مناظرات، اتنے مناظرات ومباحثات ہیں کہ اتنا ہندوستان کے علاوہ دوسری جگہوں میں نہیں ہیں- چوتھی بات یہ کہ ہندوستان میں مسلم دانشوروں کی جو کہکشاں (Galaxy) ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی، مولانا احمد رضاں خاں، شبلی نعمانی، مولانا آزاد اور مولانا مودودی وغیرہ بہت سی مثالیں ہیں، ایسا اس لیے کہ ہندوستانیوں میں تیز نگاہی ہے، اقبال نے بڑی اچھی بات کہی ہے:

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

ان ساری باتوں پر غور کریں تو پتا چلے گا کہ اردو کی بقا کس حد تک ضروری ہے اور کیوں ضروری ہے؟

آپ کے سوال کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اردو کو کیسے باقی رکھا جائے دیکھیے بزرگوں کا کہنا ہے محکم گیر، دانت سے پکڑے رہیے، پڑھیے، لکھیے اور عام کرنے کی کوشش کیجیے، اگر ہم ایسا نہیں کرتے ہیں تو ہماری عالمی اجتماعیت ختم ہو جائے گی، اردو بین الاقوامی زبان ہے، پڑوسی ملک کی زبان ہے، اگر ہم اردو نہیں پڑھیں گے تو کٹ کر رہ جائیں گے- ویسے بھی یہ بات یاد رکھیے کہ مسلمانوں سے جڑی ہوئی ہر چیز پر بدخواہوں کی نظر ہے- وہ ہماری اجتماعیت کو پارہ پارہ کر دینا چاہتے ہیں- دوسری بات یہ کہ اردو ہمارا امتیاز ہے، ہماری ثقافت کا مظہر ہے، ہماری زبان کی شستگی و شائستگی کے سارے لوگ قائل ہیں، لوگ ہماری زبان کی وجہ سے ہماری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسے سیکھنا چاہتے ہیں، ہر آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اچھی اردو کا استعمال کرے، اگر آپ دھیان دیں تو پتا چلے گا کہ مندروں میں جو بھجن ہوتا ہے، جو کرتن ہوتا ہے اس میں بھی اردو الفاظ ہوتے ہیں، فلمی گانے بھی اردو میں ہوتے ہیں اور ہر کوئی اسے گنگناتا ہے- اب جب کہ یہ اردو ہمارا نشان امتیاز ہے، اگر ہم اردو نہیں پڑھتے ہیں، نہیں بولتے ہیں تو گویا ہم اپنی ثقافت سے قطع تعلق کر رہے ہیں اور اردو کو عام کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ خوب بولی جائے، خوب لکھی جائے، صحافت کے ذریعے نئی نسل کو ایسا مواد فراہم کیا جائے جس سے ان کی ذہنی سطح بلند ہو اور وہ اردو کی طرف مائل ہو سکیں-

سوال:- آج جب کہ اردو تعلیم اور اردو طلبہ کا معیار گرتا جا رہا ہے ایسے میں دہلی یونیورسٹی میں اردو کی صورت حال کیسی ہے؟

پروفیسر عبدالحق:- مجھے دہلی یونیورسٹی چھوڑے ہوئے ۵/سال ہو گئے، اور تبدیلی تو ہر لمحے ہوتی رہتی ہے- خیر پھر بھی یونیورسٹی سے کسی نہ کسی طور پر ربط ہے اور حالات سے بڑی حد تک واقفیت بھی- میں یہاں ایک عمومی بات یہ کہنا چاہوں گا کہ پچھلے ۵/۱۰/سالوں سے حالات میں بڑی مثبت تبدیلی آئی ہے- آپ اندازہ لگائیے کہ میں ۱۹۶۵ء میں جب میں دہلی یونیورسٹی میں حاضر ہوا تھا تو اس وقت ایم اے سال اول میں صرف ۶ یا ۷ طلبہ تھے- اور آج کی صورت حال یہ ہے کہ اگر اساتذہ اجازت دیں تو یہ تعداد سو سے بہت آگے بڑھ سکتی ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس کے لیے صرف ۵۰ ہی سیٹیں ہیں- یہ بھی خیال رہے کہ اس وقت صرف ایک یونیورسٹی تھی جہاں اردو کی تعلیم ہو رہی تھی آج تین تین یونیورسٹیاں ہیں جہاں اردو کی تعلیم ہو رہی ہے- جب میں دہلی یونیورسٹی میں تھا اس وقت صرف اردو کے سرٹیفیکٹ کورس کے لیے پانچ پانچ سو درخواستیں آتی تھیں جن میں سے ۲۵/۳۰/ کے داخلے ہوتے تھے- اب تو ان درخواستوں کی تعداد سنا ہے ۱۵۰۰ سے تجاوز کر چکی ہے- خیال رہے کہ یہ سرٹیفکٹ کورس کی درخواستیں ہوتی ہیں، اس کا مقصد ملازمت کا حصول نہیں صرف اردو کی ابتدائی تعلیم کی تحصیل ہے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس طرح کے سارے طلبہ مسلم نہیں ہندو ہوا کرتے ہیں جن کو اردو کی شیرینی کھینچ لاتی ہے- آج کون شخص ہے جو اپنی زبان سے دوسروں کو متاثر نہیں کرنا چاہتا- آج نوجوانوں کی سب سے بڑی ترجیح بن گئی ہے کہ وہ زبان کو سدھاریں اور ش ق درست کریں- اس کے لیے وہ اردو سیکھنا ضروری سمجھتے ہیں، تو یہ تو اردو کا جادو ہے جو آج اس زوال کے دور میں بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے- الہ آباد یونیورسٹی میں کچھ سالوں قبل ایم اے میں ۴/۵/طلبہ بمشکل ہوا کرتے تھے آج تقریباً سو طلبہ وہاں ایم اے کر رہے ہیں اور کئی سو درخواستیں آتی ہیں- گورکھپور یونیورسٹی میں ۱۹۶۲ء میں بمشکل ۵/طلبہ ایم اے میں ہوا کرتے تھے پچھلے دنوں میں وہاں گیا تھا معلوم ہوا کہ ۱۰۵ طلبہ ریگولر ایم اے فائنل میں ہیں اور ۶۵ پرائیویٹ ہیں، اور یہ تعداد صرف لڑکوں کی ہے تقریباً

اتنی ہی تعداد لڑکیوں کی الگ ہے- پچھلے دنوں جب میں کراچی گیا تھا تو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ایم اے کے طلبہ کی تعداد معلوم کی تو پتہ چلا کہ ایک سو سے کچھ متجاوز ہے- میں نے حیرت کی اور انہیں بتایا کہ صرف کشمیر یونیورسٹی میں ۱۲۰ رطلبہ ایم اے کرتے ہیں اور ان میں ۲۰ وہ طلبہ ہوتے ہیں جو ۲۵۰۰۰ روپے دے کر داخلہ لیتے ہیں- یہ انفرادی خصوصیت ہے وہاں کی اور باقی طلبہ کے لیے ٹیسٹ ہوتا ہے اور رہ گئے مراسلاتی کورس کرنے والے ایم اے کے طلبہ تو کشمیر یونیورسٹی میں ایسے طلبہ کی تعداد ۲۰۰۴ میں ۲۰۰ تھی، ۲۰۰۵ میں ۶۰۰ او رپچھلے سال یہ تعداد ۹ سو پہنچ گئی- اس پر ان لوگوں کو بھی تعجب ہوا- خیر میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان تمام پہلوؤں پر نظر کیجیے تو پھر یہ کہنا بے معنی ہوگا کہ اردو زبان یا اردو تعلیم زوال کا شکار ہے—صرف دہلی یونیورسٹی ہی نہیں، تمام یونیورسٹیوں میں بلکہ زندگی کے تمام میدانوں میں اردو مقبول ہوتی جارہی ہے- اور خاص طور پر اس صارفیت کے ماحول نے تو اس کے لیے اور امکانات بڑھا دیے ہیں- اب تو ہلدی رام اور لائف بوائے کے پیکٹ پر بھی اردو تحریریں نظر آرہی ہیں- یہ اردو کی مقبولیت ہی تو ہے- □□□

(شمارہ جولائی ۲۰۰۹ء)

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے صدر شعبۂ اردو

ادب ، مذہب اور تصوف کے باہمی رشتے کو ختم کر کے جب سے انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا گیا تصوف خرقہ پوشوں کی خانقاہوں سے ہوش مندوں کی درگاہوں میں چلا گیا، ادب مذہب بیزاری کی علامت بن گیا اور مذہب کو تنگ نظری وکوتاہ بینی کا منبع سمجھ لیا گیا، نتیجہ کے طور پر صوفیہ ناپید ہوتے چلے گئے، ادب پر مارکس وادیوں کا قبضہ ہو گیا اور مذہب کا دائرہ سمٹ کر مسجد سے مدرسے تک رہ گیا، اس غلطی کا احساس اردو کے معروف استاذ و دانشور قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کو بھی ہے، جن سے جام نور کے لیے ہم نے ادب ، مذہب اور تصوف کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی- قاضی صاحب ضلع بستی (یوپی) میں جولائی ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد شہر علم وفن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تکمیل کی، ڈاکٹریٹ کی تھیسس ''شعریات اقبال'' زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم وفن سے داد وتحسین وصول کر چکی ہے- تعلیم سے فراغت کے بعد چند مہینے آپ نے علی گڑھ میں ہی تدریسی فرائض انجام دیے، ۱۹۷۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی آ گئے، ۱۹۹۲ء میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو بن گئے اور تا حال اس عہدے پر فائز ہیں- بیچ میں ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۰ء آپ تاشقند میں اردو کی تدریس کے لیے قیام پذیر رہے، جو سویت یونین کے ماتحت تھا، اب تک نصف درجن کتابیں اور پچاسوں مضامین مطبوع ہو چکے ہیں، درجنوں ادبی و مذہبی سمیناروں میں شریک ہو چکے ہیں- قاضی صاحب ادبی گروہ بندویوں سے الگ رہ کر زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہیں- تصوف کے تعلق سے اگر چہ ان کے خیالات روشن ہیں، تاہم تصوف مخالف لٹریچرز کے سحر سے بھی مکمل بچ نہیں سکے ہیں-

سوال:-ادب اور تصوف کے درمیان کس طرح کا رشتہ ہے

پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی:-اردو ادب کی دو سو سالہ قدیم تاریخ ہے اور اگر آپ جنوبی ہند سے اس کی ابتداء کریں تو وہاں پر بہت کافی تصوف کا عمل دخل رہا ہے، اس لیے اس کا اثر وہاں کی شاعری اور وہاں کی نثر پر بہت گہرا پڑا، اگر آپ ''سب رس'' پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ اس کی نثر پر تصوفانہ فکر کا بڑا گہرا اثر ہے، ولی محمد دکنی جو اردو کے اولین شعرا میں ہیں اور ان میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے، یہ بھی جنوبی ہند کے شاعر تھے، ان کا کلام پڑھیے تو اس میں بھی تصوف کا گہرا رنگ نظر آئے گا، ان کی غزلوں میں بظاہر مجازی محبوب کی طرف اشارہ ہے لیکن اگر آپ چاہیں تو اس طور پر بھی اس کی تشریح کر سکتے ہیں جس میں حقیقت کی جلوہ نمائی ہے اور یہ حقیقت و مجاز کی اصطلاح بھی تصوف کی ہی ہیں، خلاصہ یہ کہ ہماری سوسائٹی میں تصوف کی بڑی ہی مضبوط بنیادیں رہی ہیں اور اس کا اثر اردو شاعری پر تو بہت ہی نمایاں ہے، پچھلے دو ڈھائی سو سالوں میں کوئی ایسا دور نہیں رہا جس میں اس کا اثر نہ رہا ہو اور صرف شاعری ہی نہیں ادب کی کوئی صنف بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی ہے، اسی لیے جو لوگ تصوف کے پس منظر پر نظر نہیں رکھتے، تصوف کے رموز و اسرار سے آشنا نہیں ہوتے، انہیں ادب کو پڑھنے اور سمجھنے میں خاصا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد بھی ایسے لوگ جب مسند تدریس پر آتے ہیں تو انہیں تصوف سے ناآشنائی کی وجہ سے ادب کی تفہیم میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ادب تو ام العلوم ہے، جس کا مطلب ہوا کہ ہر علم کا کچھ نہ کچھ حصہ اس سے ضرور وابستہ ہے، اور تصوف سے اس کی وابستگی تو بہت گہری ہے-

اس کے ساتھ میں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ میں کبھی بھی یہ نہیں کہتا کہ دونوں علوم ایک ہی ہیں، تصوف اور ادب دونوں الگ الگ ہیں، تصوف کی تاریخ الگ ہے، ادب کی تاریخ الگ ہے، لیکن اس کے باوجود تصوف ادب پر بہت ہی زیادہ اثر انداز رہا ہے، پچھلی صدی کی ۶۰/ اور ۷۰/ کی دہائی کے بعد تو اس کی بنیادیں کچھ کمزور ہوئی ہیں، جس کی

وجوہات بھی ہیں، سماجی اور معاشرتی تنظیم چوں کہ مغربی نظام سے کافی متاثر ہوئی ہے، بہر کیف اس سے پہلے کے دور میں یعنی ۱۸/ رویں اور ۱۹/ رویں صدی میں تصوف کا اثر سماج پر بہت ہی زیادہ تھا-

سوال:-جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامیات کے نصاب میں تصوف کا حصہ بھی داخل ہے، لیکن اس کے بارے میں بہت سے لوگوں کا مطالبہ ہے کہ اس کو نصاب سے خارج کر دیا جائے کیوں کہ تصوف اسلام کی خالص فکر سے متصادم ایک الگ چیز ہے، آپ ان کی اس بات سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی:-اس طرح کی جو بات کی جاتی ہے اس کی بھی بنیاد ہے، اس کے پیچھے بھی ایک فکر ہے، جیسے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کہنا ہے کہ تصوف کی کوئی روایت خواہ کتنی بھی صحیح ہو اس پر ہندو فکر اور ہندوانہ روایت کا جو اثر ہے اس کی وجہ سے تصوف ایک مستقل فلسفہ اور علم بن گیا اور اس کے اندر ایک تخصیص پیدا ہوگئی، جس طرح اسلام سب کے لیے ہے، اس میں توسع اور گنجائش ہے وہ بات اس میں نہ رہی، کیوں کہ وہ ایک پیچیدہ فلسفہ بن گیا جس پر عام آدمی کا عمل پیرا ہونا دشوار ہے-تو جو لوگ بھی تصوف کی مخالفت کرتے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ تصوف پر ویدانتی فکر کا اثر ہے اور یہ طرز حیات نہ رہ کر ایک فلسفہ بن گیا- ڈاکٹر اقبال بھی تصوف کے مخالف تھے، اسے ناپسند کرتے تھے حالانکہ وہ خود مذہبی اور متصوفانہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہمارے ملک کی اکثریت کا جو مذہب ہے جو فلسفہ ہے یہ تصوف پر بہت زیادہ اثر انداز رہا، ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے بھی تصوف کو ان سے الگ کرنے کی باضابطہ کوشش نہیں کی لیکن یہ صرف ایک پہلو ہے، تصوف کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تصوف اخلاص وللّٰہیت اور مذہب کی جو دوسری قدریں ہیں ان کو عملی طور پر برتنے کی تاکید کرتا ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا-

سوال:-تصوف کے تعلق سے جو کچھ بھی آپ نے کہا اسے زیادہ سے زیادہ ہندوستانی تناظر میں ایک حد تک صحیح مانا جا سکتا ہے، کیوں کہ ویدانتی فکر کے اثر انداز ہونے کی بات اسی تناظر میں کی جا سکتی ہے، لیکن تصوف کی روایت تو بہت قدیم ہے، امام غزالی

اور دوسرے عرب علماء تصوف کے بڑے حامیوں میں سے ہیں، ان کے بارے میں یہ کوئی کہے کہ وہ ہندوانہ فکر سے متاثر تھے تو یہ عجیب بات ہوگی۔

پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی:- دراصل اس وقت ہم جس تناظر میں تصوف پر گفتگو کررہے ہیں، یہ ہندوستانی تناظر ہی ہے، یہاں کا تصوف ہمارے سامنے ہے اور گفتگو اسی کے تعلق سے ہے، ماضی سے نہیں ہے، ماضی میں اس کا سرچشمہ تو بہت پاکیزہ تھا، اس پر غیر اسلامی افکار کے اثرات پڑے ہی نہیں تھے، ہندوستان میں آکر ہندو افکار، شنکراچاریہ کے افکار، بدھ مت اور دوسرے افکار و مذاہب کے اثرات اس پر پڑے اور یہ بات بلا تردید کہی جاسکتی ہے اور اسی وجہ سے بعض علما نے اس کی مخالفت کی، کیوں کہ دور اخیر میں اس کی صورت ہی بدل گئی، وہ پہلی والی بات نہیں رہی۔ پہلے تو تصوفانہ فکر اور اسلامی فکر میں ہم آہنگی تھی، بلکہ دونوں کو ہم ایک ہی کہہ سکتے ہیں، دونوں میں جو فرق تھا وہ بس اتنا کہ جو لوگ مذہبی امور کی نمائندگی کرتے ہیں، ان میں ظاہر داری زیادہ ہوتی ہے اور یہ بات تصوف میں نہیں پائی جاتی، اس میں ظاہر داری کی بجائے خلوص کی کارفرمائی ہوتی ہے، عبادت خالص ہوتی ہے اور وہ خدا اور بندے کے درمیان جو رشتہ ہے اسے محکم بناتی ہے۔ تصوف میں صرف نماز، روزہ اور دوسرے جو امور ہیں صرف ان کی ظاہر داری پر اکتفا نہیں کیا جاتا۔ اہل تصوف کے یہاں ایک بات اور بھی بڑی اچھی ہے کہ وہ رنگ و نسل اور مذہب و ملت میں کسی طرح کی تفریق کیے بغیر اپنی مجلس میں سب کو آنے دیتے ہیں، صوفیہ کے اس عمل سے اسلام کو بھی بے پناہ تقویت ملی، اسلام کا فروغ ہوا، علماء کی کوششوں سے بھی بلاشبہ اسلام کا فروغ ہوا، لیکن جتنا فروغ صوفیہ کے کردار و عمل سے ہوا وہ علما سے نہیں ہوسکا۔ یہ وہ مباحث ہیں جن پر گفتگو ہوتی رہے گی اور ہونی چاہیے بھی، لیکن میرا خیال ہے کہ اسلام ایک اعتدال پسند مذہب ہے، اس لیے تمام امور میں ہمیں اعتدال کی راہ اپنانی چاہیے، کسی ایک پہلو پر بہت زیادہ زور دینا اور غلو پر آمادہ ہوجانا صحیح نہیں۔ اسلام یہی چاہتا ہے کہ آپ ایک اچھے انسان بنیں اور اتنی زیادہ خود فریبی کا شکار نہ ہوں کہ پوری دنیا حقیر نظر آنے لگے، ہر چیز میں اپنے آپ کو نمائندہ سمجھنے لگیں، یہ اسلام کی فکر کے بھی خلاف ہے اور تصوف کی فکر کے بھی خلاف ہے۔

سوال:- اقبال فکری طور پر مولانا روم سے بے پناہ متاثر ہیں اور رومی خود ایک صوفی شاعر تھے، اس کے علاوہ اقبال کے بے شمار اشعار اس قسم کے ہیں جو تصوف اور اہل تصوف کی ترجمانی کرتے ہیں، مثال کے طور پر ان کا ایک شعر ہے:

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اس طرح کے اور بھی اشعار ہیں، پھر ان سب کے ہوتے ہوئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اقبال تصوف مخالف کیسے تھے؟

پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی:- جی ہاں! بلاشبہ اقبال کے اشعار پر تصوف کا گہرا اثر ہے، تصوف پر ان کی نثر بھی ہے، ان کا مقالہ بھی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے بتایا کہ تصوف پر مختلف ادوار میں جو خارجی اثرات پڑتے گئے تو اقبال نے انہی کی مخالفت کی ہے، اقبال وہ پہلے مفکر ہیں جنہوں نے تصوف پر پڑے خارجی اثرات کی نشاندہی کی اور ان کو خالص اسلامی تصوف سے الگ کیا، انہوں نے عالمی تناظر میں تصوف کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر یہ بتایا کہ کس طرح عہد بہ عہد جو حقیقی تصوف ہے وہ غائب ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ دوسرے افکار و اعمال لیتے گئے۔ تصوف کی بنیاد تو اسلام کے اولین عہد میں پڑ چکی تھی، چند مخلص خرقہ پوشوں نے عملی اسلام کے محل کی تعمیر کی تھی، انہیں دنیا سے دلچسپی نہیں تھی، گوشہ نشین تھے، اسی میں ان کو لطف آتا تھا اور دراصل عبادات کا وہی مقصد بھی ہے، تو حاصل یہ کہ تصوف و روحانیت کی تاریخ تو بہت قدیم ہے، بلکہ اسلام سے بھی پہلے سے ہے، اقبال نے ان سب کا مطالعہ کیا اور تجزیہ کرکے بتایا کہ اسلامی تصوف کیا ہے اور اس پر پڑنے والے غیر اسلامی اثرات کیا ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقبال کبھی بھی اس مسئلہ میں تذبذب کا شکار نہیں ہوئے اور تصوف کے نام پر جو کچھ بھی ڈھونگ ہے کبھی بھی اس کی حمایت نہیں کی بلکہ کھل کر اس کی تردید کی۔ لیکن اس کے ساتھ آپ کی بات بھی درست ہے کہ اقبال کی شاعری پر اسلامی تصوف کا گہرا اثر ہے، شروع میں ان پر تصوف کا اور بھی زیادہ اثر تھا، لیکن بعد میں جب انہوں نے عصری چیلنجیز اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کی ضرورت محسوس کی تو اپنے

نوجوانوں کے سامنے تصور خودی پیش کیا تاکہ وہ زندگی کے جو چیلنجیز ہیں انہیں Face کرسکیں- خدا نے کس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے یہ تو کسی کو نہیں معلوم، اس لیے تقدیر پر بھروسہ کر کے مسلم نوجوان بیٹھے نہ رہیں، بلکہ وہ اپنی کوشش اور جدوجہد کے ذریعہ انسانی معاشرے میں اپنا مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں، اقبال کا کہنا تھا کہ مسلم نوجوان ہی ہمارا سرمایہ ہیں، ہمارا مستقبل ہیں، اگر یہ راستے سے بھٹک گئے، اگر یہ بیٹھ گئے تو قوم کا مستقبل کیا ہوگا؟ اسی لیے شاعری کے ذریعہ انہوں نے نوجوانوں کو پیغام دیا اور خودی کا فلسفہ دیا تاکہ مسلم نوجوان بےخودی میں نہ رہیں- حافظ شیرازی کی شاعری جو ایک طرح کی نشہ آور شاعری ہے اور زندگی سے فرار کی دعوت دیتی ہے اقبال اسے باعث ہلاکت بتاتے تھے، اس کی تردید کرتے تھے- خلاصہ یہ کہ تصوف پر جو راہبانہ فکر اثر انداز ہوئی اس کے وہ سخت مخالف تھے، میر تقی میر کا وہ مشہور شعر ہے جس کا تصوف سے تعلق ہے-

نا حق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

وہ اس طرح کی شاعری کو سخت ناپسند کرتے تھے، اقبال کا ماننا تھا کہ انسان کے اندر تسخیر کائنات کی قوت ہے اور انسان اس قوت کو استعمال کرے نہ یہ کہ راہبانہ زندگی گزارنے لگے اور زندگی کی قدروں سے بھاگنے کی کوشش کرے-

سوال :-تصوف کے میدان میں جو زوال آیا ہے، آپ کی نظر میں اس کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟

پروفیسر عبدالرحمٰن ہاشمی:-دیکھیے! تصوف پر میری کوئی گہری نظر نہیں ہے، اس کے باوجود میں یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے جیسے معاشرے پر مادیت کا غلبہ ہوتا گیا روحانیت کی باگ ڈھیلی پڑتی گئی، مادیت کے غلبہ کی بھی وجوہات ہیں، جب ہم مشرق والے مغرب سے بے خبر تھے، تو اس وقت ہماری ایک اپنی دنیا تھی جس میں ہماری سادہ زندگی تھی، سماجی اتحاد اور بھائی چارے کا مزاج تھا، طبیعت میں انکساری اور اس طرح کی اور بھی ہماری دوسری اقدار تھیں جو اہل مغرب سے مختلف تھیں، تو جب تک مشرق و مغرب کے بیچ فاصلہ رہا، اس وقت

تک ہمارے یہاں دین تھا، تصوف تھا روحانیت تھی، لیکن جیسے جیسے مشرق و مغرب کی یہ دوری ختم ہوتی گئی ہماری سوسائٹی پہ مادیت کا غلبہ ہوتا چلا گیا، مسائل پیدا ہو گئے، ضرورتیں بڑھ گئیں اور ہر چیز کو افراط کے ساتھ حاصل کرنے کی ہمارے اندر خواہشیں پیدا ہو گئیں- اب اس کے بعد جو ہماری مذہبی، اخلاقی اور روحانی بنیادیں تھیں آہستہ آہستہ کمزور ہوتی چلی گئیں اور آج نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ جو لوگ آج مذہب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں بسا اوقات وہ مادی فائدے کے حصول کے لیے خود مذہب کا استحصال کرتے ہیں، تو ہر طرف مادیت کا ہی بول بالا ہے، ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بلا سے ہم کو بچائے- یہ اتنا بڑا سیلاب ہے جو پوری دنیا کو بہائے جا رہا ہے، اس کے اندر چونکہ ظاہری کشش بھی ہے جو اپنی طرف سب کو کھینچ رہی ہے اور اس سے صرف اہل اسلام کے لیے ہی مسائل کھڑے نہیں ہوئے ہیں، ہر مذہب کے لوگ پریشان ہیں، مادیت نے سماجی توازن کو ختم کر دیا ہے اور یہ سب کے لیے ایک طرح کا چیلنج ہے-

سوال :-اس وقت آپ کی نظر میں دنیا کا کوئی ایسا ملک ہے جہاں کی تہذیب، ادب اور شاعری پر تصوف کا اثر ہو؟ ماضی میں تو اس کی ڈھیر ساری مثالیں ہیں لیکن کیا آج بھی کسی جگہ لوگ تصوف کی طرف بڑھ رہے ہیں؟

پروفیسر عبدالرحمٰن ہاشمی:-تصوف ایک ایسی دلکش حقیقت ہے جس کی طرف ہر دور میں عوامی رجحان اور دلچسپی رہی ہے، وہ ممالک جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مادیت وہیں کی پیداوار ہے، امریکہ، فرانس، یورپ، وہاں پر بھی ایک بڑے طبقے میں روحانی تشنگی ہے، انہیں روحانی اضطراب کو دور کرنے کے لیے کسی ایسی چیز کی تلاش ہے جو ان کی روح کو مطمئن کر سکے، وہ اس وقت اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں انہیں تمام تر مادی آسائش حاصل ہے، ان کو کسی چیز کی کمی نہیں ہے، لیکن اس سب کے باوجود ان کا ضمیر، ان کی روح مطمئن نہیں ہے اور اب وہ مادیت سے کسی ایسی طاقت کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں جہاں ان کے جسم کی طرح ان کی روح بھی مطمئن ہو سکے- ہمارے ملک میں تو بہر حال اب بھی مذہبیت اور روحانیت کا کافی اثر ہے، لیکن اس کے باوجود یہاں لوگ مادیت کی طرف للچائی ہوئی

نظروں سے دیکھتے ہیں بلکہ وہ ادارے بھی جو تصوف اور خانقاہیت کے نام پر قائم ہو رہے
ہیں ان میں بھی بڑی حد تک مادی فکر کی ہی کارفرمائی ہے، لیکن آپ کو ان متمول ممالک میں
جہاں معیشت کا کوئی مسئلہ نہیں، یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہاں پر بھی بہت سے مخلص، شریف
، نیک طینت لوگ ایسے ہیں جو تصوف اور روحانیت کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں، سچے
مذہب کی تلاش میں سرگرداں ہیں، ذہنی روحانی اذیت دور کرنے کے لیے سچی روحانیت کی
تلاش میں ہیں- ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑی ہے اور پوری دنیا میں ہے- ہم یہ بالکل نہیں
کہہ سکتے کہ تصوف کی دلکشی آج کم ہوگئی ہے، آج بھی عوام کو اس کی تلاش ہے ضرورت ہے
کہ ہم اس کو صحیح ڈھنگ سے پیش کریں-

سوال :- ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت یہ کون سی بلا ہے؟ اس پر روشنی
ڈالتے ہوئے آپ اپنے بارے میں بتائیں کہ آپ کی ذہنی وابستگی کس سے رہی ہے؟

پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی:- بھئی! میں کبھی بھی ترقی پسند نہیں رہا، کیوں کہ ترقی پسند بننے
کے لیے جو صلاحیتیں درکار تھیں وہ میرے اندر نہیں تھیں اور نہ ہی میں نے انہیں حاصل
کرنے کی کوشش کی- جدیدیت کی طرف ایک میلان ضرور تھا لیکن اس سے بھی باضابطہ طور
پر میری وابستگی نہیں رہی، اس کے بعد مابعد جدیدیت کا دور آیا، لوگ بتاتے ہیں کہ ۷۰/۸۰
کی دہائی کے بعد جدیدیت کا دور ختم ہوگیا، یہ بعد کا دور مابعد جدیدیت کا ہے، لیکن یہ بھی
میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ کیسے اچانک جدیدیت کا دور ختم ہوگیا اور مابعد جدیدیت کا دور آ
گیا- میں اپنے بارے میں مختصراً یہ بتا سکتا ہوں کہ تحریکات سے قطع نظر ادب کو سمجھنے کا میرا
ایک الگ طریقہ ہے، ادب شاعری ہو یا نثر ہو، اس کی مثال آپ ایک عمارت سے دے
سکتے ہیں- مثلاً تاج محل، پتھر گارے اور اس طرح کی مختلف چیزوں سے بنی ہوئی ایک مجموعی
شکل کا نام ہے، سب کو الگ الگ کر دیجیے تو وہ تاج محل نہیں ہو سکتا- سب کو ایک خاص
ڈھنگ سے سجانے کے بعد ایک نئی چیز بنی ہے- ادب کا بھی یہی حال ہے، ڈکشنری میں
سارے الفاظ موجود ہیں، مگر وہ ادب نہیں ہیں، ڈکشنری میں موجود الفاظ کے جو معانی ہیں وہ
اس سے یکسر مختلف ہیں جو معنی شعر میں ان کو پرونے کے بعد حاصل ہوتے ہیں- تو یہ ایک فن

ہے آرٹ ہے، بظاہر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں گرد و پیش کے حالات ہیں، شاعر کے
اپنے احساسات ہیں، مگر ایسا نہیں ہے اس میں ماضی کا اثر بھی ہوتا ہے اور مستقبل کا آئینہ بھی
ہوتا ہے- اب اس کو پیش کرنے میں شاعر یا ادیب کتنا کامیاب ہے، اس کا فن پارہ فنی اعتبار
سے کتنا پختہ ہے، اسی سے اس کے ادب کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے-

یہ جو ادبی تحریکات ہیں ان سے ادب کی تفہیم کے لیے کچھ Tools ضرور ملے، ترقی
پسند تحریک نے بھی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے بھی، سب نے ہی ادب کی تفہیم کے
لیے کچھ نہ کچھ اصول ضرور فراہم کیے، لیکن ادب کو کسی خاص عینک سے نہیں دیکھا جا سکتا،
اچھی شاعری خواہ تین سو سال پہلے کی ہو، آج کی ہو، سب کی یکساں اہمیت ہے، یہ اور بات
ہے کہ جس دور کی شاعری ہوتی اس دور کے احساسات اور مسائل اس میں زیادہ ہوں گے،
مگر شاعری کے اعتبار سے دونوں یکساں اہمیت کی حامل ہیں- اچھی شاعری کا معیار بس فن
ہے، فنی اعتبار سے اس میں کتنی خوبیاں ہیں اسی سے اس کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، کسی عہد
سے اچھی شاعری کا کوئی تعلق نہیں-

سوال :- شعبۂ اردو کے طلبہ معاش کے تعلق سے کافی پریشان ہوتے ہیں، اس
حوالے سے آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟

پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی:- پچھلے ۹ رسالوں سے میں صدر شعبہ ہوں، اور اس لحاظ سے
مجھے کافی تجربات ہوئے، پریشان ہم نے بھی ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں کہ دن بدن طلبہ کی
تعداد گھٹتی جا رہی ہے، ہم اس کے لیے پی جی ڈپلوما اِن اردو ماس میڈیا کا کورس شروع کیا
جس میں ترجمہ ہے، کمپیوٹر نالج ہے، الیکٹرانک میڈیا ہے، اور صحافت کے لیے جو بھی
ضروری چیزیں ہیں سب ہم اردو میں پڑھاتے ہیں، اس سے اردو طلبہ کے معاش کا مسئلہ
ایک حد تک حل ہوا ہے- میری بھی رائے یہی ہے کہ زبان و ادب کی تعلیم کو بھی معاش سے
جوڑا جائے، ہم میر و غالب کو صرف پڑھتے رہیں اور اپنی زندگی کا آغاز نہ کریں، یہ دانش
مندی نہیں ہے، ادبی ذوق کی تعمیر، تربیت نفس، وسعت فکر و نظر اور اعلیٰ ظرفی پیدا کرنے کے
لیے میر و غالب اور اقبال کا مطالعہ بہرحال بے پناہ مفید اور ضروری ہے، بلکہ میں تو یہاں

تک کہتا ہوں کہ ادب پڑھ کر ہمارے اندر یہ چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں اور نوکری نہیں بھی ملتی ہے تو کوئی افسوس اور ملال کی بات نہیں ہے-لیکن باوجود اس کے ہم شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر اردو کو روز گار سے نہیں جوڑا گیا تو خوف ہے کہ آگے چل کر یونیورسٹیوں سے اردو کے شعبے بند ہو جائیں ، کیوں کہ جب طلبہ ہی نہیں رہیں گے تو U.G.C. اساتذہ کو تنخواہ کیوں دے گی؟ اس کے لیے اردو کے تمام اساتذہ اور بہی خواہوں کو سوچنا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ کچھ ایسی راہ نکلے جس سے جس طرح ہندی کے طلبہ ہندی پڑھ کر روز گار سے جڑ جاتے ہیں اردو کے طلبہ بھی اردو پڑھ کر روز گار سے جڑ جائیں-اردو کی خوش قسمتی یہ ہے کہ یہ ہر جگہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے اور اس کے ساتھ اس کی بد قسمتی یہ ہے کہ ہر جگہ بولی جانے کی وجہ سے اسے وہ مراعات حاصل نہیں ہو پاتی ہے، جو دوسری علاقائی زبانوں کو حاصل ہوتی ہے، اس طرح یہ ایک طرح کی کشمکش میں ہے، ضرورت ہے کہ ہم اردو والے اسے اس کشمکش سے باہر لائیں-

سوال :-جام نور کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی:-بہت اچھا اور معیاری رسالہ ہے، حیرت ہوئی کہ ایک اردو مذہبی رسالہ اتنی بڑی تعداد میں نکل رہا ہے اور اس طرح اس کی پذیرائی ہو رہی ہے، مجھے اس بات پر بھی بے حد حیرت بلکہ خوشی ہوئی کہ آپ پر دین و دنیا کا تصور واضح ہے اور دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چل رہے ہیں، ہر طرح کے مسائل پر گفتگو کرتے اور کراتے ہیں، ہماری دعا ہے کہ رسالہ اور مقبول ہو اور زبان و ادب اور مذہب و ملت کی زیادہ سے زیادہ خدمات پیش کر سکے-□□□

(شمارہ ستمبر ۲۰۰۶ء)

پروفیسر فاروق احمد صدیقی

سابق صدر شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، بہار

سیتامڑھی بہار کا قصبہ پوکھریرا اپنی علمی زرخیزی، فکری توانائی اور دینی حمیت کے باعث ملک گیر شہرت کا حامل ہے، سرکار مجی حضرت عبدالرحمٰن سے مولانا شبنم کمالی مرحوم تک درجنوں اساطین علم وفن اور صاحبان فکر ونظر اسی کہکشان رنگ ونور کے درخشاں ستارے ہیں- پروفیسر فاروق احمد صدیقی سابق صدر شعبۂ اردو بی، آر، اے بہار یونیورسٹی مظفر پور بھی اسی مردم خیز سرزمین کے مایۂ ناز فرزند ہیں-آپ بیک وقت شاعر، ناقد اور تحقیقی ذوق کے مالک ایک علمی نثر نگار ہیں، مذہب سے وابستگی بھی گہری ہے، مذہبیات پر بھی اچھا لکھتے ہیں، اہل دین و دانش سے ایک ساتھ اچھے روابط ہیں، اس لیے دینی وعصری موضوعات پر لکھی جانے والی ان کی تحریریں یکساں اہمیت کی حامل ہوتی ہیں-آپ کا تعلیمی بیک گراؤنڈ اسکول ہے، بہار یونیورسٹی سے ایم اے (اردو)، ایم اے (فارسی) اور پی ایچ ڈی کیا، پی ایچ ڈی کی تھیسس ''دیوان ریاض حسن خان (مع مقدمہ)'' مطبوع ہے، اس کے علاوہ ملکی وغیر ملکی، دینی وادبی رسائل میں آپ کی سینکڑوں تحریریں چھپتی رہی ہیں، تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ''افہام وتفہیم'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے جو قابل مطالعہ ہے، آپ مختلف دینی وعلمی سمیناروں میں بھی شریک ہوتے رہے ہیں-آپ کی زیر نگرانی اب تک درجنوں دینی وعلمی موضوعات پر لکھے جانے والے مقالوں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں ایوارڈ ہو چکی ہیں، ان مقالوں میں ''امام احمد رضا کی مکتوب نگاری'' اہمیت کا حامل ہے-ڈاکٹر صاحب کا علمی اور قلمی سفر ابھی جاری ہے اور ہمیں ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں-

سوال :-سب سے پہلے یہ بتائیں کہ آج اردوداں نوجوانوں خصوصاً مدارس کے نئے فارغین کے لیے اردو میں کیا امکانات ہیں؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی :-اردو تعلیم کی افادیت عرصۂ دراز سے معرضِ سوال میں ہے، میری طالب علمی کے زمانے سے اردو پڑھنے کے حاصل پر سوالیہ نشان لگایا جارہا ہے- قنوطی حضرات کی بھی کمی نہیں ہے جو اردو ادب کے مستقبل سے مایوس ہوکر اس کے خاتمہ کی پیشین گوئی کرچکے ہیں- پھر بھی اردو زندہ ہے اور اس کے فوائد گوناگوں ہیں-

خاص بہار کے تناظر میں اردو تعلیم کے امکانات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہورہا ہے- ۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۱ء تک ایک یونیورسٹی تھی -۱۹۵۲ء میں دو یونیورسیٹیاں ہوئیں اور اب دس یونورسیٹیاں موجود ہیں -اور تمام یونیورسیٹیوں میں پوسٹ گریجویٹ اردو کے شعبہ جات ہیں یا کھولے جانے کا مطالبہ ان کے آئندہ وجود میں آنے کا پیش خیمہ ہے- بہت سے کالج قائم ہوئے اور تقریباً ہر کالج میں کم از کم اردو لکچرر کا ایک عہدہ بھی منظور ہوا- ان اسامیوں پر اردو والوں کا تقرر بھی ہوا-

دوسری جانب سرکاری دفاتر میں اردو کی سند رکھنے والوں کے لیے ٹرانسلیٹر اور نائب ٹرانسلیٹر کے عہدے منظور ہوئے اور ان پر اردو کے فارغین کا تقرر ہوا- ان میں مدارس کے فارغین بھی اچھی خاصی تعداد میں مامور ہوئے اور اس طرح اردو تعلیم کے امکانات کا دائرہ دینی مدارس کے فارغین کے لیے بھی وسیع ہوا-

اردو تعلیم کے فوائد اور امکانات میں ایک نمایاں نکتہ یہ ہے کہ مرکزی اور صوبائی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونا اردو والوں کے لیے نہ صرف ممکن ہے بلکہ بہت سے آئی -اے- ایس، آئی -پی- ایس اور آئی این ایس کے حکام اردو کی بدولت کامیاب ہوئے ہیں - یہ کامیابی یونین پبلک سروس کمیشن کے مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہونے کا نتیجہ ہے- جن میں اردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل ہے اور کامیاب ہونے والوں کی مجموعی کارکردگی میں اضافے ور امتیاز بخشنے کا وسیلہ بنتی ہے- غرض یہ کہ اردو

والوں کے لیے بھی وہ تمام دروازے کھلے ہیں جو دیگر مضامین کے اختیار کرنے والوں کے لیے ہیں-

اردو تعلیم کے امکانات سے فائدہ اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے جب زبان وادب کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جائے اور اپنی استعداد میں اضافہ کیا جائے- آج کل نئی نسل جو اردو تعلیم کی اسناد سے مزین ہوکر باہر آتی ہے، خواہ وہ کالج یا یونیورسٹی سے آئے یا دینی مدارس سے، بالعموم صلاحیتوں سے عاری ہوتی ہے، یہ بالیقین ایک المیہ ہے، ایسے لوگوں کے تابناک مستقبل کی بشارت نہیں دی جاسکتی-

سوال :- بہار کے سول سروس امتحانات میں اردو کے بطور اختیاری مضمون شامل ہونے کے بعد اس سے مسلمانوں کو اور خود اردو کو کتنا فائدہ پہنچا؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی :- اردو کے سول سروس امتحانات میں اختیاری مضمون کے طور پر اردو شامل ہے، اس سے مسلمانوں کو تو یہ فائدہ ہوا کہ بڑے بڑے عہدوں پر یونیورسٹی اور دینی مدارس سے فارغ التحصیل حضرات نے مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی حاصل کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے - مثال کے طور پر سیوان کے عامر سبحانی نے اردو اور فارسی اختیاری مضامین لے کر آئی -اے- ایس کے امتحان میں پورے ہندوستان میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور شیوہر کے اظہار عالم (خالص مدرسہ پروڈکٹ) آئی -پی- ایس کا امتحان پاس کر کے ایس پی کے عہدہ تک پہنچے- اور پنجاب جن دنوں بارود کی ڈھیر پر تھا، بحیثیت ایس پی اعلی کارکردگی کا مظاہرہ کر کے انہوں نے غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل کی، اس طرح کی درجنوں مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں- بہار کے نہ سہی، لیکن مرکز کے سول سروسز امتحانات میں اردو کی شمولیت سے غیر مسلم بھی مستفید ہوئے ہیں اور ایسے اعلیٰ حکام ماضی میں نکل چکے ہیں جن سے خود اردو کا فائدہ ہوا-

سوال :- پچھلے دو دہائیوں میں بہار میں اردو کی صورت حال کیا رہی ہے، اسے وہاں دوسری زبان کا درجہ ملنے کے باوجود آج وہ کسمپرسی کا شکار کیوں ہے؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی :- بہار میں دوسری سرکاری زبان ہے، لیکن اس سے دلچسپی

خود اردو والوں میں مفقود ہوگئی اور یہ تشویش ناک ہے- مراعات تو اپنی جگہ قائم ہیں، لیکن
استفادہ کرنے والے اردو کی خاطر کم اور ذاتی اکتساب کے لیے زیادہ سرگرم ہیں- نتیجہ کے
طور پر خطیر رقمیں ضائع ہو جاتی ہیں اور اردو کا بھلا نہیں ہوتا- اردو پڑھنے والوں کی دلچسپی اگر
کم ہوتی رہی تو نہ پڑھنے والے رہیں گے نہ پڑھانے والوں کے عہدے، یہ بات اردو
والوں کو اب بھی سمجھ لینی چاہیے-

سوال:- بہار کی موجودہ سیاست کو دیکھتے ہوئے آئندہ سامنے آنے والے متوقع
نتائج کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ یہ اگلا پانچ سال مسلمانان بہار کے لیے کیا پیغام
لے کر آئے گا؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی:- بہار کی موجودہ سیاست اب سامنے ہے- اس سلسلہ
میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانان بہار دیکھو اور انتظار کے عالم میں ہیں-

سوال:- آپ اردو ادب کے ساتھ مذہبی لٹریچر کا بھی خاصہ مطالعہ رکھتے ہیں، اس
تناظر میں آپ بتائیں کہ کچھ لوگوں کے نزدیک ادب اور مذہب کے بیچ فاصلہ کیوں ہے؟
آپ کی رائے میں آئندہ یہ فاصلہ اور بڑھے گا یا کم ہوگا؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی:- ادب اور مذہب کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے، اس
لیے کہ ادب انسانی ذہن کی بہترین صلاحیتوں کا اظہار ہے اور مذہب انسانی ذہن کی
صلاحیتوں کو نکھارنے اور بہترین بنانے کا ذریعہ ہے - عالمی ادب کے ترقی یافتہ نمونوں
میں مذہب کا درجہ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے- انگریزی ادب میں مشاہیر ہوئے ہیں، مثلاً
شکسپیئر، ڈاکٹر جانسن اور ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ، سب کی فکر پر عیسائیت کی مہر لگی ہوئی ہے-

اردو میں ترقی پسندوں نے ادب اور مذہب کے بیچ خلیج پیدا کرنے کی منصوبہ بند
کوشش کی، صرف مذہب کی نفی پر اکتفا نہ کر کے خدا کے وجود اور مذہبی اقدار سے انکار نے
ترقی پسندی کو قعر مذلت میں گرایا- ان کے نزدیک سارے مذہبی عقائد و تصورات غلط اور
مذہبی موضوع شجر ممنوعہ ٹھہرا، ترقی پسندی کے زوال کے بعد مذہب اور ادب کے درمیان کا یہ
فاصلہ گھٹ رہا ہے اور نئی نسل مذہب کی طرف راغب ہو رہی ہے- اس کے چند اسباب راقم

السطور کی نظر میں یہ ہیں-

(الف) مختلف دینی جماعتوں کی طرف سے نوجوانوں کی ذہنی تربیت
(ب) آسان اور عام فہم زبانوں میں مذہبی لٹریچر کی فراہمی
(ج) Q.T.V. اور اس طرح کے دوسرے چینلوں پر نشر ہونے والے مذہبی پروگرام
(د) بھاگل پور اور گجرات جیسے مسلم کش فسادات کے نتیجے میں زندگی کی طرف سے
بے اعتباری-

سوال:- آج دنیا پھر دہشت کے سائے میں ہے، آپ کی نظر میں اس کے اسباب
وعلل کیا ہیں؟ اور اس سے نجات کے طریقے کیا ہیں؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی:- دہشت گردی کی اصطلاح مغربی سیاست کی وضع کردہ
ہے، ظالموں نے ہمیشہ مظلوموں کی کوشش دفاع کو جرم قرار دیا ہے اور عہد حاضر میں اس کو
دہشت گردی کا نام دیا ہے- آج امریکہ اور اس کی پشت پناہی میں صہیونی عزائم کمزور
انسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں، طاغوتی طاقتیں متحد ہو رہی ہیں، ان میں امریکہ اور
یوروپ سب برابر کے شریک ہیں، اگر حریت پسندی یا اپنی بقا اور اپنے تحفظ کے لیے ہاتھ
پاؤں مارنا دہشت گردی ہے تو یہ ظالموں کی ریشہ دانیوں کا لازمی نتیجہ ہے- اگر مغربی طاقتیں
من مانی کرنا چھوڑ دیں اور دوسروں کو جینے کا برابر کا حق دیں تو دہشت گردی خود بہ خود ختم ہو
جائے گی-

سوال:- موجودہ دہشت زدہ دنیا کے نوجوانوں، دانشوروں علماء اور طلبہ کے لیے
آپ کیا پیغام دیں گے؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی:- سب کے سب مذہب اسلام کے پرچم تلے جمع ہو
جائیں اور متحد ہو کر دنیا کو امن و آشتی کا پیغام دیں-

سوال:- آج طلبہ مدارس کے اندر عصری تعلیم کے حصول کا رجحان تیزی سے بڑھ
رہا ہے، آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی:- طلبۂ مدارس کے اندر عصری تعلیم کے حصول کا رجحان

قابل ستائش ہے، تمام اہل مدراس کو چاہیے کہ وہ اپنے یہاں ایسے کورسیز شروع کریں جو آج کی برق رفتار زندگی کا ساتھ دے سکیں- میری مراد کمپیوٹر کورسیز، ای میل اور انٹرنیٹ وغیرہ سے ہے- سائنس اور ٹیکنولوجی کے دور میں ان چیزوں کی اہمیت کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے- علاوہ ازیں اندنوں اردو صحافت کی بھی قدر و قیمت کافی بڑھ گئی ہے، طلبۂ مدارس بڑی آسانی سے اس میدان میں آسکتے ہیں-

سوال :- کہا جاتا ہے کہ عصری تعلیم کے دوڑ میں طلبہ مدارس اس کی برکتوں کے ساتھ اس کی نحوستوں سے بھی خود کو محفوظ کر رہے ہیں، ویسے آپ کیا کہتے ہیں؟ اور اگر واقعی کچھ مفاسد درآرہے ہیں تو ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی:- طلبۂ مدارس کے اندر عصری تعلیم نے ذہنی بیداری اور انقلابی فکر عطا کی ہے، مجموعی طور پر عصری تعلیم سے ان کے ذہن وفکر پر مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں، اگر اس کی کچھ نحوستیں در آئی ہیں تو اس پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، روح دیں کو بیدار رکھنا شرط ہے-

سوال :- آج ہمارے لیے یہ بات باعث مسرت ہے کہ علمائے اہل سنت کے اندر بھی زندگی کے ہر محاذ پر کام کرنے کا مزاج پیدا ہو رہا ہے، مگر کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسا پہلو ہے جو دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل ہے اور جس پر کام ہونا چاہیے؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی:- علمائے اہل سنت ملت کے نوجوانوں میں اکل حلال کے حصول کا جذبہ پیدا کریں اور عقائد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اقتصادی مسائل کے حل کی خاطر کتاب وسنت کے مطابق معیار پیش کریں، تا کہ نئی نسل معاشی اور عمرانی سطح پر رہنمائی سے محروم ہو کر غلط راستے پر نہ نکل پڑے- دوسری بات یہ کہ علمائے اہل سنت کو آفات ارضی وسماوی کے مواقع پر مسلمانوں کی دیگر تنظیموں کی طرح ایسی اجتماعی کوشش کرنی چاہیے جس سے خدا کی مصیبت زدہ مخلوق کی پریشانیاں کم ہو سکیں اور ایسے لوگوں کے دلوں میں ہمارے علماء کی خدمات سے متاثر ہو کر اسلام کی خوبیاں گھر کر سکیں-

سوال :- جام نور کے مشن کی آپ کی نظر میں کیا حیثیت ہے؟ آپ کی نظر میں اس

میں کس پہلو سے مزید اصلاح کی ضرورت ہے؟

پروفیسر فاروق احمد صدیقی:- ''جام نور'' تمام مذہبی رسائل و جرائد میں منفرد وممتاز ہے، اس کا یہ مشن نہایت مستحسن ہے کہ عقائد کی روشنی کے ساتھ ساتھ دنیاوی مسائل و معاملات سے بھی اپنے قارئین کو روشناس رکھا جائے- اس کی خوبیاں اتنی زیادہ ہیں کہ مزید اصلاح کے نام پر کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے- ❑❑❑

(شمارہ فروری ۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی

سابق استاد: حکیم اجمل خاں طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی کی تہ دار شخصیت اہل علم کے درمیان محتاج تعارف نہیں، وہ بیک وقت ایک جید عالم دین، ادیب و نقاد، شاعر، مصنف اور حکیم ہیں، جب بھی ضرورت محسوس ہوئی ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ میدانوں میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا- ڈاکٹر شرر مصباحی ۱۵ ر جون ۱۹۴۴ء کو محلّہ کٹرہ قصبہ مبارکپور اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچتے ہی حافظ ملت مولانا عبدالعزیز محدث مرادآبادی کی تربیت میں دے دیے گئے، ذہین و فطین تو تھے ہی، بہت جلد ایک باصلاحیت عالم دین بن کر الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور سے فارغ ہوئے- طب کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو طبابت کا کورس بھی لکھنؤ سے مکمل کیا اور اپنی محنت و لگن سے بہت جلد دہلی کے حکیم اجمل خاں طبیہ کالج میں بحیثیت لکچرر مقرر ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے ریڈر کی پوسٹ سے ریٹائرڈ ہوئے- آپ نے مذہبی، درسی اور طبی موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں ''ظہور قدسی، نمود سحر، محاسبے، معارضہ، حدائق بخشش کا فنی و عروضی جائزہ وغیرہ قابل ذکر ہیں- آپ کی علمی و طبی خدمات کے پیش نظر حکومت اور مختلف تنظیموں نے آپ کو کئی ایوارڈ سے نوازا جن میں بالخصوص دہلی گورنمنٹ اسٹیٹ ایوارڈ اور یونائٹیڈ مسلم آف انڈیا کی طرف سے ''قاضی عدیل عباسی'' ایوارڈ ہیں- موصوف کا مزاج یہ ہے کہ یہ لکھتے نہیں اور جب لکھتے ہیں تو بڑی توجہ و تحقیق سے لکھتے ہیں، شعر و ادب ان کا خاص میدان ہے اور بلا مبالغہ ہندوستان میں عروض و قوافی کے موجودہ چند ماہرین میں ایک ہیں، ''امام نعت گویاں'' مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی ''حدائق بخشش'' کی تصحیح اور اس پر گراں قدر ''تقدیم'' آپ کا زبردست کارنامہ اور آپ کی عروض دانی پر روشن دلیل ہے-

سوال:- الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور سے آپ کی فراغت ایک باصلاحیت اور ذی استعداد عالم کی حیثیت سے ہوئی، پھر طبابت و جراحت کی طرف آپ متوجہ کیوں ہوئے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:- آپ کا سوال بہت تفصیلی جواب چاہتا ہے، مختصراً یہ کہ میرے وطن مبارکپور سے ملحق موضع رسول پور کے علمی گھرانے میں ایک جید عالم مولانا عبدالباقی تھے جو دہلی کے حضرت زید میاں تھے، نہ یہاں ان کے مبلغ علم کو دہلی والوں نے جانا نہ وہاں ان کے علمی مرتبہ کو مبارک پور والوں نے پہچانا- مولانا عبدالباقی ایم اے اور ایل ایل بی بھی تھے اعظم گڈھ کی کچہری میں وکالت کرتے تھے، عربی زبان و ادب کے ماہر اور فن طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے- مولانا ہر ہفتہ کی شام کو اپنے گھر رسول پور جاتے ہوئے میرے محلّہ سے گزرتے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے الحاج محمد سعید صاحب کے یہاں ٹھہرتے تھے (الحاج محمد سعید صاحب بعد میں میرے سسر ہوئے اور الجامعۃ الاشرفیہ کے ناظم اعلیٰ اور نائب صدر بھی) ایک دن شام کے وقت میں الحاج محمد سعید صاحب کے یہاں بیٹھا ہوا تھا، مولانا عبدالباقی صاحب حسب معمول تشریف لائے، محلّہ کے ایک بزرگ ان کے انتظار میں بیٹھے تھے جیسے ہی مولانا تشریف لائے انہوں نے اپنا حال بیان کرنا شروع کر دیا مولانا نے حال سننے اور کچھ ضروری سوال پوچھنے کے بعد شیروانی کی جیب سے عینک نکالی جس کا ایک لنس اپنے خانہ سے نکل گیا تھا میں نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ نسخہ تجویز فرمادیں میں لکھ دوں گا، چنانچہ مولانا نے پورا نسخہ مع اوزان املا کرا دیا پھر مجھ سے مخاطب ہوئے، صاحبزادے تم کون ہو؟ میں نے اپنے دادا حضرت میاں صاحب عبداللہ شفا کے حوالے سے اپنا تعارف پیش کیا تو انہوں نے باہمی خاندانی مراسم کا ذکر کیا، مجھے انہیں سے یہ معلوم ہوا کہ میرے دادا کا دیوان نعت ''نعت محبوب'' مولانا ہی کے خاندان کے ایک بزرگ مولانا احمد حسن صاحب رسولپوری نے اکھیل پرنٹنگ پریس بہرائچ میں چھپوایا تھا- الغرض مولانا لنس کو خانہ میں فٹ کرنے کے بعد نسخہ کو ملاحظہ فرمایا اور کہا کہ صاحبزادے تمہاری طبیعت کو طب سے بڑی مناسبت معلوم ہوتی ہے- مولانا کا یہ جملہ مجھے بار بار یاد

آتا رہا، میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اگر والدگرامی اجازت دیں گے تو میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں داخلہ لوں گا-

ابھی آپ کے سوال کا جواب تشنۂ تکمیل ہے- ادھر دارالعلوم اشرفیہ میں جہاں میں زیرتعلیم تھا ہر جمعرات کو مشقی جلسہ ہوا کرتا تھا جس میں طلبہ تقریر کی مشق کرتے تھے لیکن میں اور مدنی میاں (شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں) ہمیشہ غیر حاضر رہے اور کبھی حاضر بھی رہے تو کھانسی بخار کا عذر کرکے سامع کی حیثیت سے شریک رہے- بعد میں اس کمی کے احساس نے مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند کردیا، میں نے والدمحترم سے عرض کیا کہ اگر تکمیل الطب کالج میں داخلہ ہوجائے تو گھر بیٹھے خلق خدا کی خدمت کرسکتا ہوں اور اگر ملازمت مل گئی فبہا- یوں والدمحترم نے اجازت دی اور میں نے تکمیل الطب کالج میں داخلہ لے لیا اگر تقریر کی مشق ومزاولت شروع سے ہی رہی ہوتی تو ممکن ہے میں فن طبابت و جراحت کی طرف متوجہ نہ ہوتا-

سوال:- ایک مدرسہ سے کالج کی طرف رخ کرنے کے بعد کیا آپ کے ساتھ عام علماء وفضلاء کے سلوک میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:- یہ میری خوش نصیبی اور حافظ ملت کا فیض ہے کہ مدرسہ سے کالج کی طرف رخ کرنے کے بعد بھی میرا تعلق اشرفیہ سے اور علماء وفضلاء سے قائم رہا- اشرفیہ کا ۱۹۷۲ء سے پندرہ برس تک مسلسل مجلس انتظامیہ ومجلس شوریٰ کا رکن رہا تا حال مجلس شوریٰ کا رکن ہوں آپ میرے ساتھ علماء وفضلاء کے سلوک میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں، سنئے! موضع سکٹی مبارکپور میں حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمۃ تشریف لائے وقت تنگ تھا حاجت مند کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے تعویذ عطا کرنے کا سلسلہ جاری تھا، جب حضرت کے تشریف لے جانے کا وقت ہوا تو مجھے ایک تعویذ عطا کرکے فرمایا کہ تم کو اجازت ہے ضرورت مندوں کو لکھ کر دے دیا کرنا، اس وقت حضور مفتی اعظم کے اردگرد کئی علماء اور اشرفیہ کے مدرسین بیٹھے ہوئے تھے-

جشن صد سالہ حضور مفتی اعظم ہند جو ۱۹۹۲ء میں ممبئی میں نہایت تزک واحتشام کے

ساتھ رضا اکیڈمی نے منایا تھا اس میں احقر کو بھی مدعو کیا گیا تھا، جمخانہ کے ڈائس پر پانچ کرسیاں سجائی گئی تھیں رئیس التحریر حضرت علامہ ارشد القادری نے اس ترتیب سے بٹھایا، مولانا ابراہیم خوشتر (انگلینڈ)، مولانا قمرالزماں اعظمی (انگلینڈ)، فقیہ عصر مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ، احقر (شرر مصباحی) اور علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ- دیگر مقالہ نگار سامعین کی پہلی صف میں بٹھائے گئے- یہ محض تحدیث نعمت کے طور پر عرض کررہا ہوں- ابھی چند برس پہلے جشن شارح بخاری جو رضا اکیڈمی کے زیراہتمام ممبئی میں منعقد ہوا تھا اس میں اسٹیج پر پہلی صف میں احقر کو عزت بخشی گئی تھی- شارح بخاری کے بائیں طرف اشرف ملت، امین ملت اور مفتی اعظم جودھپور ہی نہیں بلکہ جب شارح بخاری کی گلپوشی کے بعد حضرت امین ملت نے حضرت ممدوح کو شال اوڑھائی تو وہ شال حضرت شارح بخاری نے میرے سر پر ڈال دی، اس وقت میرے دل کا جو حال تھا وہ بیان نہیں کرسکتا- اب بھی سیمناروں کے لیے دعوت نامے آتے رہتے ہیں فرصت ہوتی ہے تو شریک ہوتا ہوں-

سوال:- آج میڈیکل سائنس اپنے عروج پر ہے اور علاج وسرجری کے لیے نت نئی دوائیں اور مشینیں ایجاد کی جارہی ہیں، ان کے درمیان قدیم یونانی طرز علاج کی آپ کیا حیثیت متعین کریں گے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:- غیر متعدی مزمن میں طب یونانی آج بھی اپنی پہچان بنائے ہوئے ہے لیکن سرجری اور Casualty میں جدید پیتھی کا کسی پیتھی میں متبادل نہیں ہے- ہم آج تک حفظ ماتقدم کے لیے کوئی ٹیکہ کوئی ڈراپ ایجاد نہیں کرسکے تاکہ خطرناک امراض سے حفاظت ہوسکے- یہ کام طب کی ان کلینکل یونٹوں کو کرنا چاہیے جو ریسرچ اور تحقیق کے لیے قائم کی گئی ہیں-

سوال:- کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ جماعت اہل سنت جس کو ہم عرف عام میں بریلوی کہتے ہیں بدنظمی کا شکار ہے؟ جس کا اتفاق رائے سے نہ کوئی سربراہ ہے، اس کو مستحکم کرنے کے لیے نہ کوئی پلاننگ ہے اور نہ ہی اس میں منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے کا ڈھنگ، اگر ایسا ہے تو اس کا ذمہ دار آپ کس کو مانتے ہیں؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:- ہاں بالکل صحیح ہے ہماری جماعت بدنظمی کا شکار ہے اس کے ذمہ دار صرف اور صرف وہ حضرات ہیں جن کے سر سیادت وقیادت کا سہرا ہے جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے- اگر یہ حضرات ایک ساتھ دسترخوان پر بھی بیٹھنا گوارا کرلیں تو بد نظمی کی سیاہی چھٹنا شروع ہوجائے گی-

سوال:- میدان تبلیغ واشاعت سے لے کر سیاست تک جماعت اہل سنت کا ملک گیر پیمانے پر کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا ہے، ایسا کیوں؟ اور اس کی تلافی کیسے ممکن ہے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:-تبلیغ واشاعت تو ہمارا خاص میدان ہے اور اس میں حسب توفیق کام ہورہا ہے رضا اکیڈمی ممبئی، مرکز اہلسنت برکات رضا گجرات المجمع الاسلامی مبارک پور کے علاوہ بھی کئی مراکز ہیں جہاں سے نئی پرانی کتابیں شائع ہورہی ہیں جو تبلیغ و اشاعت کے تعلق سے خوش آئند مستقبل کی علامت ہیں، لیکن سیاست میں ہماری حصہ داری ہو؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر علماء وفقہاء کو غور کرنا ہوگا- یہ صحیح ہے کہ جب تک سیاست اور ملی کاز میں پوری لگن اور دیانت کے ساتھ ہم آگے نہیں بڑھیں گے، ملک گیر پیمانے پر ہم کوئی مثبت چھاپ نہیں چھوڑ سکتے لیکن سیاست میں حصہ لینے کے بعد اپنے مذہبی تشخصات کو کیوں کر اور کہاں تک قائم رکھا جاسکتا ہے اس کی بہتر سبیل فقہائے کرام ہی پیدا کرسکتے ہیں-

سوال:- آپ نے الجامعۃ الاشرفیہ کے نشیب وفراز دیکھے ہیں، ایسے میں اس کو دیگر مکاتب فکر کے مرکزی ادارے کے بالمقابل کھڑا کرنے کے لیے کن مؤثر اقدام کی ضرورت ہے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:-آپ نے الجامعۃ الاشرفیہ کا ذکر کیا کیا گویا غالب کے سامنے کلکتہ کا ذکر کردیا- یقیناً میں نے جامعہ کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے ہیں جن کا ذکر آئندہ کبھی کیا جائے گا، دیگر مکاتب فکر کے مرکزی اداروں کے بالمقابل کھڑا کرنے سے اگر آپ کی مراد تعلیمی معیار ہے تو ماشاء اللہ اشرفیہ کے علمی معیار کو دیگر مکاتب فکر کے تعلیمی ادارے آنکھ نہیں دکھاسکتے البتہ بعض دیگر مرکزی اداروں کو جو شہرت حاصل ہے، وہ اس لیے کہ ان کے سرپرستوں اور سربراہوں نے ملی اور جماعتی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا

ہے- مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم سے مسلسل عملی تحریک کے ذریعے مسلم کش فسادات کے مواقع پر مظاہرے، احتجاج اور مذمتی بیانات کے ذریعے، مظلوموں، بیواؤں، یتیموں اور بے گھر ہوئے لوگوں کی امداد اور بازآبادکاری کے لیے ریلیف فنڈ کے ذریعے اس معیار کا کام ہماری جماعت کے ان قائدین کی سرپرستی میں انجام پذیر نہیں ہوتا جن کا ذکر جواب نمبر ۴ میں کیا گیا ہے-

سوال:- آخر کیا وجہ ہے کہ جتنا علماء کے درمیان آپسی چشمک، رعونت اور چپقلش پائی جاتی ہے اتنا کسی اور طبقے میں نہیں؟ جب کہ یہ عام لوگوں کے سامنے آپسی اتحاد واتفاق، اخلاق ورواداری اور خلوص ومحبت کا درس دیتے ہیں؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:- یہ بالکلیہ صحیح نہیں ہے کہ اتنی چشمک اور رعونت کسی اور طبقے میں نہیں پائی جاتی، ہاں علماء میں جو چشمک پائی جاتی ہے اس کے اثرات دور رس ہوتے ہیں اور شاخ در شاخ ہوتے جاتے ہیں- جہالت کے ساتھ دولت اور علم کے ساتھ فقدان اخلاص کے بڑے مہلک نتائج ہوتے ہیں ہمارے علماء میں جو چشمک یا چپقلش پائی جاتی ہے یہ بہت افسوسناک ہے اور اس سے ملت کا شیرازہ بکھر رہا ہے-

سوال:-حدائق بخشش کے تعلق سے آپ کا ایک کارنامہ سامنے آیا ہے، تقدیم وتصحیح کا علمی دنیا میں کافی چرچا ہے، آپ اس کے تعلق سے کچھ بتائیں؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:-کوئی کارنامہ نہیں ہے محنت ضرور ہوئی، وقت کافی خرچ ہوا، حدائق بخشش کے بیسیوں نسخے حاصل کیے، ان میں کتابت کی غلطیاں تھیں، کہیں شعر بے معنی ہوگیا تھا، کہیں وزن سے خارج تھا اور کہیں شعر کا مفہوم صغائر وکبائر تک پہنچ گیا تھا، میں نے حسب توفیق اغلاط کتابت کو درست کیا ہے، پھر بھی دو ایک جگہ غلطی باقی رہ گئی ہے جسے آئندہ طباعت میں ان شاء اللہ تعالیٰ الحاج محمد سعید نوری صاحب درست کرالیں- اس ضمن میں یہ عرض کرتا چلوں کہ حدائق میں ہر جگہ ''کرور'' رائے مہملہ سے لکھا گیا ہے، بعض علما مُصر ہیں کہ کروڑ ہونا چاہیے لیکن کرور اعلیٰ حضرت کی خطی تحریرات کی روشنی میں لکھا گیا ہے، فسانہ آزاد وغیرہا میں رائے مہملہ سے ہے، اگرچہ از روئے لغت دونوں طرح رائج وفصیح ہے-

سوال:-آپ حدائق بخشش کی طباعت کی غلطیوں کی طرف متوجہ کیسے ہوئے اور صحیح الفاظ ومعانی تک کیسے رسائی حاصل ہوئی؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:-یہ میری دلچسپی کا خاص موضوع ہے اگر اس کی تفصیل میں جاؤں گا تو ممکن ہے جذباتی ہو جاؤں-مختصراً عرض ہے کہ حدائق بخشش کو عام طور پر عقیدت کی نظر سے پڑھا جاتا ہے ظاہر ہے کہ جب آنکھ پر عقیدت کا لنس لگا ہو تو عیب بھی ہنر نظر آئے گا یا کم از کم عیب عیب نظر نہیں آئے گا، میں نے حدائق بخشش کا مطالعہ فنی اصول و قواعد کی روشنی میں تنقیدی نظر سے کیا- اس لیے مجھے جگہ جگہ غلط الکتابۃ اور اس کے نتیجہ میں صغائر وکبائر تک کی سرایت نظر آئی جس کی نسبت حضرت امام کی طرف قوت واہمہ بھی نہیں کرسکتی- جو لوگ حضرت امام کو ایک ماہر فن شاعر کی حیثیت سے نہ جانتے ہوں وہ فتاویٰ رضویہ جلد ۱۲ کے ''باب العروض'' کا مطالعہ فرمائیں یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ حضرت امام فن شعر میں وہی مقام رکھتے تھے جو عربی فارسی اور اردو کے کسی بڑے سے بڑے صاحب فن کو حاصل تھا- ظاہر ہے ایسے باکمال شاعر کے کلام ہیں اگر کوئی فنی عیب نظر آئے اور خود شعر کے الفاظ اپنی زبان حال سے اپنا متنفر ظاہر کریں تو اسے غلط الکتابہ کے سوا اور کیا کہا جائے مثال کے طور پر (الف) حدائق بخشش جو کراچی سے صوفی عزیز احمد بریلوی کی تصحیح کے ساتھ مفتی محمد ظفر علی نعمانی کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے اس میں شعر یوں مندرج ہے-

حمداً لک اے آلہ عبد القادر　　اے مالک و بادشاہ عبد القادر

یہاں آلہ کو الف پر مد ظاہر کر کے پڑھنے میں شرعی نقص بھی ہے، اور فنی بھی، فنی اس لیے کہ آلہ الف ممدودہ کے ساتھ شاہ کا ہم قافیہ نہیں ہوسکتا- کیا ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ حضرت امام کا مصرع اولیٰ یہ ہے

حمداً لک اے الٰہ عبد القادر؟

ایں لبانت جلوہ بار شھد کن　　قُم بفرما مردہ ام را زندہ کن

یہاں دو عیب جمع ہوگئے پہلا یہ کہ لب کی تشبیہ شہد سے دی جاتی ہے نہ کہ جلوہ سے، دوسرا عیب یہ کہ شھد- زندہ کا ہم قافیہ نہیں ہے ایسی صورت میں ایطائے جلی کا عیب پیدا

ہوگیا- ایطائے جلی کے اس عیب پر خود حضرت امام نے اپنے اشعار کی اصلاح لینے والوں کو متنبہ کیا ہے اور ان کے اشعار کی اصلاح فرما کر اس نقص کو دور کیا ہے، جب اس مصرع پر غور کیا گیا تو بہ ادنیٰ تامل معلوم ہوا کہ غلط الکتابۃ نے مصرع کی ہیئت بدل اس کو معیوب کردیا ہے، حضرت امام نے یقیناً یہ مصرع یوں کہا ہوگا-

ایں لبانت شھد بار جلوہ کن

اب تشبیہ بھی صحیح ہوگئی اور قافیہ بھی درست ہوگیا پھر بھی میں نے مارہرہ شریف حاضر ہوکر حضرت احسن العلماء علیہ الرحمہ کے سامنے یہ شعر پیش کیا، انہوں نے میری تائید فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ اعلیٰ حضرت کا مصرع صدفی صدیوں ہی ہے-

ایں لبانت شھد بار جلوہ کن

بلکہ اس سلسلہ میں ایک ''اعلامیہ'' تحریر فرمایا جو ماہنامہ اشرفیہ میں شائع ہوچکا ہے-

ہوں کردو تو گردوں کی بنا گر جائے
ابرو جو کھنچے تیغ قضا گر جائے

یہ شعر بھی شروع ہی سے غلط الکتابۃ کا زخم کھاتا رہا ہے جب کہ بصورت موجودہ اس میں ایطائے جلی کا نقص بھی ہے اور شعر بے معنی بھی بعض تبصرہ نگاروں نے شعر کو علی حالہ لکھ کر اس کی خوب خوب تعریف بھی کی ہے حالانکہ یہ حضرات نہ تو فن کے اس عیب پر مطلع ہوئے نہ اس شعر کے معنی سمجھے، حقیقت الامر یہ ہے کہ دوسرے مصرع میں گر جائے نہیں ''کر جائے'' ہے اب شعر کے فنی تقاضے بھی پورے ہوگئے اور معنی بھی درست ہوگئے، میرے خیال میں اب آپ مطمئن ہوگئے ہوں گے کہ میں نے صحیح الفاظ ومعانی تک کیسے رسائی حاصل کی-

سوال:-حدائق بخشش میں آپ کو کوئی ایسا شعر نظر آیا جس پر لسانی یا فنی نقطۂ نظر سے آپ کی نظر ٹھہر گئی ہو؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:-کئی برس پہلے جب بھساول کے ایک سمینار میں بریلی کے ایک جواں سال عالم دین مولانا صغیر احمد مصباحی نے میری توجہ درج ذیل دو شعروں کی طرف منعطف کرائی

لم یاتِ نظیرک فی نظر مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہِ دوسرا جانا
یا قا فلتی زیدی اجلک رحمے برحسرت تشنہ لبک
مورا جیرا لرجے درک درک طیبہ سے ابھی نہ سنا جانا

پہلے شعر کے دوسرے مصرع کے بارے میں انہوں نے کہا کہ اعلیٰ حضرت نے اس پوری نظم میں جو التزام قائم کر رکھا ہے وہ اس میں نہیں ہے، کیا وہ اس مصرع میں التزام قائم کرنے پر قادر نہیں تھے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس نعت میں جتنے مصاریع ہیں اگر ان کو دو ٹکڑے کر کے پہلے کو دوسرا اور دوسرے کو پہلا کر دیا جائے تو مصرع شکست کے بغیر موزوں رہے گا مثلاً

من بیکس و طوفاں ہوش ربا
البحر علا والموج طغیٰ
چوں بہ طیبہ رسی عرضے بکنی
یا شمس نظرتِ الیٰ لیلی

یوں ہی سارے مصاریع لیکن ''جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا'' میں یہ التزام قائم نہیں ہے، ایک ٹکڑا ''سر سو'' پر ختم ہوتا ہے دوسرا ٹکڑا ''ہے تجھ کو'' سے شروع ہوتا ہے- دوسرے شعر کے بارے میں انہوں نے کہا کہ میں اس کی تقطیع کرنے سے قاصر ہوں، ''درک درک'' جو کہ اصلاً بفتحتین ہے اس سے مصرع موزوں نہیں ہو رہا ہے- موصوف نے جو کچھ کہا یہ از قسم استفسار تھا جس پر میں نے غور کیا اور اب تک غور کر رہا ہوں-

سوال:- ایک مصری ادیب نے حدائق بخشش کا عربی منظوم ترجمہ کیا ہے، کیا آپ کی نظر سے یہ ترجمہ گزرا ہے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:- میں نے ہند و پاک کے کئی جرائد میں یہ خبر پڑھی تھی، بلکہ جیسا کہ ہمارا مزاج ہے تعریفوں کے پُل بھی باندھے گئے تھے، بمبئی کے بعض احباب کے ذریعے چند اوراق ملے میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا، اکثر اشعار کا مفہوم تو کجا صرف لگّا سے

پانی پلایا گیا ہے، اس کی بڑی پہچان یہ ہے کہ آپ اُن اشعار کا دوبارہ ترجمہ کسی ایسے اردو داں سے کرائیے جو عربی زبان سے تو واقف ہو لیکن اس کی نظر سے حدائق بخشش نہ گزری ہو، پھر دیکھیے کیسے حقیقت عریاں ہوتی ہے-

میں یہ نہیں کہتا کہ اعلیٰ حضرت کے کلام میں جو چاشنی ہے، وارفتگی ہے، وہ عربی ترجمہ میں نہیں ہے، کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی شاعر کے احساسات و جذبات کو کوئی اور کسی اور زبان میں منتقل کر سکے، میں یہ کہتا ہوں کہ شعر کے پیش پا افتادہ بھرپور مفہوم کی بھی اکثر مقامات پر ناقص تعریب ہوئی ہے، یہ تو رہی اردو جیسی کم عمر اور نسبتاً محدود زبان کی بات، عربی زبان تو ایک دریائے ناپیدا کنار ہے، جو لوگ کہتے ہیں کہ کنز الایمان اردو میں قرآن ہے وہ تو مجسم آفتاب کو بحر الکاہل میں اتار رہے ہیں-

سوال:- حدائق بخشش حصہ سوم کی اشاعت میں کون سا امر مانع ہے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:- میرے خیال میں اس کی اشاعت میں کچھ دشواریاں ہیں، اس میں ایک قصیدہ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ کی مدح میں ہے، اس کے چند اشعار پر ماضی میں بڑی لے دے ہو چکی ہے، مولوی محبوب علی خان صاحب کو توبہ نامہ شائع کرنا پڑا، ایک دوسرے بزرگ نے وکیل صفائی کے طور پر کہا کہ یہ اشعار سیدہ عائشہ سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ان گیارہ مشرک عورتوں کے لیے ہیں جن کا ذکر حدیث ام زرع میں ہے، تین شعر جو مجھے یاد ہیں وہ یہ ہیں:

یاد وہ مجھے رنگین عروسان حجاز
اور پیاں کہ چھپائیں گی نہ حال شوہر
تنگ و چست ان کا لباس اور وہ جوبن کا ابھار
مسکی جاتی ہے قبا سر سے کمر تک لے کر
یہ پھٹا پڑتا ہے جوبن مرے دل کی صورت
کہ ہوئے جاتے ہیں جامہ سے بروں سینہ و بر

میرے نزدیک یہ اشعار مشرک عورتوں کے لیے نہیں کہے گئے ہیں، میں اسے اعلیٰ

حضرت کی بارگاہ حیا میں ایک عقیدت کیش کی جسارت سمجھتا ہوں- اگر یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ حضرت کا ہر قول و عمل سنت کے مطابق تھا اور آپ کی پیروی حق کی پیروی ہے تو تحریر بالا کی روشنی میں اگر کوئی اس امر کا جواز پیدا کرنے کی جسارت کرے کہ کناٹ پیلیس میں سیر کیجئے، انگریزی چھوریوں کے سینہ و بدن پر چپکے ہوئے دو دو گرہ کپڑوں کے اندر تصور کی آنکھ سے جھانکیے اور پھر گھر آکر جرأت دہلوی کا یہ شعر پڑھ پڑھ کر راتوں کی نیند حرام کیجئے:

یاد آتی ہے تو یوں پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رخ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

تو اسے کون روک سکتا ہے؟ پھر مولانا نیاز فتح پوری نے یہ لکھ کر کیا گناہ کیا؟

''راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں بلند و بالا، صحیح وتوانا، تیوریاں چڑھی ہوئیں، گردنیں تنی ہوئیں، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھوں پر بیندی''-

صرف اتنا ہی تو فرق ٹھہرا کہ یہاں آنکھوں سے دیکھ کر اپنے جذبات کا بے محابا اظہار کیا جارہا ہے (جو بہر حال **النظرۃ الاولی** نہیں ہے) اور وہاں نئی نویلی دلہنوں کی کانٹوں پر تلتی ہوئی جوانی کا تصور شعر کہلوا رہا ہے- **استغفر اللہ ثم استغفر اللہ**- اعلیٰ حضرت کے سامنے حدیث ام زرع نہ ہوئی امرءالقیس کا قصیدہ ہوا، حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت جیسے حیا اور ایمان والے کے بارے میں یہ سوچنا بھی گناہ ہے کہ ایسے اشعار انہوں نے عورتوں کے لیے کہے ہوں گے، خواہ وہ عورتیں مشرک ہی کیوں نہ ہوں- غالبًا انہی چند معترضہ فیہ اشعار کی وجہ سے اس کی اشاعت نہیں ہو رہی ہے، لیکن اب اسے ''باقیات رضا'' کے نام سے شائع کر دینا چاہیے اور ان معترضہ فیہ اشعار کے تعلق سے جو وقیع مقالہ مفتی مطیع الرحمٰن صاحب نے تحریر کیا ہے اسے بھی اس میں شامل کر لینا چاہیے-

سوال: آپ نے اعلیٰ حضرت کو عقیدت کے ساتھ پڑھا ہے یا ان کے تبحر علم سے متاثر ہو کر آپ کے دل میں ان کی عقیدت نے گھر کیا ہے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی: -میں جب دارالعلوم اشرفیہ میں زیر تعلیم تھا اس وقت

اعلیٰ حضرت کا ایک رسالہ بھی میری نظر سے نہیں گزرا تھا، صاف ظاہر ہے کہ اپنے بزرگوں سے بالخصوص استاذ الکریم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ سے ان کے علم و فضل کی تعریف سن کر میرے دل میں عقیدت و احترام کا جذبہ پیدا ہوا اور جب اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے مطالعہ کی توفیق ہوئی تو یہ عقیدت دوآتشہ ہوگئی، میرے خیال میں اعلیٰ حضرت کے فکر و فن پر تحقیق اور ریسرچ کرنے والے جماعت کے افراد اگرچہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یکسر غیر جانب دار ہو کر خالص علمی نقطۂ نگاہ سے ریسرچ کا کام کر رہے ہیں لیکن ان کا حال مجھ سے دگرگوں نہیں ہے، فرق یہ ہے کہ......ع

بعض می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

لیکن ہزار عقیدت کے باوجود مجھے ان اقوال سے اتفاق نہیں ہے کہ

- ''اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہوتا تو اعلیٰ حضرت نبی ہوتے''
- ''اعلیٰ حضرت کی زبان و قلم سے سرمو خطا سرزد ہو مولا تعالیٰ نے اسے ناممکن بنادیا ہے''
- ''کنز الایمان اردو میں قرآن ہے''
- ''شہزادے تم نے اردو میں قرآن لکھا ہے''

سوال: -''حیات اعلیٰ حضرت''، مفتی مطیع الرحمٰن صاحب نے ازسرنو ایڈٹ کیا ہے، آپ نے اسے ملاحظہ کیا؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی: -مکتبۂ امجدیہ سے میں نے اس کتاب کے مکمل حصے خریدے تھے لیکن اطمینان سے پڑھنے کا موقع میسر نہیں آیا، جستہ جستہ دیکھا ایک شعر پر نظر ٹھہر گئی، مفتی صاحب نے اصلاح فرمادی ہے:

چشیدہ باشی بہ تیغ قضا من آنستم   شنیدہ بودی بہ احمد رضا من آنستم

یہ شعر پہلی اشاعت میں غالبًا یوں مطبوع ہے

چشیدہ باشی ز تیغ قضا من آنستم   شنیدہ بودی احمد رضا من آنستم

اعلیٰ حضرت کے اصل شعر کا نہ یہاں پتا ہے نہ وہاں، ملک العلماء کے پہلے نسخہ میں دونوں مصرعے برابر نہیں تھے، مفتی صاحب نے انہیں برابر کرنے کے لیے دوسرے مصرع

میں ’’بہ‘‘ کا اضافہ کر دیا جب کہ پہلے مصرع کے ز (یا بہ) کو حذف کر کے بھی مصرعے برابر
کیے جا سکتے تھے، مفتی صاحب خود بھی شاعر ہیں، نقد وادب پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن یہاں
ان سے چوک ہو گئی اعلیٰ حضرت کا اصل شعر یوں ہے۔

چشیدہ باشی تیغ قضا من آنستم — شنیدہ بودی احمد رضا من آنستم

اعلیٰ حضرت جہاں باطل کے خلاف محاذ آرا ہوتے تھے یا اپنے مخالفوں کے مقابل
صف آرا ہوتے تھے وہاں تحدیث نعمت کا اظہار کرتے ہوئے اکثر فن کا بھی مظاہرہ فرماتے
تھے، یہاں مذکورہ شعر میں تسکین اوسط کا زحاف ہے جسے اہل عروض ہی سمجھ سکتے ہیں، اگر
اس شعر کے دونوں مصرعوں کو بہ کے اضافہ کے ساتھ پڑھا جائے تو باشی اور بودی میں سقوط
ی کا عیب پیدا ہو جائے گا جو فارسی نظم میں جائز نہیں ہے، یہی زحاف اس قطعہ میں بھی ہے،
اس کا نزلہ بھی اپنے مخالف پر ہی گرایا ہے۔

سینہ شود منشرح بحر شود منسرح — قطرۂ خود را اگر حکم چکیدن کنم
در دل مضموں ہزار جائے بکاغذ نماند — پس سخنم صدر وار مطوی و مسکن کنم

یہاں پر بعض اہل ذوق ’’در دل مضموں ہزار‘‘ کے دل کو اضافت کے ساتھ پڑھ کر
مصرع موزوں کرتے ہیں اور شعر کے مفہوم کو اپنی عقیدت کے حوالے کر دیتے ہیں۔

سوال:۔ کنز الایمان کے تعلق سے ہندو پاک میں بہت سے مضمون لکھے گئے
ہیں، ان میں ڈاکٹر محمد صابر سنبھلی صاحب کا طویل مضمون زیادہ پسند کیا گیا ہے، آپ کا کیا
خیال ہے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:۔ میں سمجھتا ہوں سنبھلی صاحب نے فاضل بریلوی کی
عقیدت میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ثواب انہیں ملے گا، لیکن علمی دنیا میں انہوں نے اپنا وقار
کھو دیا ہے، آپ موصوف کا انداز تحریر ملاحظہ کیجیے، ایک فرد سے عقیدت اور دوسرے سے
نفرت ہر رشحۂ قلم سے عیاں ہے، اس لیے میں اسے کنز الایمان کا لسانی جائزہ نہیں سمجھتا بلکہ
ایک عقیدت کیش کا ہدیۂ خلوص سمجھتا ہوں۔

اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ ترجمہ کا جو عیب انہیں شاہ عبد القادر کے یہاں نظر آیا

،اسے یہ کہہ کر چھپانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو کا وہ عہد طفلی تھا، زبان کا تشکیلی دور تھا
،وغیرہا، کیونکہ شاہ صاحب کا شمار ہماری جماعت کے اکابرین میں ہوتا ہے، اگر موصوف کو
فی الواقع علمی اعتبار سے جائزہ لینا تھا تو اعلیٰ حضرت کے بعد ایک اور ترجمہ معارف القرآن
بھی شائع ہوا ہے، اس کو بھی مطالعہ کی میز پر سجانا تھا، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے، اسی سے
نیت ظاہر ہے۔

لفظ ’’کڑوڑا‘‘ پر جو اعتراض تھا اس کو دور کرنے کے لیے لغات کے حوالے دیے جا
رہے ہیں، لغت میں تو تمام ایسے الفاظ درج ہیں جن کو متروک ہوئے صدی گزر گئی، سنبھلی
صاحب کو چاہیے تھا کہ اپنی بات کو مؤکد کرنے کے لیے اعلیٰ حضرت کے عہد کے اہل زبان
کے کلام سے استشہاد کرتے تاکہ یہ ثابت ہوتا کہ اعلیٰ حضرت کے زمانے میں اس لفظ کا چلن
تھا۔ میں لفظ ’’کڑوڑا‘‘ پر معترض نہیں ہوں، سنبھلی صاحب کا جواب مجھے مہمل نظر آتا ہے۔

یونہی ایک آیت شریفہ کے ترجمہ میں مولانا محمود الحسن نے ’’صور‘‘ کو مونث استعمال کر
دیا تو جیسے قیامت آ گئی۔ (حالانکہ یہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے) سنبھلی صاحب کو اس قسم
کے اعتراض کرنے اور الفاظ کے تیر و نشتر چلانے سے پہلے یہ بھی دیکھنا چاہیے تھا کہ تذکیر و
تانیث کی اس قسم کی مثالیں کنز الایمان میں بھی تو نہیں ہیں؟ اسی طرح مولانا محمود الحسن نے
ایک آیت شریفہ کا ترجمہ کیا ہے ’’قسم دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جائے‘‘
یہاں اپنے مبلغ علم کا مظاہرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ’’رات چھا جانا اہل زبان کا روزمرہ
نہیں ہے، اندھیرا چھا جانا، تاریکی چھا جانا، بادل چھا جانا تو استعمال میں ہیں، رات چھا جانا
کہیں تحریر میں نظر نہیں آیا۔‘‘ سنبھلی صاحب سے گزارش ہے کہ کنز الایمان کا ایک بار
بالاستیعاب مطالعہ فرمائیے، آپ کو کنز الایمان ہی میں رات چھانا (چھانا اور چھا جانا میں
مسئلہ ما نحن فیہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے) مل جائے گا۔

اسی طرح بتلانا، دکھلانا کو متعدی المتعدی قرار دے کر مترجم پر خوب خوب پھبتی کسی گئی
ہے، اگر متعدی المتعدی سے موصوف کی مراد تعدیہ بدو مفعول ہے تو انہیں معلوم ہونا چاہیے
کہ دکھانا اور دکھلانا، بتانا اور بتلانا ایک ہی معنی میں ہے، محض تلفظ بدلا ہوا ہے، تعدیہ بدو

مفعول کی مثال بھیجنا سے بھجوانا، پکڑنا سے پکڑوانا ہے- نیز دکھلانا وغیرہ اعلیٰ حضرت کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، اس لیے اتنا گرجنے برسنے کی ضرورت نہیں تھی، ساری چھینٹیں اعلیٰ حضرت کے دامن پر آرہی ہیں- یہ تو محض چند مثالیں ہیں، کنزالایمان کے لسانی جائزہ پر میرے مضمون کا انتظار کیجیے-

سوال :- چند ماہ قبل ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب نے قرآن کی جدید ترجمہ نگاری کے تعلق سے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ ''اب بھی کنزالایمان کے بعد نیا ترجمہ کرنا منہ چڑانا ہے'' آپ اس سے کہاں تک متفق ہیں؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی :- مجھے اتفاق نہیں ہے، زبان کا ارتقائی عمل جاری ہے، اسلوب نگارش میں فرق آیا ہے، لفظیات بدلی ہیں، سیکڑوں الفاظ جو کبھی ادب عالیہ کا حصہ تھے متروک ہو چکے ہیں، نئے نئے الفاظ سے زبان کا دامن بھرتا جارہا ہے، علم اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے، اس لیے یہ دعویٰ کرنا کہ ''اب بھی کنزالایمان کے بعد نیا ترجمہ کرنا منہ چڑانا ہے'' عقیدت کیشی کے ساتھ حقیقت پوشی ہے- اگر کنزالایمان کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو اس میں بہت سے ایسے الفاظ ملیں گے جن سے عام قاری کے کان آشنا نہیں ہیں، جنہیں سنبھلی صاحب نے علاقہ روہیل کھنڈ کی ٹکسالی زبان کا نام دیا ہے، یہ اقرار بجائے خود اس بات کا اعتراف ہے کہ کہیں کہیں ''ٹکسالی اردو'' کی جگہ ''علاقائی بولی'' کا استعمال کیا گیا ہے، افسوس اس بات کا ہے کہ زبان وادب میں بھی عقیدت محضہ کی گھس پیٹھ شروع ہوگئی ہے، ڈاکٹر صابر سنبھلی نے حسن بریلوی کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ حسن بریلوی کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ورنہ بیخود دہلوی وغیرہ کی جگہ حضرت حسن بریلوی فصیح الملک داغ دہلوی کی جانشینی کے مستحق تھے (ملخص) یہ عبارت صرف اس لیے معرض وجود میں آئی تا کہ اعلیٰ حضرت کے وسیع وعریض حلقۂ اثر میں رسوخ قائم کیا جا سکے اور جماعت کے بھولے بھالے افراد کو جنہیں زبان وادب سے دلچسپی نہیں ہے، اپنے ڈاکٹر ہونے کا احساس دلایا جائے، اگرچہ یہ بات حلقہ ارادت میں کانوں کو بھلی معلوم ہوگی لیکن زبان وادب کا اس سے کیا سروکار؟ سنبھلی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے

کہ سیدنا غوث اعظم کی اولاد امجاد میں منشی سید وحید الدین بیخود دہلوی کے سر پر اکابرین دہلی کے اجلاس میں فصیح الملک داغ دہلوی کے برادر مرزا خورشید عالم بہادر نے دستار خلافت باندھی تھی، خواجہ الطاف حسین نے اس اجلاس میں شریک نہ ہو سکنے کا افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''خود حضرت داغ دہلوی بھی جناب بیخود کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے-'' کیا سارے حاضر باش شعرا واکابرین جن میں اکثریت فصیح الملک کے شاگردوں کی تھی، سب کے سب حضرت حسن بریلوی سے کدر رکھتے تھے؟ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اب جبکہ میری تحریر کے ذریعہ سنبھلی صاحب کو معلوم ہوگا کہ بیخود دہلوی سیدنا غوث اعظم کی اولاد امجاد سے تھے تو عقیدت کا قبلہ بدل جائے گا-

سوال :- مولانا عبدالستار ہمدانی صاحب کی کتاب ''فن شاعری اور حسان الہند'' پر آپ کی تحریر ہند و پاک وہند میں کافی چرچے میں رہی ہے، ویسے اس تعلق سے ذاتی طور پر آپ کو کس قسم کے ردعمل کا سامنا کرنا پڑا؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی :- میرے مضمون کی آخری قسط جب پریس میں تھی ان دنوں میں لبنان میں تھا، بعض احباب نے فون اور SMS کے ذریعہ مبارکباد دی، پھر جب دہلی آیا تو یہاں کے احباب بھی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے، مبارکپور کی حاضری میں جامعہ اشرفیہ گیا تو بعض اساتذہ جو شعر وسخن کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں، مجھ سے ملے اور کہا کہ آپ نے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ ان میں سے کتنے ایسے ہیں کہ جو ''میرے منہ پر مجھ جیسی اس کے منہ پر اس جیسی'' کا مزاج رکھتے ہیں- اس لیے مجھے صحیح اندازہ نہیں ہے کہ میرے مضمون پر عام تاثر کیا رہا- تملق کلچر سے ہمارا معاشرہ زوال پذیر ہو رہا ہے، اسی ضمن میں ایک واقعہ سن لیجیے- ممبئی کے جس عظیم الشان اجلاس میں مفتی شریف الحق صاحب کو چاندی سے تولا گیا، میں بھی شریک تھا اور مفتی صاحب کی شان میں تہنیت کے چند اشعار پیش کیے تھے، حضرت امین ملت کے ایما پر محترم اشرف میاں صاحب نے اسٹیج پر مجھے انعام سے نوازا تھا، پھر مارہرہ مطہرہ کی جو شال حضرت امین ملت نے مفتی صاحب کے کندھے پر ڈال دی تھی، انہوں نے اتار کر میرے کندھے پر ڈال دی،

فالحمد الله! دوسرے دن جب میں حضرت مخدوم مہائمی کی بارگاہ میں حاضری دینے گیا
زینے پر ایک معروف عالم دین وسجادہ نشین سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے دیکھتے ہی مجھے
گلے سے لگالیا اور کہا کہ سبحان اللہ! آپ نے اتنی شاندار تہنیتی نظم سنائی تھی کہ جی خوش ہوگیا،
چاندی میں تولے جانے کے اصلاً مستحق آپ تھے- یہ بات انہوں نے مجھ سے اکیلے میں
کہی، دوسروں کے سامنے ہرگز نہیں کہہ سکتے تھے- اس لیے میرے مضمون پر عام تاثر کیا رہا
مجھے اس کا صحیح علم نہیں ہے، اتنا ضرور ہے کہ کوئی معترض بن کر میرے سامنے نہیں آیا، البتہ
اس انٹرویو کے بعد جو تاثر ہوگا اس کا مجھے قدرے اندازہ ہے لیکن ؎

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

میرا عقیدہ یہ ہے کہ حقیقت پر عقیدت مستزاد ہو تو یہ اچھی بات ہے لیکن جو عقیدت
حقیقت کا ستیاناس کردے وہ ہرگز قابل قبول نہیں-

سوال:- کچھ مولانا ظفرادیبی کے بارے میں بتایئے، سنا ہے وہ مسلک اعلیٰ
حضرت سے اختلاف کرتے تھے؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شررمصباحی:- اس کا جواب تفصیل طلب ہے، مختصراً عرض کر رہا ہوں-
مولانا ظفرادیبی اشرفیہ کے قابل فخر اساتذہ میں تھے، مفکر اسلام کے لقب سے مشہور
زمانہ تھے، اشرف العلماء سید حامد اشرف علیہ الرحمہ، محدث کبیر مولانا ضیاء المصطفےٰ صاحب،
مولانا سید اظہار اشرف صاحب، مولانا سید مشاہد رضا صاحب اور مولانا سید کمیل اشرف
جیسے ارباب فضل وکمال کے استاد تھے، ۱۹۷۱ء میں بعض نظریاتی اختلاف کی وجہ سے انہوں
نے اشرفیہ سے اپنا تعلق ختم کرلیا تھا، حسام الحرمین کی حرف بہ حرف تصدیق کرنے سے
انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ کتاب اللہ کے سوا کسی کتاب کی حرف بہ حرف تصدیق
نہیں کی جاسکتی، یہ جو کہا جاتا ہے کہ حافظ ملت نے انہیں بدعقیدگی کی وجہ سے اشرفیہ سے
نکال باہر کیا تھا، غلط ہے- مختصر یہ کہ نظریاتی اختلاف، لفظ کملی پر مفتی اشرفیہ کے فتویٰ کے
خلاف آں موصوف کی تحریر، ''مسلک اعلیٰ حضرت'' کے لفظ سے ان کی ناپسندیدگی جیسے

بنیادی اسباب سے ان کے اور اشرفیہ کے مدرسین کے درمیان فاصلہ بڑھتا رہا- جیسا کہ
میں نے عرض کیا وہ ''مسلک اعلیٰ حضرت'' نام کو پسند نہیں کرتے تھے، یونہی وہ لفظ ''بریلوی''
کا الحاق بھی پسند نہیں کرتے تھے- ظاہر ہے کہ ہم سنی حنفی بریلوی اسے کیونکر گوارا کرسکتے تھے،
اس لیے ۱۹۷۱ء کے بعد مولانا ظفرادیبی مختلف طرح کے شکوک وشبہات کے دائرے میں آ
گئے- طرفہ یہ کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ مولوی اشرف علی تھانوی، مولوی خلیل احمد
انبیٹھوی، مولوی قاسم نانوتوی اور مولوی رشید احمد گنگوہی کے بارے میں اعلیٰ حضرت کے
فتویٰ اور یہ کہ **من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** کے تعلق سے آپ کیا کہتے ہیں؟
توجواباً انہوں نے کہا کہ مولوی اسماعیل دہلوی کی تکفیر علامہ فضل حق خیرآبادی نے کی ہے اور
اس میں بھی کہا گیا ہے کہ **من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** پھر اعلیٰ حضرت نے
سکوت کیوں اختیار فرمایا؟

اس معاملہ کی سچائی جاننے کے لیے ۶؍جولائی ۲۰۰۳ء کو میں اور مولانا عبیداللہ خان
صاحب کے ماموں مولانا عبدالجبار خان صاحب ظفرادیبی صاحب کے در دولت پر حاضر
ہوئے، تقریباً ساڑھے تین گھنٹہ تک گفتگو کا دور چلتا رہا، جیسے ہی ہم نے عناصر اربعہ کے تعلق
سے گفتگو کا آغاز کیا، علامہ نے ہماری بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا کہ پہلے یہ بتایئے کہ
جب علامہ فضل رسول بدایونی اور مولانا فضل حق خیرآبادی نے مولوی اسماعیل دہلوی کی تکفیر
کی اور یہ بھی لکھا کہ **من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** اس کے باوجود اعلیٰ
حضرت نے کف لسان کیوں کیا؟ اس پر مولانا عبدالجبار خان صاحب نے کفر فقہی اور کفر
کلامی کی بحث چھیڑ دی، علامہ نے کہا کہ مولانا فضل حق خیرآبادی کی تحریر کو غور سے پڑھیے،
ان کا فتویٰ دونوں اعتبارات کا احاطہ کرتا ہے- اثنائے گفتگو کسی نے کہا کہ اگر اعلیٰ حضرت
نے سکوت کیا ہے تو وجہ سکوت بھی تو تحریر کی ہوگی؟ مولانا عبدالجبار صاحب نے کہا کہ اس کا
مجھے علم نہیں ہے، پھر ہم لاحاصل گفتگو کے بعد الجامعۃ الاشرفیہ گئے، مولانا محمد احمد مصباحی
صاحب سے پوچھا کہ اعلیٰ حضرت نے مولوی اسماعیل دہلوی کی تکفیر سے کف لسان کیا ہے،
اس کی وجہ اعلیٰ حضرت نے کیا تحریر فرمائی ہے؟ مصباحی صاحب نے کہا کہ وجہ سکوت کے

بارے میں اعلیٰ حضرت کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔

پھر دوبارہ ۱۳؍ستمبر ۲۰۰۵ء کو میں اور ڈاکٹر شکیل اعظمی ایک منضبط تحریر لے کر علامہ ظفر ادیبی کے یہاں گئے، علامہ سے تادیر گفتگو رہی، پھر ہم نے وہ منضبط تحریر پیش کی جو مندرجہ ذیل ہے:

''مولوی اشرف علی تھانوی نے حضور ﷺ کے علم غیب کے بارے میں لکھا:

''پھر یہ کہ آپ کی ذات مقدسہ پر علم غیب کا حکم کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہو تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب، اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور ﷺ ہی کی کیا تخصیص ہے، ایسا علم غیب تو زید وعمر بلکہ ہر صبی ومجنوں بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کے لیے بھی حاصل ہے۔'' (حفظ الایمان ص:۱۵)

مولوی خلیل احمد انبیٹھی اور مولوی رشید احمد گنگوہی نے حضور ﷺ کی وسعت علم کے بارے میں لکھا:

''الحاصل غور کرنا چاہیے کہ شیطان وملک الموت کا حال دیکھ کر علم محیط زمین کا فخر عالم کو خلاف نصوص قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاس فاسدہ سے ثابت کرنا شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے، شیطان وملک الموت کو یہ وسعت نص سے ثابت ہوئی فخر عالم کی وسعت علم کی کون سی نص قطعی ہے کہ جس سے تمام نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے۔''

(البراہین القاطعہ ص:۵۵)

مولوی قاسم نانوتوی نے مسلمانوں کے اجماعی عقیدہ ختم نبوت کے تعلق سے لکھا:

''بلکہ بالفرض بعد زمانہ نبوی ﷺ کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا، چہ جائے کہ آپ کے معاصر کسی اور زمین میں یا فرض کیجیے اسی زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے۔'' (تحذیر الناس ص:۲۵)

''عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلعم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانہ کے بعد اور آپ سب میں آخری نبی ہیں، مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم یا تأخر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں، پھر مقام مدح میں **ولکن رسول اللہ وخاتم**

النبیین فرمانا اس صورت میں کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔'' (تحذیر الناس ص:۳)

''بلکہ بالفرض آپ کے زمانہ میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو جب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے۔'' (تحذیر الناس ص:۱۴)

اس منضبط تحریر کو پڑھ کر مولانا ظفر ادیبی نے اپنا واضح موقف یوں املا کرایا:

''میں مندرجہ بالا اقوال میں علمائے بدایوں، علمائے رامپور، علمائے فرنگی محل، علمائے خیرآباد اور علمائے پھلواری شریف یعنی جمہور علمائے اہل سنت کے ساتھ ہوں، جو ان کا مسلک ہے وہی میرا مسلک ہے، یعنی تکفیر اہل قبلہ کے بارے میں جو ان کا مسلک ہے وہی میرا مسلک ہے۔''

جہاں تک اعلیٰ حضرت سے نظریاتی اختلاف کی بات ہے اس ایک فتویٰ کے علاوہ کتابت نسواں کے بارے میں علامہ ظفر ادیبی کو اعلیٰ حضرت کے فتویٰ سے اختلاف تھا اور اس قول سے سخت ناگواری کا اظہار کرتے تھے کہ حضور ﷺ اپنی قبر شریف میں ازواج مطہرات کے ساتھ شب باشی فرماتے ہیں، اس کے علاوہ مجھے اور کسی اختلاف کا علم نہیں ہے۔

سوال:۔ اخیر میں جام نور کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی:۔ ماشاء اللہ جام نور یوماً فیوماً روبہ ترقی ہے، مضامین معیاری اور عصری تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں، دانشور طبقے کو اگلے شمارے کا انتظار رہتا ہے، یہ کسی جریدہ کی مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے، خامہ تلاشی کے کالم نے اس کی افادیت اور معنویت میں چار چاند لگا دیے ہیں، اللہ اسے دوام واستحکام بخشے۔□□□

(شمارہ اگست ۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی

ریڈر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تقریباً نصف درجن کتابوں کے مصنف ،معروف قلم کار ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی کی شخصیت علمی وادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے، وہ بیدار مغز اور رواں دواں قلم کے مالک ہیں، دینی وادبی دونوں موضوعات پر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں- آپ کا تعلق بہار کے ضلع مونگیر سے ہے، آپ کا خانوادہ خانقاہی ہے، آپ کے اجداد میں سلسلہ فریدیہ کے بڑے بڑے اصحاب طریقت وکرامت بزرگ گزرے ہیں، والد گرامی گورو ضلع مونگیر کی خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں اور ''ادارہ شرعیہ'' پٹنہ سے بھی ''ناظم تنظیمات'' کی حیثیت سے وابستہ رہ چکے ہیں- ڈاکٹر فریدی ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ ضیاء الاسلام لکھن پور مونگیر سے حاصل کی، ۱۹۷۶ء میں ہائی اسکول کیا، پھر گریجویشن کرنے کے بعد شہر علم علی گڑھ وارد ہوئے اور ایم اے میں پوری یونیورسٹی میں ٹاپ کر کے یونیورسٹی میں اپنا ایک مقام بنالیا، پھر اپنے تحقیقی مقالہ ''کلیم الدین احمد: نظریہ اور عمل'' پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۹۲ء میں علی گڑھ میں لیکچرار شعبۂ اردو کی حیثیت سے آپ کی تقرری ہوئی، جس کے بعد ترقی کر کے فروری ۲۰۰۱ء میں ریڈر کا اعزاز حاصل کرلیا- آپ کی مطبوعہ تصانیف میں ''ایک معرکہ لہو کا''، ''سرسید اور اردو زبان وادب''، ''اردو داستان: تحقیق وتنقید'' اور ''طلسم ہوش ربا'' خاصی اہمیت کی حامل ہیں، جب کہ کئی ایک علمی وادبی کتابوں کی آپ نے ترتیب وتدوین کا فریضہ انجام دیا ہے- آپ کا تحقیقی مقالہ بھی زیر طبع ہے- اس وقت آپ معروف جریدہ ''تہذیب الاخلاق'' کے جوائنٹ ایڈیٹر ہیں، جب کہ اس سے قبل سہ ماہی ''الفاظ'' علی گڑھ کے مدیر اور ''خبر ونظر'' علی گڑھ کے جوائنٹ ایڈیٹر رہ چکے ہیں-

سوال:-موجودہ حکومت نے مسلم طلبہ کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 50% ریزرویشن مقرر کردیا ہے، حکومت کا یہ فیصلہ آپ کی نظر میں مسلم طلبہ اور مسلم معاشرے کے لیے کتنا سودمند ہے؟

ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی:-اس سلسلے میں دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہیے، پہلی بات تو یہ کہ اس سے پہلے بھی کئی بار مسلم یونیورسٹی میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ یہاں مسلم طلبہ کے لیے ریزرویشن ہونا چاہیے کہ نہیں، ایک طویل عرصے کے غور وفکر کے بعد آج ریزرویشن پر عمل ہو پایا ہے- ایسا نہیں ہے کہ یہ کوئی جذباتی فیصلہ لیا گیا ہے کہ ابھی آواز اٹھائی اور فوری اس پر عمل ہوگیا بلکہ پچھلے سترہ سالوں سے مختلف شیوخ الجامعہ (Vice Chancellers) کے دور میں یہ بات اٹھتی رہی ہے اور اس پر غور کیا جاتا رہا ہے، اس کے بعد یہ فیصلہ لیا گیا کہ ریزرویشن بذات خود یونیورسٹی کے لیے بھی اور مسلم طلبہ کے لیے بھی کافی مفید رہے گا- مسلم یونیورسٹی ایک اقلیتی ادارہ ہے، اقلیتی ادارہ ہونے کی وجہ سے اس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں، جب ہم کسی ادارے کو کسی اقلیت سے منسوب کرتے ہیں تو یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ادارہ اس اقلیت کے لیے کچھ کام کرے گا، آج جب کوئی شخص اپنے فرقے یا طبقے کے لیے کوئی بات کہتا ہے تو ہم بڑی آسانی سے اسے فرقہ پرست کہہ دیتے ہیں، یہ ہمارا سوچنا غلط ہے، اپنی بھلائی کے لیے کوئی بات کہنا یا اقدام کرنا یہ فرقہ پرستی نہیں ہے، اس طرح اگر کوئی اقلیتی ادارہ ہے، تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اقلیت کی بھلائی اور ترقی کے لیے سوچے اور اس کے لیے عملی اقدامات کرے، کیونکہ اس کے قیام کا مقصد یہی ہے، اس میں کسی دوسرے کی حق تلفی نہیں ہے بلکہ اپنے حقوق کی حفاظت ہے، اس لیے آج اگر ریزرویشن کیا گیا ہے تو وہ اسی فکر کا نتیجہ ہے- دوسری بات یہ کہ وہاں کے جو طلبہ زیر تعلیم تھے، ان کے لیے 50% نمائندگی تھی، اب جب کہ 50% مسلم طلبہ کے لیے کر دیا گیا تو گویا داخلی Internal چیز کو خارجی External بنادیا گیا، ایسا کرنے میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں پڑ رہا ہے کہ دوسرے کی حق تلفی ہو رہی ہے- اس سال داخلے کے جو اعداد وشمار آئے ہیں، ان کو جان کر

آپ کو حیرت ہوگی کہ کسی پروفیشنل کورس میں دو یا تین طلبہ زیادہ ہو گئے یا کسی میں دو یا تین کم ہو گئے، میڈیکل میں کم ہو گئے تو انجینیرنگ میں زیادہ ہو گئے، تو وہ طلبہ جو داخلی Internal تھے ان کی جگہ پر خارجی Exteranal آ گئے، اس کا ایک اور مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے مسابقت کا جذبہ اور بڑھے گا، اس لیے کہ جب خارجی طلبہ کو معلوم ہوگا کہ اب سیٹ زیادہ ہو گئی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ کوشش کریں گے اور وہ طلبہ جو پہلے ہی سے زیر تعلیم ہیں، جب انہیں معلوم ہوگا کہ وہ پیچھے ہو رہے ہیں تو وہ اپنی کوششیں تیز کریں گے، اس لیے ریزرویشن، یونیورسٹی، طلبہ اور معاشرے سبھی کے لیے ایک مفید اور کارآمد چیز ہے-

سوال :- آج میڈیا اور کچھ سیاسی پارٹیاں اس کی مخالفت کر رہی ہیں، ان کے تعلق سے آپ کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:- میرا خیال ہے کہ ان کی مخالفت برائے مخالفت ہے- ایسے معاملات کی بعض لوگ تو ناواقفیت کی بنیاد پر مخالفت کرتے ہیں اور بعض لوگ جانتے ہوئے بھی اسے ایک ایشو بنانے کی فکر میں ایسا کرتے ہیں، اس مسئلے میں بھی یہ دونوں چیزیں ہو رہی ہیں-

سوال:- یونیورسٹی میں آپ اہل سنت کی مذہبی سرگرمیوں سے کتنا مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:- اللہ کا شکر ہے، پچھلے دس سالوں میں اس میدان میں کافی سرگرمی اور تیزی آئی ہے، اس سے پہلے ذرا یہ سرگرمیاں پھیکی اور ماند پڑ گئی تھیں اور لوگ اپنوں تک محدود ہو گئے تھے- جماعتی سطح پر یہ کام نہیں ہو رہا تھا، گزشتہ دنوں حضرت امین میاں نے ''البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ'' قائم کر کے بڑا کام کیا- ان کی ذاتی کوششوں سے بڑا فائدہ ہوا ہے اور اس کے علاوہ جماعتی سطح پر بھی اور انفرادی سطح پر بھی اس طرف اہل سنت کی توجہ مبذول ہوئی ہے، یہ سرگرمی علی گڑھ میں بھی ہے، خاص طور سے یہاں آپ کا رسالہ بہت مقبول ہوا ہے، پرانے لوگ بھی اور نئے لوگ بھی پڑھ رہے ہیں اور بہت سے ایسے حضرات بھی پڑھ رہے ہیں جو آپ کے نظریات سے پورے طور پر اتفاق نہیں رکھتے یہ صحافت ہے جو ذہن سازی میں وہاں بڑا اہم کردار ادا کر رہی ہے-

سوال :- عام طور پر علمائے اہل سنت اپنے طلبہ کو عصری جامعات کی طرف رخ کرنے سے روکتے ہیں کہ وہ وہاں جانے کے بعد اپنی مذہبی شناخت اور شرعی وضع قطع بدل ڈالتے ہیں بلکہ بعض حالات میں ان کی دینی فکریں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں؟ یہ کہاں تک صحیح ہے؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:- ایسی باتوں سے پورے طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا- کچھ حد تک ایسی باتیں بجا ہیں، یہ مجھے تسلیم ہے، دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب ہماری جڑیں کمزور ہوتی ہیں تو بہت جلد درخت سوکھ جایا کرتے ہیں اور جڑیں جب مضبوط ہوتی ہیں تو پیڑ کہیں بھی چلا جائے وہ سرسبز وشاداب رہتا ہے- تو جو یہ کہا جاتا ہے کہ مدارس سے ہمارے طلبہ گئے اور بہت جلد بدل گئے اور وہ اپنی وضع قطع بھی بدل لیے تو اس کی اصل وجہ وہی ہے جو میں نے بیان کی، ایسے طلبہ مدارس میں تعلیم ضرور حاصل کیے ہوتے ہیں مگر ان کی تعلیم ادھوری ہوتی ہے، ان کی فکریں ابھی مستحکم نہیں ہوتیں، وہ احساس کمتری کے بھی شکار ہوتے ہیں- ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ مدارس نے جو اپنا معیار بنا رکھا ہے، اس کے پیش نظر لوگ اپنے کمزور بچوں کو ہی وہاں بھیجتے ہیں- اب ایسے بچے یونیورسٹی کے کھلے ماحول میں پہنچ کر آزاد رویہ اختیار کرنے لگیں تو ان پر کیا تعجب ہے؟ وہ طلبہ جن کا اپنا مذہبی بیک گراؤنڈ ہے آخر وہ کیوں نہیں بدلتے؟ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا کہ مدارس سے جو طلبہ یونیورسٹی میں آ رہے ہیں تو اس سے صرف نقصان ہو رہا ہے، کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اصل میں پہلے رواج یہ تھا کہ جو اسکول لائن سے پڑھتا وہ صرف ادھر ہی کا ہو کے رہ جاتا، اس کی سوچ وفکر ان سے یکسر مختلف ہوتی، جو مدارس سے پڑھے ہوتے، ایسے ہی مدارس سے پڑھنے والے اسکول اور یونیورسٹی والوں سے دور دور رہتے تو یہ چیز غلط تھی، اس سے غلط فہمیاں پیدا ہو رہی تھیں، اب مدارس سے پڑھ کر طلبہ یونیورسٹیز میں آ رہے ہیں تو اس سے فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ پہلے جو دوریاں تھیں وہ کم ہو رہی ہیں اور افہام وتفہیم کی راہیں کھل رہی ہیں، جو بہر حال بڑی اچھی بات ہے-

سوال :- کہتے ہیں کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ علی گڑھ کی تہذیبی روایات پر زبردست زوال آیا ہے اس کے بنیادی وجوہات کیا ہیں؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:- یہ بالکل درست ہے کہ ماضی میں علی گڑھ کی شائستہ تہذیب

کافی مشہور تھی، لوگ علی گڑھ صرف پڑھنے کے لیے نہیں جاتے وہاں کی تہذیب بھی سیکھنے
جاتے اور واقعی علی گڑھ ایک بہترین تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ عمدہ تربیت گاہ بھی تھی، لیکن آج
علی گڑھ کی تہذیب بھی زوال پذیر ہے، اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ بھی ہے کہ آج ہمارا پورا
معاشرہ تہذیبی سطح پر زوال آمادہ ہے، اس کی گرفت میں ہمارے گھر اور معاشرہ سے لے کر
ہمارے مدارس، کالجز، یونیورسٹیز اور دوسرے ادارے بھی ہیں، علی گڑھ بھی اس تہذیبی
زوال سے متاثر ہوا، دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ علی گڑھ کے جس دور کو یاد کررہے ہیں یہ
وہ دور تھا کہ جو طبقہ یہاں کا رخ کررہا تھا وہ اس ذہنیت کے ساتھ آرہا تھا کہ ہمیں چل کر علی
گڑھ میں تربیت بھی لینی ہے اور آج ہمارے معاشرے کا رجحان یہ ہے کہ کوئی یہ برداشت
نہیں کرسکتا کہ دوسرا اسے سمجھائے، تو جو پہلے ہی سے یہ ذہن بنایا ہو کہ ہمیں کسی کی نہیں سننی
ہے تو پھر اصلاح غیر ممکن ہے۔

علی گڑھ کے تہذیبی زوال کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ یہاں پہلے جو سینئر جونیر میں تمیز کا
ماحول تھا کہ سینئر کا جونیر پر ایک رعب ہوتا تھا، جونیر اس کا احترام کرتا تھا اور سینئر اس کے
بڑے بھائی کی طرح ہوتا تھا، اب یہ چیزیں علی گڑھ سے رخصت ہوتی جارہی ہیں، لیکن پھر
بھی علی گڑھ کی تہذیبی صورت حال آج بھی دوسرے اداروں کی بہ نسبت بہتر ہے۔

سوال:-علی گڑھ یونیورسٹی کی تعلیم وتہذیب اردو زبان وادب کے حوالے سے کافی
معروف رہی ہے، مگر اب طلبہ کی ایک بڑی تعداد اس زبان سے ناآشنا ہے، آخر ایسا کیوں؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:-اس کی کئی ایک وجوہات ہیں، لیکن ان میں سب سے بڑی
وجہ یہ ہے کہ پچھلی کئی دہائیوں سے اردو کو پیچھے کرنے کے لیے منظم سازشیں رچی جارہی ہیں،
ان میں سے ایک یہ ہے کہ طلبہ کے ذہن میں یہ بات ڈالی جارہی ہے کہ تم اگر اردو پڑھوگے تو
کسی کام کے نہیں رہوگے، جب تک تم زبان پڑھوگے کچھ اور پڑھ لوگے جس سے تمہارا فائدہ
ہوگا، یہ جان بوجھ کر ذہن میں ایک غلط تاثر ڈالا جارہا ہے، تاکہ آپ آہستہ، آہستہ اپنی زبان
سے الگ ہوجائیں، یہ سازش انگریزوں کے زمانے سے ہی بڑی شدت کے ساتھ کی جارہی
ہے کہ اس سے تمہیں ملازمت اور نوکریاں نہیں مل سکتیں، اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا،

لیکن آپ سوچیے ایک آدمی دوسرے سے دوستی کرتا ہے، رشتہ داریاں قائم کرتا ہے، کسی کو چچا
کہتا ہے تو یہ نہیں سوچتا کہ اس کا کیا فائدہ ہوگا بس اس سے ہمیں ذہنی آسودگی ملتی ہے، زبان کا
رشتہ بھی تقریباً یہی ہے، کیوں کہ زبان ہمارے کلچر سے جڑی ہوئی ہے، اردو زبان کو چھوڑ کر
ہم اپنے کلچر سے دست بردار نہیں ہوسکتے- آج جس طرح رشتہ داریوں سے لوگوں کی دل
چسپیاں کم ہوتی جارہی ہیں اسی طرح زبان سے بھی ہوتی جارہی ہیں، مگر یہ غلط ہے، اس لیے
علی گڑھ میں بھی اور دوسری جگہوں پر بھی اردو سے لوگوں کا رشتہ کمزور ہوتا جارہا ہے، لیکن پھر
بھی علی گڑھ یونیورسٹی کا حال دوسرے اداروں سے بہتر ہے، علی گڑھ یونیورسٹی وہ واحد ادارہ
ہے جہاں اردو لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل نصاب ہے، وہ طلبہ جو اردو بالکل نہیں
جانتے ان کے لیے ہم الگ سے وقت بھی دیتے ہیں، بلکہ غیر مسلم افراد جو اردو سیکھنا چاہتے
ہیں ان کے لیے بھی یہاں خاص اہتمام ہے، اس سے خاصا فائدہ ہوا، اس طرح کے کئی لوگ
اردو اخبار پڑھنا سیکھ لیے، تو بہر حال کوشش ہورہی ہے اور دوسرے اداروں کی بہ نسبت یہاں
اردو کی صورت حال کافی بہتر ہے اور میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ اردو ایک پرکشش زبان
ہے، اس کی کشش اسے کبھی مٹنے نہیں دے گی- کبھی ایک دور تھا کہ ایم اے میں ایک دو
طالب علم ہوا کرتے تھے، آج بہت ہیں اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا-

سوال:-موجودہ دور میں اردو زبان وادب کی بقا اور اس کے تحفظ کا کریڈٹ کس کو
دیں گے؟ مدارس کو یا پھر عصری اداروں کو؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:-(مسکراتے ہوئے) یہ سوال تو آپ نے بہت اچھا کیا ہے،
مگر یہ ایک نزاعی سوال ہے، مگر میرے جواب سے جھگڑا نہیں ہوسکتا کیونکہ میرا تعلق مدرسے
اور یونیورسٹی دونوں سے رہا ہے (ہنستے ہوئے) بہر حال اردو کے فروغ میں دونوں کا
کردار رہا ہے- مدارس کا کردار بھی کافی اہم ہے اور یونیورسٹی کا تو ہے ہی، اپنی اپنی سطح پر
دونوں نے بڑا کام کیا ہے-

سوال:-مگر یہ تو ایک سیاسی جواب ہوا؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:-حقیقت یہی ہے، اردو کے فروغ کے تعلق سے مدارس کا جو

کردار رہا ہے، اس پر میں نے کافی مضامین لکھے ہیں، پچھلے دنوں ایک رسالہ نکلتا تھا ''خبر و نظر'' میں اس کا جوائنٹ ایڈیٹر تھا، اس میں میں نے باقاعدہ اس چیز کا اعتراف کیا کہ پورے ہندوستان میں جو مدارس کا جال بچھا ہوا ہے، اردو کو خون فراہم کرنے میں ماضی میں اس نے بڑا اہم رول ادا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں، میں ایک مرتبہ کیرالا کے ایک مدرسے میں گیا تو لوگوں نے کہا کہ آپ اردو میں تقریر کریں، میں نے کہا کہ آپ کے طلبہ سمجھ لیں گے؟ انہوں نے کہا کہ کچھ تو سمجھیں گے، ان کو اردو پڑھانے اور سمجھانے کے لیے ہم لوگوں نے شمالی ہند سے باقاعدہ ایک اردو کا استاذ بلایا ہے اور وہ طلبہ کو اردو پڑھا رہے ہیں، ویسے بھی یہ رابطے کی زبان ہے، اسے تو سیکھنا چاہیے- پھر انہوں نے ایک اچھی بات یہ بتائی کہ چھٹیوں میں وہ اپنے طلبہ کو مختلف گروپ کی شکل میں ان علاقوں میں بھیج دیتے ہیں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے کہ وہ ان علاقوں میں رہ کر لوگوں سے ملیں اور اردو سیکھیں، اس لیے اس میں کوئی دورائے نہیں کہ مدارس بہت اہم کردار ادا کر رہے ہیں، لیکن ایک بات یہ کہ مدارس کا اصل کام اردو سکھانا نہیں ہے بلکہ وہ ضمنی طور پر یہ کام انجام دے رہے ہیں، مگر عصری جامعات میں یہ کام بنیادی طور پر کیا جاتا ہے، اس لیے وہاں زبان کے ساتھ ادب بھی پڑھایا جاتا ہے، اس لیے عصری جامعات کو اگر اردو کے فروغ کے حوالے سے نظر انداز کیا جاتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ اردو کا ادبی ولسانی حیثیت سے جو فروغ ہو رہا ہے، ان میں ان ہی عصری اداروں کا کردار ہے- اس لیے میرے خیال میں دونوں کی اپنی اپنی سطح پر اہمیت ہے، اگر کوئی دونوں میں سے کسی ایک کو اہمیت دیتا ہے تو یہ درست نہیں ہوگا-

سوال:-اگر مدارس کے نصاب میں اردو ادب کو شامل کر دیا جائے تو مفید ہوگا یا نہیں؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:-میری رائے صدفی صد اس حق میں ہے کہ مدارس کے نصاب میں اردو ادب کی شمولیت ہونی چاہیے اس کی میں مختلف موقعوں پر وکالت کر چکا ہوں، بلکہ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ علی گڑھ میں باقاعدہ کچھ اساتذہ نے مدارس کے لیے نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اور اس کام کو تیزی سے انجام دے رہے ہیں،

مجھ سے بھی کہا گیا تھا کہ میں بھی اس کی تیاری میں شامل رہوں، مگر میری عدیم الفرصتی نے مجھے موقع نہ دیا- حالانکہ اس کے نصاب کو تیار کرنے کے لیے باقاعدہ کسی نے کہا نہیں ہے، لیکن اس کی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے ہم لوگوں نے یہ قدم اٹھایا ہے، کیونکہ اگر مدارس کے لوگ اگر اس کو کریں تو میرا خیال ہے کہ وہ اتنا جامع نہیں ہوگا، مگر ہم مدارس کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نصاب کو تیار کر رہے ہیں، اس کے لیے ہم نے کئی افراد سے بھی مشورے کیے ہیں، ان شاء اللہ آپ سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کریں گے کہ مدارس کے طلبہ کے لیے کس طرح کی چیز پیش کی جائے- اس سلسلے میں میری ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس کو پڑھانے کا نظم ایسے افراد کے سپرد کیا جائے جنھوں نے عصری جامعات سے ڈگری حاصل کی ہو، یا ڈگری نہ ہو تو بنیادی طور پر وہ ادب فہم ہوں اور شعر وسخن نیز ادب کا اچھا ذوق اور صلاحیت رکھتے ہوں-

سوال:-آج عام طور پر عصری اقلیتی اداروں سے اردو زبان رخصت ہوتی جا رہی ہے بلکہ بعض وہ ادارے جن کی شناخت ہی اس زبان کے حوالے سے تھی وہاں سے بھی اس کا جنازہ نکل گیا، بنیادی وجوہات کیا ہو سکتے ہیں؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:-اس سوال کا جواب اس کے علاوہ اور کیا دیا جا سکتا ہے کہ اب حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ ہر چیز میں مادیت اور مالی منفعت کو تلاش کیا جا رہا ہے، اردو زبان بھی اسی فکر کی زد میں ہے، جہاں تک ان عصری اداروں سے اردو کی رخصتی کا سوال ہے تو ان کی کئی وجوہات ہیں، جن کو میں نے چھٹے سوال کے جواب میں ذکر کر دیا ہے-

سوال:-آپ ایک معیاری اردو رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے جوائنٹ ایڈیٹر ہیں، ایسے میں آپ بتائیں کہ ایک معیاری اردو رسالہ نکالنے کے لیے کن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:-میرا خیال ہے کہ اس سوال کا عملی جواب تو آپ ''جام نور'' نکال کر دے رہے ہیں اور رسائل کے ذمہ داران اور قارئین کو یہ بتا رہے ہیں کہ ایک معیاری رسالے کو کس طرح نکالا جاتا ہے اور اس کی بنیادی ضرورتیں کیا ہیں؟ اس کے علاوہ

آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ بالعموم ہمارے مذہبی رسائل کا جو مزاج تھا اس ڈگر سے الگ ہٹ کر عملی طور پر ایک نمونہ پیش کیا کہ ہم غیر جذباتی ہوں، ایسا نہیں کہ ہم رسالہ نکال رہے ہیں تو ہمارا کوئی مطمح نظر ہی نہ ہو، مطمح نظر تو ہوگا، مگر بعض وقت ہم جذباتی ہوجاتے ہیں، اتنے جذباتی ہوجاتے ہیں کہ ہمارے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں رہتی، اس لیے ایک معیاری رسالہ نکالنے کے لیے ہمیں غیر جذباتی اور متوازن ہونا بے حد ضروری ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہماری نظر میں وسعت ہونی چاہیے، تحمل ہونا چاہیے اور سب سے بنیادی چیز یہ کہ ہمیں نتائج پر نظر رکھنی چاہیے کہ ہم کیا پیش کرنا چاہتے ہیں؟ اگر رسالہ کو ہم کسی اعلیٰ مقصد کے تحت نہیں نکال رہے ہیں تو پھر کوئی فائدہ نہیں، اس کے اعلیٰ مقاصد تو یہ ہیں کہ آپ ملت کی ذہن سازی کریں اور رائے عامہ ہموار کریں، ذہن سازی کا کام بڑا ہی صبر آزما اور وقت طلب ہوتا ہے، میرا خیال ہے کہ ایک معیاری رسالہ نکالنے کے لیے یہ بنیادی چیزیں ہیں-

سوال :- عام طور پر ہمارے مذہبی رسالوں کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے انھیں ایک ''پارٹ ٹائم جوب'' سمجھ کر شائع کیا جاتا ہے، یہ فکر صحت مند صحافت کے لیے کتنی درست ہے؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:- اس میں ایک صورت تو یہ ہے کہ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے، کبھی ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں رہتی ہے کہ ہم ایک کام کو الگ سے انجام دیں اس لیے ایک کام کر رہے ہوتے ہیں تو اس کے ساتھ دوسرے کام کو ضمنی طور پر کرتے ہیں، اس کو میں غلط نہیں کہتا بلکہ اس ضمنی کام کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ جب ہم ایک کام کے ساتھ دوسرا کام بھی کر رہے ہوں گے تو اس دوسرے کام پر ہماری توجہ کم ہوگی، اس لیے اس کے نتائج بھی اثر انگیز اور معیاری نہیں ہوں گے، لیکن اگر ہم ایک ہی چیز کو پوری توجہ، فکر، لگن اور ذمہ داری کے ساتھ کر رہے ہوں گے تو اس کی بات ہی کچھ اور ہوگی اس لیے مذہبی رسائل کے تعلق سے میری رائے تو یہی ہے کہ اس کو پورا وقت دے کر پوری ذمہ داری اور توجہ کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے-

سوال:- ماہنامہ جام نور کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی:- سب سے پہلے تو میں آپ کو بتاؤں کہ جس وقت میں کافی

چھوٹا تھا، اس وقت حضرت علامہ ارشد القادری کلکتہ سے ''جام نور'' نکالا کرتے تھے، اس کا ایک شمارہ ہمارے گھر پر موجود تھا، جس کو میں نے سب سے پہلے مطالعہ کیا اور پھر کرتا رہا، تو میں جام نور کا اس وقت کا قاری ہوں جب مجھے شاید اردو کی صحیح قراءت بھی نہ آتی تھی، جب آپ نے اس کی نشأۃ ثانیہ کی تو میرے دل سے یہ دعا نکلی کہ کاش یہ رسالہ بھی اسی جیسا ہوجائے، یقین جانئے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میری دعائیں قبول ہوگئیں- آپ نے مذہبی صحافت کی ایک نئی پہچان بنائی ہے، آج اس رسالے کو جو بھی دیکھتا ہے خواہ مسلکی طور پر آپ کا ہم خیال نہ ہو، وہ بھی یہ کہے بغیر نہیں رہتا کہ یہ نہایت معیاری اور دلچسپ رسالہ ہے- آپ کی عنایت سے یہ رسالہ پہلے شمارے سے ہی میرے پاس پہنچ رہا ہے، یقین جانیے اس کو صرف میں ہی نہیں پڑھتا، بلکہ میرے بہت سے احباب جن کا تعلق ادب سے ہے وہ بھی اس کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور بے ساختہ یہ کہتے ہیں کہ یہ رسالہ مذہبی صحافت کا ایک ایسا ترجمان ہے جو مکمل طور پر ''ذہن سازی'' کر رہا ہے اور فکری جمود کو توڑ رہا ہے- عام طور پر رسائل میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں پہلے سے ہی تأثرات، تعصّبات اور ترجیحات طے ہوتی ہیں، میرے خیال میں ان سے اتنی ذہن سازی نہیں ہوتی مگر آپ ایک بڑا کام یہ کر رہے ہیں کہ آپ سوال اٹھاتے ہیں اور ان پر مختلف لوگوں سے رائے لیتے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ عصری تقاضوں کے پیش نظر آپ سوالات کرتے ہیں، جن پر عام طور پر لوگ سوچتے تک نہیں، مگر آپ کے ان سوالات کو اٹھانے کے بعد لوگ ان پہلوؤں پر غور کرتے ہیں، جن سے زبردست ذہن سازی کا کام ہوتا ہے- اس کے علاوہ عام طور پر مذہبی رسائل میں ایک خاص قسم کی زبان استعمال ہوتی ہے، جسے ہم عربی یا فارسی آمیز کہہ سکتے ہیں، مگر آپ نے اپنے مذہبی رسالے میں ادبی زبان کو جگہ دی ہے، خود آپ کا اداریہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جسے آج بے شمار لوگ پسند کرتے ہیں، گو یہ رسالہ عصری جامعات میں زبان و ادب کو فروغ نہ دے رہا ہو، مگر مذہبی اداروں میں یہ یقیناً اردو کو لسانی حیثیت سے فروغ دے رہا ہے- □□□

(شمارہ اگست ۲۰۰۵ء)

مشرف عالم ذوقی

تاج انکلیو، لنک روڈ، گیتا کالونی، دہلی

معروف ناول نگار مشرف عالم ذوقی کا شمار آج کے نمائندہ فکشن نگاروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے ۱۷سال کی عمر میں ''عقاب کی آنکھیں'' سے اپنی ناول نگاری کا سفر شروع کیا اور اب تک اُن کی نوک قلم سے تقریباً ایک درجن ناول، ۳۰۰ کہانیاں، درجنوں مضامین اور کتابیں معرض وجود میں آ گئی ہیں، ان کی متعدد کہانیاں دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں اور ان کی کہانیوں پر کئی ٹی وی سیریل بھی بنے ہیں- ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۷ء تک ماہنامہ ''یووک دھارا'' اور ۱۹۸۷ء سے ۱۹۸۸ء تک ''دال جگت'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہ کر صحافتی تجربہ بھی رکھتے ہیں، ان کا قلم زیادہ تر آزاد ہندوستان میں مسلم مسائل کے اوپر اٹھا- ان کے مشہور افسانوی مجموعے اور ناول 'مسلمان' 'بیان' 'لمحے یہ آئندہ' 'صدسازندے' 'پوکے مان کی دنیا' 'لینڈ اسکیپ کے گھوڑے' اور ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان'' ان کی تحریروں کا رخ متعین کرتے ہیں- پچھلے کئی سالوں سے ان کی شخصیت بعض حلقوں میں اس حوالے سے متنازع رہی ہے کہ وہ مذہبی ادب کو کوئی حیثیت نہیں دیتے، مگر خود ان کا کہنا ہے کہ وہ ''احیاء العلوم'' ''غنیۃ الطالبین'' ''سبع سنابل'' اور ''مثنوی مولانا روم'' جیسی معتبر و مستند اور اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے والی کتابوں کا شوق سے مطالعہ کرتے ہیں لیکن وہ ادب کو مذہب سے نہیں جوڑتے اور ''بہشتی زیور'' اور ''دوزخ کا کھٹکا'' جیسی کتابیں جو بقول ان کے بعض حلقوں سے ان پر تھوپی جا رہی تھیں، انہوں نے انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا- تحریر و قلم کے ساتھ آپ متعدد ٹی وی چینلوں سے بھی وابستہ ہیں-

سوال :- سب سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ نے ناول نگاری کا آغاز کب سے کیا؟

مشرف عالم ذوقی :- ناول نگاری کا آغاز میں نے سترہ سال کی عمر سے کیا، میرا پہلا ناول تھا ''عقاب کی آنکھیں''، جس کو میں نے صرف ۱۷سال کی عمر میں مکمل کیا، بچپن سے ہی میرے دل و دماغ میں ایک بات داخل ہو چکی تھی کہ مجھے کہانیاں لکھنا ہے، کہانیاں چونکہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو پیش کرتی ہیں، مگر ناول کا جو منظر نامہ ہے وہ بہت وسیع ہے، ناول میں ایک پوری رقص کرتی ہوئی زندگی کو ہم دکھا سکتے ہیں، اس لیے ناول لکھنا کسی بھی اچھے کہانی کار کے لیے سب سے مشکل کام ہے- اس طرح بچپن سے میرے ساتھ یہ بات رہی کہ اگر مجھے ایک پوری زندگی کو دکھانا ہے، زندگی کے فلسفے کو قید کرنا ہے تو مجھے ناول نگاری کی طرف رخ کرنا ہوگا، ان ہی افکار کے ساتھ میں ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوا اور مجھے اس میں بہت کامیابیاں ملیں-

سوال :- آپ ماضی و حال کے کن اچھے قلم کاروں سے متاثر ہیں؟ کیا آپ نے اپنے اسلوب میں ان میں سے کسی کی تقلید بھی کی ہے؟

مشرف عالم ذوقی :- جہاں تک ماضی کی بات ہے تو داستانوں سے ہی اردو فکشن وجود میں آیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ آج کی جو نسل سامنے آ رہی ہے، اس نے نہ الف لیلیٰ پڑھی ہے اور نہ داستان امیر حمزہ، حالانکہ ان داستانوں کے بغیر تو انگریزی ادب بھی وجود میں نہیں آیا، مغربی لٹریچر پر ہمیشہ ان کتابوں کا اثر رہا ہے، اب رہی بات ہم لوگوں کی، تو مجھے لگتا ہے کہ جب ۱۹۰۰ء کے آس پاس ادب شروع ہوا اور اس زمانے میں جو کہانیاں لکھی گئیں ان کے اثرات آج بھی باقی ہیں جب کہ ہماری کہانیوں نے سو سال کا ایک لمبا سفر طے کر لیا ہے، لیکن خوشتر صاحب! اس حوالے سے میں ایک خاص بات کا ذکر کرنا چاہوں گا جو بہت ضروری ہے، مجھے لگتا ہے کہ ہماری کہانیاں آج بھی منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی یا بیدی سے آگے نہیں بڑھ سکیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ چوراہے پر چار بتوں کو نصب کر دیتے

ہیں اور اس کے آگے نہیں دیکھتے تو مجھے لگتا ہے کہ یہ بعد میں پیش آنے والے ادب کے ساتھ ناانصافی ہے، ان کے بعد کیا لکھا گیا؟ قرۃ العین حیدر کا ادب سامنے آتا ہے، انتظار حسین کا ادب سامنے آتا ہے مگر ادب میں انتہائی خاموشی گزر جاتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس کے بعد کوئی ادب ہی سامنے نہیں آیا- حالانکہ یہ سچ نہیں ہے، ادب سامنے آرہا ہے اور اردو زبان زندہ ہے-

سوال :-مگر میرا سوال اب تک تشنہ ہے، میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ نے اپنی تحریروں میں کسی کی تقلید کی ہے یا خود اپنا ایک اسلوب بنایا ہے؟

مشرف عالم ذوقی:- دیکھیے! میں نے شروع سے کوشش کی کہ میں اپنا ایک الگ اسلوب بنا سکوں، جب میں نے کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا تھا، اس وقت میرا اسلوب کچھ اور تھا، مجھ پر مغرب کے کچھ فنکاروں کا اثر تھا اور روسی فنکار میرے آئیڈیل تھے، میرے شروعات کے ناولوں میں روسی فنکاروں کا اثر رہا لیکن آہستہ آہستہ ایک فنکار ان اثرات سے باہر نکل آتا ہے، اس کے بعد خود اپنا راستہ تلاش کرتا ہے اور اپنی کہانیوں کا ایک الگ بنیادی ڈھانچہ تیار کرتا ہے، اس سے مجھے لگتا ہے کہ میں نے اپنا ایک الگ اسلوب بنایا، اس کی وجہ یہ رہی کہ جب میں نے سوچنا شروع کیا اور جن ناولوں کی بنیاد رکھی وہ ہندوستانی زمین اور ہندوستانی مسلمانوں پر رکھی، میں نے جب آزادی کے بعد اپنا تخلیقی سفر شروع کیا تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اس ملک میں مسلمان جس ماحول میں زندگی گزار رہا ہے، مسلمان جس ماحول میں پرورش پا رہا ہے یا مسلمان جو ڈر ڈر کے جی رہا ہے، ایسے میں ان کی حمایت میں آواز بلند کرنا بہت ضروری ہے- آپ بتائیے کہ اپنے ہی ملک میں بار بار اسے کہا جا رہا تھا کہ تم غدار ہو، اس لیے میں نے ہندوستانی مسلمانوں کی آواز کو اپنے ناولوں میں شامل کیا-

سوال:-آپ کی کہانیوں اور ناولوں کے موضوعات کیا رہے ہیں؟

مشرف عالم ذوقی:-میری تمام تر کہانیوں اور ناولوں کے موضوعات شروع میں بہت محدود تھے، لیکن بعد میں ان کے اندر وسعت آتی چلی گئی، جیسے آزادی، غلامی، آزادی کے

بعد فرقہ وارانہ فسادات اور آزادی کے ۵۸/ برسوں میں جو کچھ مسلمانوں پر گزری، یہ میری کہانیوں کے موضوعات ہوا کرتے تھے، میری ایک کہانی بابری مسجد المیہ پر تھی، اس کے بعد میرا ایک اور ناول ہے جس کا نام ہے ''صد سازندے'' جس میں میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ اس ملک میں کس طرح سے مسلمانوں کو اقلیت کہہ کر دبایا جاتا ہے، ایک بہت بڑی آبادی جس کو دوسری بڑی اکثریت کہنا چاہیے تھا، لیکن ہوا یوں کہ ہمارے علماء اور دانشوروں نے بھی پتہ نہیں کس دباؤ میں مسلمانوں کو بار بار اقلیت کہا، جس کی وجہ سے ایک بڑی قوم کے پھلنے پھولنے کے مواقع میسر نہیں آسکے، مسلمانوں کو اگر آج بھی ہم دوسری بڑی اکثریت کے طور پر منوالیں، دوسری بڑی اکثریت کہنا شروع کر دیں تو مجھے لگتا ہے کہ مسلمانوں کے حق میں یہ بہت بڑی کامیابی لے کر آئے گا اور ہمیں اپنا راستہ تلاش کرنے میں آسانی ہوگی-

سوال :-مگر یہ تو تعبیر کا فرق ہے، آپ مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں اقلیت کہہ سکتے ہیں اور ہندوؤں کے بعد مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے انہیں دوسری بڑی اکثریت بھی کہہ سکتے ہیں، کیا تعبیر کے فرق سے ان کی مشکلات کم ہو سکیں گی؟

مشرف عالم ذوقی:-تعبیر کے فرق اور لفظوں کی تبدیلی سے بہت فرق آتا ہے، میں اس کی مثال ایک حکایت سے دینا چاہتا ہوں کہ ایک بادشاہ کے دربار میں بیک وقت دو فقیر آتے ہیں، ایک فقیر صدا لگاتا ہے کہ اے بادشاہ! تو اچھا کرتا کہ تجھے اچھا پھل ملے، دوسرا فقیر کہتا ہے کہ تو برا مت کرتا کہ تجھے خراب پھل نہ ملے، بادشاہ پہلے فقیر کو دس دینار دیتا ہے اور دوسرے کو پانچ دینار دیتا ہے، جب فقیر چلے جاتے ہیں تو وزیر بادشاہ سے پوچھتا ہے کہ اے بادشاہ سلامت! بات تو دونوں کی ایک تھی لیکن آپ نے پہلے فقیر کو دس دینار اور دوسرے کو پانچ دینار دیے، یہ ناانصافی کیوں؟ تب بادشاہ مسکرا کر گویا ہوتا ہے کہ تم نے ایک بات محسوس نہیں کی، بات دونوں کی ایک ہی تھی لیکن پہلے فقیر نے اچھائی کا سہارا لے کر اور دوسرے نے برائی کا سہارا لے کر پیش کی، اس لیے میں نے بھی مسلمانوں کے لیے لفظ اقلیت کے خلاف آواز اٹھائی، کیوں کہ جیسے ہی ہم لفظ اقلیت بولتے ہیں، ہم کمزور ہو جاتے

ہیں اور سننے والا بھی ہمیں کمزور سمجھتا ہے، لیکن جب ہم اسی کو بدل کر دوسری بڑی اکثریت کہتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ مسلمان بھی ایک طاقت ور قوم کی شکل میں یہاں موجود ہے۔

سوال:- اردو کی بقا کے تعلق سے آج متضاد آراء سامنے آرہی ہیں، ایسے میں آپ اردو کا مستقبل کیسا پاتے ہیں؟

مشرف عالم ذوقی:- دیکھیے! میں اردو کا مستقبل بہت تابناک سمجھتا ہوں، مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ اردو کا مستقبل اندھیرے میں ہے یا اردو ختم ہوتی جارہی ہے، ظاہر ہے کہ آزادی کے بعد روزی روٹی سے کاٹ دیے جانے کے بعد بھی یہ زبان زندہ رہی تو یہ اردو کی مضبوطی اور شیرینی کا اثر ہے اور چونکہ اردو ہمیشہ عوام کی زبان رہی اس لیے یہ آج بھی زندہ ہے۔ اب یہ کہ کچھ باتوں سے اردو کو باہر نکالنے کی ضرورت ہے، جیسے اردو خوبصورت زبان ہے، اردو بہت شیریں زبان ہے، ان دعوؤں سے الگ ہٹ کر اسے زمین سے جوڑنے کی ضرورت ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اردو بہت خوبصورت ہے، حسین ہے، پیاری ہے تو ہم اسے ایک حجرے میں بند کر دیتے ہیں، اب آج کے ماحول میں اسے زمین پر لانے کی ضرورت ہے، دوسری بات جو کافی توجہ طلب ہے کہ اردو کا سرمایہ دھیرے دھیرے ختم ہوتا چلا جارہا ہے، ہمارے یہاں ادب میں نئی نسل کا آنا رک گیا ہے، اس پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، نئی نسل کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آج ادب سے جڑے ہوئے ہیں ان کی عمریں چالیس سے گزر چکی ہیں اور نئی نسلیں بالکل اس طرف نہیں آرہی ہیں، اسی طرح شاعری کی حالت بھی ہے، شاعری کے تعلق سے پہلے ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ آپ ایک پتھر پھینکیں تو وہ کسی شاعر کے یہاں گرے گا لیکن اب یہ معاملہ بھی بالکل ختم ہو گیا ہے، کیونکہ وہ ماحول نہیں رہا، نہ گھروں میں وہ ماحول رہا اور نہ سماج میں۔

سوال:- اردو کی بقا کے لیے کچھ آپ کی تجاویز؟ اگر ہو تو اختصار سے بیان فرمائیں؟

مشرف عالم ذوقی:- ہمارا سارا زور اس بات پر ہونا چاہیے کہ کسی طرح اردو نہ صرف زمین سے جڑے بلکہ ایک ایسی عملی زبان بھی بن جائے، جس کے بغیر آگے سفر طے کرنا آسان نہ ہو اور جب تک ہم اردو کو عملی زبان نہیں بنائیں گے اردو کے راستے میں رکاوٹیں

آتی رہیں گی، لیکن ان سب کے باوجود میرا ماننا یہ ہے کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے، اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے پاس اچھے اخبارات کیسے ہوں، جب تک انگریزی اخبارات کی طرح ہمارے پاس اخبارات نہیں ہوں گے، جب تک انڈیا ٹوڈے اور آؤٹ لک جیسی میگزین ہمارے پاس نہیں ہوں گی اور جب تک اچھی سائنسی اور سماجی میگزین ہمارے پاس نہیں ہے، اردو کے فروغ میں دشواریاں پیدا ہوں گی۔

سوال:- عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اردو کے فروغ کا نعرہ لگانے والوں کے گھروں کی حالت خود اردو کے حوالے سے بڑی ابتر ہوتی ہے، وہ نہ اپنے بچوں کو اردو پڑھاتے ہیں اور نہ انہیں اردو کا کوئی ماحول دیتے ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ رویہ اردو کے ساتھ بہت منافقانہ ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟

مشرف عالم ذوقی:- یہ مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے، آپ اگر یاد کریں تو جس وقت عصمت چغتائی نے اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کی بات کی تھی تو یہی مالک رام تھے جو ان کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے، جن کے بعد ان کے گھر میں کوئی اردو جاننے والا نہیں رہا، خود عصمت چغتائی کے بچے اردو نہیں جانتے ہیں، لیکن آپ عصمت چغتائی اور مالک رام کی بات چھوڑ دیجیے آج ہمارے بچے بھی اردو نہیں پڑھنا چاہتے، لیکن اگر ہمارے بچے اردو نہیں پڑھنا چاہتے ہیں تو ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اردو کی طرف لائیں، اس کے لیے ہمیں منصوبے بنانے ہوں گے، اگر ہم اردو کے حوالے سے ان کے مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کر پاتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ ہماری بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ اردو کی بقا کے لیے کون سا قدم صحیح ہوگا، اس لیے میرا خیال ہے کہ ہمیں اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی ضرورت ہے، اب دیکھیے اگر آپ ہندی جانتے ہیں اور کہانیاں لکھتے ہیں تو آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر آپ اردو جانتے ہیں اور یہ کام کرتے ہیں تو آپ کو کچھ نہیں ملتا، جب تک یہ صورت حال باقی ہے، مجھے نہیں لگتا کہ اردو کی طرف ہمارے بچے مائل ہو سکیں گے۔

اب آپ دیکھیں کہ آج الیکٹرانک میڈیا کسی بھی نظریہ یا تحریک کی اشاعت کے لیے

آج بہت بڑا اور وسیع ذریعہ ہو گیا ہے، آج بچے بڑی تیزی کے ساتھ اس کی طرف مائل ہو رہے ہیں، اگر ہمارے پاس بھی اردو کے بہت سے چینل ہو جائیں تو زبان اور مذہب دونوں کو بڑی تیزی سے فروغ ملے گا، ہمارے پاس آج کیو ٹی وی ہے جس کی وجہ سے عالمی سطح پر ہمیں کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں، ہمارے دو چینل اور بھی آرہے ہیں ایک ''الکتاب'' اور دوسرا Peace اس طرح کے اور چینل ہمارے پاس ہو جائیں تو زبان و ادب کو بہت فروغ ملے گا، کیوں کہ ان کے ذریعے ہزاروں لوگوں کو روزگار ملے گا اور بالواسطہ لسانی اور مذہبی کام بھی ہوگا۔

سوال:- کہا جاتا ہے کہ اس مصروف زندگی میں لوگوں کے پاس لمبی کہانیاں اور ناول پڑھنے کا وقت نہیں رہا، اب لوگ چھوٹے چھوٹے افسانے پڑھ کر اپنے ذوق کو تسکین فراہم کر رہے ہیں، ایسے میں آپ عہد حاضر کے ایک نمائندہ ناول نگار ہونے کی حیثیت سے ناول کی مقبولیت کو کس حال میں پاتے ہیں؟

مشرف عالم ذوقی:- دیکھیے! چند ہی لوگ ہوں گے لیکن ناول پڑھا جائے گا، ہندوستان میں الیکٹرانک میڈیا کی یلغار تو اب ہوئی ہے، جب امریکہ میں الیکٹرانک میڈیا کی یلغار ہوئی تھی تو ۲۴/ گھنٹے چینل شروع ہو گئے تھے، اس وقت یہ کہا جا رہا تھا کہ اب ناول کون پڑھے گا؟ لمبی کہانیاں کون پڑھے گا؟ لیکن پھر یہ باتیں دھیرے دھیرے ختم ہو گئیں اور لوگ کہانیوں اور ناولوں کی طرف لوٹ آئے، ہندوستان میں الیکٹرانک میڈیا کی یلغار پچھلے دس برسوں میں ہوئی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس بیچ ناول پڑھنے کا رجحان ختم ہو گیا ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ ادب سمٹ کر رہ گیا ہے، جو لکھنے والے ہیں وہی پڑھنے والے ہیں۔

سوال:- اردو کے فروغ میں مدارس اسلامیہ نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، مگر افسوس کہ اردو کے مخصوص ٹھیکیدار انہیں مسلسل نظر انداز کرتے آرہے ہیں، اس تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

مشرف عالم ذوقی:- مدارس کا رول بہت اہم ہے، مگر ہم نے انہیں مسلسل نظر انداز کیا ہے، اردو کے فروغ کا درد لیے جو لوگ بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہیں انہوں نے ہمیشہ

اپنے تحفظات اور مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے کام کیے لیکن مدارس جنہوں نے اردو کے فروغ میں عملی کام کیا اور کر رہے ہیں نہ تو ان کا اعتراف کیا اور نہ ان کو مزید مستحکم کرنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا، اردو کے ٹھیکیدار آزادی کے بعد اردو کے فروغ کے حوالے سے مختلف سوالات اٹھاتے رہے ہیں اور ایک دوسرے کی پذیرائی بھی کرتے رہے ہیں مگر مدارس کو اس حوالے سے کبھی نہیں پوچھا گیا کہ ان کی اپنی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ اس تعلق سے مدارس کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی ہے، میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

سوال:- آپ کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ آپ مذہبی ادب کو کوئی حیثیت ہی نہیں دیتے ہیں، آخر ایسا کیوں؟ کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ مذہبی ادب خصوصاً صوفیانہ ادب رواداری اور عدم تشدد کا درس دیتا ہے، کیا اس کی اہمیت و افادیت میں کسی کو شبہ ہو سکتا ہے؟

مشرف عالم ذوقی:- جب ہم لکھنا چاہتے ہیں، جب ہم لکھنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور جب ہم پر ایک ادیب ہونے کی ذمہ داری ہوتی ہے تو ہم مذہب سے الگ ہو جاتے ہیں، قلم ہندو یا مسلمان نہیں ہوتا، اس وقت قلم کو تمام دائروں سے الگ ہو کر سوچنا پڑتا ہے، اس لیے ہندو ادب یا اسلامی ادب، میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا، ایسا نہیں کہ میں اسلامی کتابیں، نہیں پڑھتا، احیاء العلوم ہو، غنیۃ الطالبین ہو، سبع سنابل ہو، میں سب کو پڑھتا ہوں، مجھے اگر ان پر لکھنے کی ضرورت پیش آئے گی تو میں لکھوں گا بھی، لیکن میں ان کو ادب تسلیم نہیں کروں گا، یہ محض اسلامی معلومات پر مشتمل کتابیں ہیں، آپ انہیں پڑھیں، آپ کو ان سے اسلام کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

سوال:- لیکن ایسا کیوں؟

مشرف عالم ذوقی:- کیونکہ ادب نہ تو اصلاحی ہوتا ہے اور نہ ہی تعمیری ہوتا ہے، بلکہ ادب صرف ادب ہوتا ہے، اگر آزادی کے بعد ان ۵۸/ برسوں میں مسلمانوں کا مسئلہ نہ ہوتا بلکہ ہندوؤں کا ہوتا، تب بھی ہم لکھتے، یہاں ایک مغربی ادیب کی مجھے اچھی بات یاد آرہی ہے کہ ''مٹی کا ایک ٹکڑا بھی سمندر بہا کر لے جاتا ہے تو دھرتی کم ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک آدمی بھی مرتا ہے تو انسانی برادری میں کمی آجاتی ہے۔'' ایک بھی آدمی، یہاں یہ نہیں کہا گیا

کہ ایک بھی مسلمان آدمی، اسی طرح جب ہم ادب لکھنے بیٹھتے ہیں تو مذہب سے الگ ہو کر لکھتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مذہبی نہیں ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ایک مسلمان نہیں ہیں، قلم کا اپنا فریضہ ہے، اس کی اپنی ذمہ داری ہے اور قلم کی اپنی ضرورت ہے، اس کو محسوس کرتے ہوئے ہم لکھتے ہیں-

سوال :- مذہبی کتابوں کو بطور ادب تسلیم کرنا الگ بات ہے اور ان کو اہمیت نہ دینا الگ مسئلہ ہے، اس لیے دونوں میں آپ کو فرق کرنا پڑے گا؟

مشرف عالم ذوقی :- مجھے لگتا ہے کہ مسلمان ہونا اور ادیب ہونا دو الگ چیزیں ہیں، میں شروع سے کہتا آ رہا ہوں کہ میرا ادب اسلامی ادب نہیں ہے اور یہ بات صرف مشرف عالم ذوقی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ ہر ادیب کہتا ہے کہ کوئی بھی ایسا ادب جو اپنے ساتھ مذہب، اس کی رواداری، تعلیمات یا اصلاحی پہلوؤں کو لے کر اپنے ساتھ آتا ہو، ایسے کسی بھی ادب کو ادب تسلیم نہیں کیا جاتا-

سوال :- آپ کی ان ہی باتوں کو لے کر کئی ایک رسالوں نے ہنگامہ کیا اور خوب لکھا، اس میں سچائی کیا ہے؟

مشرف عالم ذوقی :- جی ہاں! مجھے ان رسائل نے سمجھا نہیں اور مجھ پر کئی طرح کے الزامات لگائے، مگر مجھے کبھی ان سے ڈر نہیں محسوس ہوا، افکار ملی میں تو مجھ پر ایک سال تک بحث ہوتی رہی، ایک میگزین ہے اردو بک ریویو، اس میں میں نے ایک بار کہا تھا کہ ''آپ مجھ پر وہ اسلامی کتابیں تھوپنا کیوں چاہتے ہیں جن کو میں پڑھنا نہیں چاہتا'' اس پر کافی ہنگامہ ہوا، اس پر میں نے کہا کہ ہاں! میں اسلامی کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں، لیکن میں دوزخ کا کھٹکا اور بہشتی زیور جیسی کتابیں نہیں پڑھنا چاہتا، کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ ان سے مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہ انہیں اور پیچھے لے کر جا رہی ہیں، جب ہمارے پاس مستند کتابیں موجود ہیں، جیسے میں مثنوی مولانا روم اور احیاء العلوم جیسی کتابوں کو پڑھتا ہوں تو میری آنکھیں کھلتی ہیں، تو پھر میں ان غیر مستند کتابوں کو کیوں پڑھوں؟

ہمارے یہاں بعض علما نے اسلام کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے حالانکہ اس کا دائرہ بہت

وسیع ہے، اس لیے بھی میں نے کہا تھا کہ ایسی اسلامی کتابوں کو آپ کیوں مجھ پر تھوپنا چاہتے ہیں جو میں نہیں پڑھنا چاہتا اور اردو بک ریویو میں زیادہ تر تبصرے ایسی ہی کتابوں پر ہوتے ہیں جنہیں میں پڑھنا نہیں چاہتا، میں نے کئی کتابوں کو پڑھنے کی کوششیں کیں لیکن میں پڑھ نہ سکا اور میں نے بند کر دیا، ایسی کتابیں اسلام کو بہت پیچھے لے جا رہی ہیں-

اب آپ دیکھیے فتویٰ آتا ہے کہ ''عورتیں الیکشن لڑ سکتی ہیں مگر برقعہ پہن کر-'' کیا برقعہ پہن کر بھی کوئی عورت الیکشن لڑ سکتی ہے؟ ہم اسلام کو کہاں لے کر جا رہے ہیں؟ دیوبند کی فتویٰ بازی نے اسلام کو مشکوک اور تنگ نظر بنا دیا ہے، دیوبند ایک فتویٰ دیتا ہے اور اس کو دوسرے علما رد کر دیتے ہیں، ایسے میں دنیا اور میڈیا کے سامنے اسلامی نظریات کا مذاق اڑایا جاتا ہے، حالانکہ اسلام کا کینوس بہت وسیع ہے، جہاں زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسئلے میں بھی رہنمائی کی گئی ہے-

سوال :- عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی مسلمان اقتصادی، سیاسی، سماجی، ادبی اور تعلیمی طور پر ترقی کر جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے مذہب کو چھوڑتا ہے، جب کہ دوسری قوموں کے افراد زندگی کے مختلف شعبوں میں جتنا آگے بڑھتے ہیں، اپنے مذہب کی طرف وہ زیادہ مائل ہوتے ہیں، آخر یہ فرق کیوں؟

مشرف عالم ذوقی :- دیکھیے! مجھے لگتا ہے کہ اس بات سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے، ہم نے یہاں مختلف لوگوں کو دیکھا ہے، یہاں تک کہ ترقی پسندوں کو بھی دیکھا، ایک خاص وقت آتا ہے جب وہ پنج وقتہ نمازی ہو جاتے ہیں مگر ہمارے یہاں زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے، ہم جس ماحول میں آنکھ کھولتے ہیں اور جی رہے ہوتے ہیں، وہاں آپ اسلام کو کسی پر زبردستی تھوپ نہیں سکتے - ہمارے یہاں موڈرن عورتیں کچھ بھی پہن کر باہر نکل جاتی ہیں، مگر اسلامی ممالک میں بالعموم ایسا نہیں ہے، ہندوستان کا ماحول مختلف ہے اس کو آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے! آزادی کے بعد جو فضا ہمارے یہاں تھی، اس فضا نے غیر محسوس طریقے سے مسلمانوں پر اپنا ایک دباؤ بنایا اور عام مسلمان جو مذہب سے بہت قریب نہیں ہیں انہیں ایک لچیلا (Flexable) اسلام کو اپنانے پر مجبور کیا اور اکثریتی طبقے

کے ساتھ تہذیبی ونسلی اختلاط نے اسے مزید فروغ دیا، اس لیے ترقی پسند مسلمان اور ہمارے ترقی پسند بچے اپنے مذہب کو سنجیدگی سے نہیں لیتے، مگر مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ایک دن لوٹ کر اپنے مذہب کی طرف آئیں گے کیونکہ وہ سچا ہے اور روحانی سکون کا ذریعہ بھی- اس تناظر میں میں یہاں ایک بات اور کہنا چاہوں گا، مجھے لگتا ہے کہ بابری مسجد اور گجرات کے سانحے کے بعد بہت تیزی سے مسلمانوں کا ہر طبقہ اپنے مذہب کی طرف لوٹ رہا ہے اور بچے بھی اپنے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں-

سوال:- ماہنامہ جام نور کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

مشرف عالم ذوقی:- مجھے بہت دنوں کے بعد ایک ایسا رسالہ 'جام نور' کی شکل میں نظر آیا جو مذہبی تعلیمات کو عصری پس منظر میں سمجھانے کا ہنر جانتا ہے، اس نے ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے ایسے ایسے مباحث اٹھائے ہیں جن کے بارے میں مذہبی رسائل وجرائد سوچ بھی نہیں سکتے تھے- یہ رسالہ مذہبی اور معاشرتی سطح پر ہندوستان میں ایک انقلاب بن کر آیا ہے اور ہم جیسے لوگوں کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، اگر یہ یونہی ذہن سازی کرتا رہا تو مذہبی صحافت کی تاریخ کا ایک نہ بھولنے والا باب ہوگا- □□□

(شمارہ نومبر ۲۰۰۵ء)

پروفیسر مظفر حنفی

سابق استاذ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر مظفر حسین حنفی اردو کے معروف شاعر اور ہندو پاک کے ممتاز غزل گو ہیں جنہیں اپنے لہجے کی انفرادیت کی وجہ سے جانا جاتا ہے، آپ نے غزل گوئی کی ابتداء ۱۹۵۳ء میں کی اور ہم عصر شعری رجحان کی تقلید میں نیم روایتی اور نیم ترقی پسندانہ غزلیں لکھنی شروع کیں- ۱۹۶۰ء سے جدید رجحان کی طرف مائل ہوئے اور نئے طرز وآہنگ میں اشعار کہنے شروع کیے- آپ ایک ممتاز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کئی منفرد کتابوں کے مصنف، مرتب، محقق، افسانہ نگار اور ماہر ادب اطفال کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں- پروفیسر مظفر حنفی یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو کھنڈوہ، ایم پی میں پیدا ہوئے اور ہائی اسکول تک وہیں تعلیم حاصل کی، ۱۹۶۰ء میں آپ بھوپال میں ملازم ہوئے اور ملازمت کے دوران ہی علی گڑھ سے بی اے اور بھوپال سے ایم اے، ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں- ۱۹۷۴ء میں جب این سی آر ٹی میں ملازمت ملی تو دہلی آ گئے اور پھر ۱۹۷۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں ریڈر کے عہدے پر فائز ہوئے- ۱۹۸۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے آپ کو پروفیسر آف اقبال چیئر کا عہدہ تفویض کیا گیا- اردو زبان وادب کے لیے آپ کی بیش قیمت خدمات کے اعتراف میں دنیائے اردو نے آپ کو مختلف انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا، جن میں مغربی بنگال اردو اکادمی کا کل ہند ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایوارڈ، مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا سراج میر خاں سحر صوبائی اعزاز اور لکھنؤ کا میر ایوارڈ شامل ہیں- اس کے علاوہ آپ کی ۲۵ رکتابوں کو انعامات سے نوازا جا چکا ہے- ۲۰۰۳ء میں آپ کی شعری خدمات کے اعتراف میں دہلی اردو اکادمی نے بھی ''ایوارڈ برائے اردو شاعری'' سے نوازا-

سوال:- آج عام طور پر موجودہ نسل اردو سے ناواقف ہے،اس کا ذمہ دار آپ کس کو مانتے ہیں اور ایسے میں جو کچھ بھی اردو کی ترویج واشاعت ہورہی ہے وہ کن طبقوں کی دین ہے؟

پروفیسر مظفر حنفی:-نورانی صاحب! اردو کے تیئں جو جمود اور بے حسی کا عام رویہ ہے اس کے لیے کسی ایک فرقہ یا کسی ایک ادارہ کو مطعون کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے، یہ ہمارے اردو داں معاشرے کی کوتاہیوں کا ثمرہ بھی ہے اور سیاسی حالات کا جو جبر ہے اس کا نتیجہ بھی ہے، ہم اردو اردو کے نعرے تو بہت لگاتے ہیں لیکن آج سے تقریباً چالیس سال پہلے اردو کے تیئں جو جذباتی وابستگی کی فضا تھی وہ موجودہ دور میں مجھے کم کم نظر آتی ہے، حکومت کا معاملہ تو بہر حال ہمیشہ سیاسی اصولوں پر چلتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب بزعم خود اردو کی دعویداری کا دم بھرنے والے لوگ بھی زیادہ تر سیاسی ہو گئے ہیں، اردو کی جسے ہم جنم بھومی یا اردو کا خاص علاقہ کہتے ہیں، میری مراد اتر پردیش ہے، غالباً ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ خراب صورت حال اسی کی ہے- ہوسکتا ہے میری اس بات سے بہت سے عمائدین ادب خفا ہوں لیکن یقین جانیے مجھے صد فیصد اس بات کا احساس ہے کہ اگر مدارس نے اتر پردیش میں اردو کو سہارا نہ دیا ہوتا تو غالباً وہاں سے بالکل ہی اردو کا جنازہ اٹھ گیا ہوتا ،اب بھی سسکتی صورت حال ہے لیکن بہر حال جو کچھ بھی اردو باقی رہ گئی ہے بالخصوص اتر پردیش میں وہ مدارس کی وجہ سے ہے، دوسرے علاقوں میں میں سمجھتا ہوں کہ صورت حال اتنی زیادہ خراب نہیں ہے جتنی ہمیں بتائی جاتی ہے، میں تو چونکہ تدریس سے وابستہ ہوں اس لیے کہیں سمینار اور مختلف اس نوعیت کی علمی تقاریب جہاں ہوتی ہیں ان میں بھی جاتا ہوں، تخلیق کار بھی ہوں اس لیے مشاعروں میں بھی مختلف جگہوں پر طلب کیا جاتا ہوں-تو اس وقت مہاراشٹر، کرناٹک، مغربی بنگال، بہار اور ان اضلاع میں جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دی گئی ہے، صورت حال بہتر ہے ویسی تو نہیں ہے جیسے کہ آزادی سے پیشتر اردو کو ہندوستانی زبانوں میں سرفہرست رکھا جاتا تھا لیکن بہر حال ان بیس پچیس برسوں کی جو

تاریک ترین فضا تھی اس کے مقابلے میں ماحول خاصہ روشن ہے، تدریسی سطح پر شعر وادب کی تخلیق کی جارہی ہے ،اور جو کچھ کمیاں ہیں حکومت کی بے حسی کے ساتھ ساتھ ہم اردو والوں کی بھی خام کاریاں ہیں، ہماری اردو کے بڑے بڑے ادباء اور شعرا دعوے کرتے ہیں ، باتیں کرتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو بہر حال وہ خود اردو نہیں پڑھانا چاہتے ہیں، معاشرے کے جتنے بھی اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہیں جن میں ہم اردو کے پروفیسرز اردو کے ٹیچرس ہیں ان میں اکا دکا لوگوں کو چھوڑ کر باقی ماندہ تمام لوگوں کے جو بچے ہیں وہ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے ہیں، ایسے انگلش میڈیم اسکول میں جہاں اردو بطور مضمون بھی نہیں پڑھائی جاتی ورنہ ایسے انگلش میڈیم اسکول موجود ہیں جہاں ایک مضمون کی حیثیت سے اردو پڑھائی جاتی ہے، وہاں ہم اپنے بچوں کو داخل نہیں کراتے تو ہم بھی برابر کے ذمہ دار ہیں، حکومت تو خیر ہے ہی-

سوال:- آج زبان وفن کی دنیا میں نو بہ نو انقلاب آرہے ہیں، ایسے میں آپ کی نظر میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

پروفیسر مظفر حنفی:-زبان تو کوئی بھی ہو، اصل میں وہ ناریل کے پیڑ کی طرح بالکل سیدھی نہیں اگتی-اس میں شاخیں برگ وبار کلیاں پھول پھل آتے رہتے ہیں-تو زبان کے بارآور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تخلیقی تجربات اور تخلیقی انکشافات بھی ہوتے رہیں گے-اس اعتبار سے تو صورت حال خاصی بہتر ہے بلکہ ضرورت سے زیادہ جو تجربات ہورہے ہیں اس طرف بھی ہمیں توجہ کرنی چاہیے کہ جو معتبر اور جن کی جڑیں مضبوط ہیں ایسی اصناف ادب میں کسی شاعر کا اپنی شناخت کو مستحکم کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے، ہزاروں لوگوں سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے اور پچیس تیس سال کے ریاض اور خون جگر صرف کرنے کے بعد کہیں نام وری حاصل ہوتی ہے لیکن چھوٹے چھوٹے سے اور معمولی بازاری قسم کے تجربات ہیں جیسے کہیں آزاد غزل کے نام سے تو کہیں ہائیکو کے نام سے تو کہیں ماہیے کے نام سے تو ایک دن میں کوئی بھی اردو میڈیم سے ہائی اسکول پڑھا ہو، بہت آسانی سے پچیس تیس ماہیے کہہ سکتا ہے-لیکن غزل جو بہت بدنام ہے اس میں اگر کوئی اچھا شعر نکالنا ہو تو اس میں عمریں

کھپ جاتی ہیں،ایک موقع پر میں نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب سے کہا کہ صاحب آپ اپنے پرچہ ''کہسار'' کے اشاعت کے لیے ہر تین مہینے میں چار پانچ اصناف سخن ایجاد کر لیتے ہیں- پچھلے کئی سال سے پچاس ساٹھ اصناف سخن ایجاد کر چکے ہیں اور کتنے ایجاد کرتے رہیں گے؟ تو اس حد تک تجربات بھی میرے خیال میں نامناسب ہیں لیکن اردو زبان کے زندہ ہونے کا ثبوت تو ہے ہی،اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ دوسری زبانیں اس سے متاثر ہو رہی ہیں- آج آپ غزل کے تعلق سے دیکھیے بنگالی گجراتی اور مراٹھی زبانوں میں غزلیں کہی جا رہی ہیں اور بھی بہت سی علاقائی زبانوں میں غزلیں کہی جا رہی ہیں جو اردو کی مقبولیت کی دلیل ہے اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہماری زبان کا اور ہمارے ادب کا مستقبل روشن ہے لیکن بہر حال ہمیں چوکنا رہنا چاہیے-

سوال:- اردو شاعری، فلمی گانے، قوالیاں، اردو مشاعرے بلا تفریق مذہب وملت عوام وخواص میں مقبول ہیں، پھر آخر ملکی سطح پر یہ زبان مدارس اور یونیورسٹیز کے شعبۂ اردو تک محدود کیوں ہو گئی ہے؟

پروفیسر مظفر حنفی:- نہیں میں آپ کے اس سوال سے اتفاق نہیں کرتا کہ زبان صرف مدارس اور یونیورسٹیز کے شعبہائے اردو تک محدود ہو کے رہ گئی ہے، آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے لکھنے اور پڑھنے والے لوگ کم ہو گئے ہیں لیکن جہاں تک زبان کے استعمال کا تعلق ہے Spoken Language ابھی تک یہی ہے، اور ہر جگہ بولی اور لکھی جاتی ہے- اردو بولنے والا اگر دہلی، مدراس، کشمیر، بنگال یا اڑیسہ جاتا ہے، میں خود بھی ان علاقوں میں جاتا رہتا ہوں، تو وہاں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوتی، مگر اڑیسہ یا ان جیسے دوسرے علاقوں کا رہنے والا جہاں اردو کا استعمال نہیں ہے وہ اگر دہلی آتا ہے تو اسے دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے- اس کا مطلب یہ ہے کہ بولنے والی زبان جو ہے وہ اب بھی برقرار ہے- اردو کو بولنے والے لوگ بہت ہیں البتہ اس کا پڑھنا اور اس کا لکھنا کم ہو گیا ہے اور خصوصاً جن ریاستوں کا میں نے ذکر کیا ان میں تو ایسی کوئی مشکل نہیں ہے اور یونیورسٹیز کے شعبہائے اردو میں اگر کوئی ایم اے اور بی اے کے مساوی اردو پڑھنا چاہتا ہے تو اس کا بندوبست بہر حال ہو جاتا ہے

مگر نچلی سطح پر اردو کی تعلیم کہیں شعوری طور پر اور کہیں غیر شعوری طور پر کم ہوتی جا رہی ہے اس سلسلے میں اردو والوں کو جد وجہد کرنی چاہیے -

سوال:- کہا جاتا ہے کہ ادیب وشاعر کی پوری زندگی عام طور پر فاقہ کشی، جفاکشی اور مصائب وآلام سے عبارت رہتی ہے، آپ اس کو کتنا سچ مانتے ہیں؟

پروفیسر مظفر حنفی:- موجودہ دور میں تو یہ قطعی سچ نہیں ہے، اس وقت تو عجیب صورت حال ہے- اردو کی حالت تو بہت ہی خراب ہے لیکن اردو میں شعر کہنے والے خصوصاً ایسے لوگ جو اسٹیج پر فارمینس کا ہنر جانتے ہیں خواہ وہ گلے بازی کے وسیلے سے یا ایکٹنگ کے وسیلے سے ہو چاہے وہ آواز کے دبنگ ہونے کی وجہ سے ہو ایسے لوگوں کو مشاعروں میں جتنے پیسے ملتے ہیں اتنے پیسے تو کسی تخلیق کار کو پوری کتاب لکھنے پر بھی نہیں ملتے - چند لوگ ایسے ہیں جن کو کچھ پبلشرز رائلٹی دیتے ہیں ورنہ عام طور پر تو ان سے پیسے لے کر کتاب چھاپتے ہیں- تو اس طرح سے تو اسے پوری کتاب سے جو کچھ یافت نہیں ہوتی اس سے کئی گنا زیادہ ایک ہی مشاعرہ سے ہو جاتی ہے- پانچ ستارہ ہوٹلوں میں وہ ٹھہرائے جاتے ہیں، کاریں ان کی خدمت میں لگی رہتی ہیں اور یہ سب وہ شعرا نہیں ہیں جو بہت ادبی منزلت پر فائز ہوں اور بہت بلند مرتبت ہوں بلکہ یہ درجہ سوم اور درجہ چہارم کے وہ شعرا ہیں جو تھوڑا سلیقے کے ساتھ اسٹیج پر اپنے کلام کو پیش کرنا جانتے ہیں اور مائک کو استعمال کر کے عوام تک پہنچتے ہیں، بہر حال ان کی بھی اپنی اہمیت ہے، انہوں نے اردو کو ہندوستانی پیمانے پر مقبول بنانے میں بڑا رول ادا کیا ہے، لیکن ہمارے بچپن کا حال تو یہ تھا کہ اگر معاشرے میں یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ شخص شاعر ہے تو اس کو لڑکی بھی مشکل سے دیتے تھے کہ یہ اس کی کفالت کیسے کرے گا؟ یہ تو اپنی شعر وشاعری میں ہی مست رہے گا، مگر اب صورت حال بہت بدل گئی ہے-

سوال:- آپ کو ماہر ادب اطفال کے طور پر بھی جانا جاتا ہے، اس حیثیت سے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بچوں میں اردو زبان کے تئیں دلچسپی کس طرح پیدا کی جائے؟

پروفیسر مظفر حنفی:- مجھے خوشی ہوئی کہ آپ میرے اس پہلو سے بھی واقف ہیں ورنہ عام طور پر لوگ کم ہی جانتے ہیں کہ میں بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھتا رہتا ہوں، میری

ابتدا ہی بچوں کے ادب سے ہوئی، آپ یقین کیجئے کہ میں چھٹی یا ساتویں میں تھا اس وقت سے میں بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں وغیرہ لکھ رہا ہوں، اس کے بعد بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا پھر تنقید اور پھر دوسرے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی- بچوں کے سلسلے میں چونکہ میں بچپن ہی سے دلچسپی رکھتا ہوں اس لیے میرا نظریہ یہ ہے کہ بچوں کو ہم گھر میں جتنی تلقین اور جتنی نصیحتیں اور پند کرتے اور سکھاتے رہتے ہیں کہ یہ اچھا ہے اور یہ برا ہے وغیرہ وغیرہ، اسکول میں بھی وہی صورت حال ہے اس کے علاوہ ساری نصابی کتابوں میں جتنا میٹر اور جتنا مواد دیا جا رہا ہے سب اسی پر ہے اگر ہم ادب اطفال کو سیدھے سیدھے پند و نصائح کے لیے براہ راست استعمال کرنا شروع کریں گے تو بچوں کی دلچسپی اس سے ہٹ جائے گی، ہمیں نصیحت اور اخلاقی باتیں ضرور کرنا چاہیے لیکن اتنا پس پردہ رہ کر کرنا چاہیے کہ بچہ اس نظم کو اور اس کہانی کو اپنے طور پر دلچسپی کے ساتھ پڑھے اور پڑھنے کے بعد غیر محسوس طریقے پر وہ کچھ نصیحت اختیار کرے لیکن براہ راست نہیں کہ سچ بولنا اچھا ہے، بچو صبح اٹھو، اور سلام کرو اور دانت مانجو اور یہ کرو وہ کرو تو وہ بچہ اس نظم کو دلچسپی کے ساتھ پڑھے گا ہی نہیں تو پھر وہ اس پر اثر انداز کس طرح ہوگی؟ تو ادب اطفال کو بچوں کے لیے دلچسپ بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے، کلیۃً اسے پند و نصائح کے لیے مختص کر لینا میرے خیال میں ادب اطفال کی جو بنیادی حیثیت ہے اس کو کم کرنے کے مترادف ہے-

سوال: -اردو کی اشاعت اور اس کے فروغ میں آپ مذہبی صحافت و ادب کا کتنا حصہ مانتے ہیں؟

پروفیسر مظفر حنفی: -بہت زیادہ، آپ کے علم میں شاید ہے یا نہیں میں آپ کو بتاؤں کہ میں اصل میں ۱۹۷۶ء سے نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لیے ہر سال جتنے بھی ہندوستان میں کتابیں نکلتی ہیں ان کا تعارف نامہ تیار کرتا ہوں، جس کی ایک جلد چار پانچ سو صفحات پر مشتمل ہوتی ہے، اس طرح ۲۲ جلدیں میں نے تیار کی ہیں- تو کم و بیش ہندوستان میں چھپنے والی تمام کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے واجبی واجبی معلومات ہے- اس کتابیات کو تیار کرتے ہوئے مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ عام طور پر اردو میں جو ہم

لوگ یہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ اردو کتابوں کا ایڈیشن بہت مختصر ہوتا ہے اور اس کی اشاعت بہت محدود ہوتی ہے اور وہ بکتی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ اس میں استثنائی صورت یہ ہے کہ مذہبی کتابیں اردو میں سب سے زیادہ بکتی ہیں اور تقریباً ایک ایک کتاب کے پانچ پانچ چھ چھ ایڈیشن سال میں نکلتے ہیں تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مذہبی ادب نے بہر حال اردو زبان کو مضبوط اور توانائی بخشنے میں بڑا بنیادی رول ادا کیا ہے جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا کہ مدارس اگر نہ ہوتے تو یو پی سے اردو زبان کا جنازہ نکال دیا گیا ہوتا، تو مذہبی صحافت و ادب نے اردو کی نشر و اشاعت میں جو مستحکم اور قابل تحسین رول ادا کیا ہے اس کا بڑے پیمانے پر اعتراف کیا جانا چاہیے، اکثر میں سیمناروں میں اس کا اعتراف کرتا رہتا ہوں-

سوال: -اردو کے شعرا نے صنف نعت کو وہ حیثیت نہیں دی جو دوسری اصناف سخن مثلاً غزل، گیت اور نظم وغیرہ کو وہ دیتے ہیں، آخر کیوں؟

پروفیسر مظفر حنفی: -یہ اردو شعرا اور ادبا کی کوتاہی ہے، مگر اب حالات بدل رہے ہیں، نعت کی خوبیوں اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے پاکستان سے سید صبیح رحمانی ''نعت رنگ'' کے نام سے ایک نہایت موقر جریدہ نکال رہے ہیں، نعت کو صنف ادب کی حیثیت سے اجاگر کرنے کے لیے جو مقالے یونیورسٹیز میں لکھے گئے ہیں ان میں سے آٹھ یا دس تو میری نگاہ سے بھی گزرے ہیں، بہت سے شعرا جنہوں نے نعتیں بھی لکھی ہیں جب ان پر کام ہوتا ہے تو ان کے نعتیہ کلام کے متعلق ایک باب مختص کر دیا جاتا ہے، لیکن بہر حال جو حیثیت اسے ملنی چاہیے تھی وہ بایں ہمہ نہیں ملی -پاکستانی رسالوں میں تو غالباً ضیاء الحق کے بعد اسے خاصہ ترقی ملی، وہاں چاہے کتنا ہی مارکسی قسم کا ذہن رکھنے والا ہی نقاد کیوں نہ ہو مثلاً ''نقوش''، ''فنون'' اور ''افکار'' یہ ترقی پسندوں کے رسالے تھے لیکن ان میں ابتدائی صفحات پر حمد اور نعت کی اشاعت کا سلسلہ بڑی تیزی سے جاری ہوا، ضیاء الحق کا زمانہ تو نہ معلوم کب کا گزر چکا لیکن تا حال وہ جاری ہے اور ہندوستان میں بھی اب اس کا چلن عام ہو گیا ہے-

سوال: -اردو و نعت گو شعرا کو غزل، گیت اور نظم گو شعرا کی طرح کبھی بھی اردو ادب میں اہمیت نہیں دی گئی جب کہ ان کے کلام فنی، لسانی اور عروضی نقطۂ نظر سے اپنی نظیر آپ

ہیں، یہ تعصب کیوں؟

پروفیسر مظفر حنفی: - ماضی کی حد تک آپ کا شکوہ صحیح ہے مگر اب صورت حال ایسی نہیں ہے، کیونکہ پہلے جتنی بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا جارہا تھا اس کے مقابلے میں اب صورت حال بہتر ہے، اب اکثر رسائل میں ان کے بارے میں لکھا جارہا ہے، اب لگتا ہے کہ اس طرف ہم قدم بڑھا رہے ہیں جب نعت گو شعرا کو ان کا صحیح اور اصل مقام عطا کیا جاسکے گا، لیکن اس بات کو بھی ملحوظ رکھیں کہ خالصتۂ نعت گو شعرا کی تعداد ہمارے یہاں بہت کم ہے جنھوں نے اچھی نعتیں کہی ہیں- اوراب جو بات میں کہنے جارہا ہوں ممکن ہے آپ کو ناگوار بھی گزرے، ایک زمانہ تھا جب ہمارے یہاں یہ کہا جاتا تھا کہ ''بگڑا شاعر'' مرثیہ گو یعنی اگر شاعر کو سماج میں مرتبہ حاصل نہیں ہورہا ہے اور ناقدین اس کی طرف متوجہ نہیں ہورہے ہیں، اس کی واہ واہی کم ہورہی ہے تو وہ مرثیہ کہنا شروع کردیتا تھا، کیونکہ ہمیں امام حسین سے عقیدت ہے اس لیے اس میں فنی خامیاں ہوں گی تب بھی ہم واہ واہ کریں گے، معاف کیجیے نعت گو شعرا میں بیشتر لوگوں کا بھی یہی حال ہے، جب وہ حضور اکرم کے رخسار کی تعریف شروع کرتے ہیں، جب وہ ان کے گیسوؤں کے سلسلے میں باتیں کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنی دنیاوی محبوبہ کے سلسلے کی بات کررہے ہوں- نعت کہتے کہتے وہ مقام رسالت کی حدیں مقام الوہیت سے ملادیتے ہیں، تو صرف نعتیں لکھنے سے کوئی شاعر نہیں ہوسکتا- اسی طرح ان شعرا کا مرتبہ بھی صرف اس لیے بلند نہیں ہوجائے گا کہ وہ نعت کہہ رہے ہیں- تاوقتیکہ انھوں نے اس پایہ کی نعت نہ کہی ہو جس پایہ کی نعتیں حضرت آسی غازی پوری نے کہی ہیں- جیسے محسن کاکوروی ہیں جنھوں نے کیسی اچھی نعتیں کہی ہیں ان کا اپنے ہم عصر شعرا میں جو مرتبہ ہے وہ کسی کو نہیں ملا- اس لیے آج بھی میں کہتا ہوں کہ ہندوستان میں جتنے بھی قصیدہ کہنے والے شعرا گزرے ہیں ان میں سب سے اچھا قصیدہ محسن کاکوروی کا ہے- حالانکہ انہوں نے بہت کم قصیدہ کہے ہیں، یا منیر شکوہ آبادی یا امیر مینائی جیسے شعرا ہیں ان لوگوں کا مرتبہ تو تسلیم کیا گیا ہے- لیکن ہر نعت کہنے والے کو صرف اس لیے کہ وہ نعتیں کہہ رہا ہے اسے بلند پایہ شاعر تصور کرلیا جائے، ایسا نہیں ہوسکتا-

سوال: -اس لیے میں نے ان شعرا کی بات کی ہے جن کا فنی، لسانی اور عروضی نقطۂ نظر سے اپنا ایک مقام ہے؟

پروفیسر مظفر حنفی: - کچھ نام ایسے آپ کے ذہن میں ہیں جن کا مرتبہ فنی لحاظ سے بلند تھا؟

خوشتر نورانی: - جی ہاں! حضرت آسی غازی پوری، مولانا کافی مرادآبادی اور مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی وغیرہ-

پروفیسر مظفر حنفی: - ہاں مجھے معلوم ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کی نعتیہ شاعری پر چھ سات پی ایچ ڈی ہوچکی ہے اور ان کو تا حال بہترین نعت گو میں سے ایک نعت گو تسلیم کیا جاتا ہے، بلکہ وہ نعتیہ شاعری میں تو سرفہرست ہیں- اگر کوئی نقادان کے بہترین نعت گو ہونے سے انکار کرتا ہے تو وہ بالغ نظر نقاد ہے ہی نہیں اور نہ ہی اس کی نگاہ ہمارے نعتیہ ادب کی ارتقا پر ہے-

سوال: -لیکن ادب سے جو لوگ جڑے ہوئے ہیں وہ اس حقیقت سے بھلے ہی انکار کریں مگر یہ سچ ہے کہ وہ نعت گو شعرا کی پذیرائی نہیں کرتے اور نہ ہی ان کو کسی قطار وشمار میں لاتے ہیں؟

پروفیسر مظفر حنفی: - ہاں آپ نے یہ صحیح فرمایا ہے- اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں اردو میں جو تحریکات چلی آرہی ہیں، جیسے ان میں حالی کے زمانے سے ایک اصلاحی تحریک چلی، تو اس دور کے شعرا نے ایک خاص نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالنی شروع کی جس میں نعت آتی ہی نہیں تھی کہ اصلاح معاشرہ کے لیے نعت بھی کارآمد ہوسکتی ہے، پھر ترقی پسند تحریک چلی اس نے اشترا کی نظریات کو فروغ دیا، پھر جدیدیت کی تحریک چلی وہ اپنا اہمال اور ابہام کے درمیان بہت نازک سفر کرتے ہوئے آگے بڑھی، اس کی خوبیاں بھی ہیں لیکن اس کی خامیاں بھی ہیں، تو ان تحریکات میں نعت کی گنجائش ہی نہیں تھی، لیکن ایسا نہیں ہے کہ نعت کے سلسلے میں کام نہ ہورہا ہو یا نعت کے سلسلے میں نقادوں کی توجہ نہ ہو-

سوال: - ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کوئی پیغام دینا پسند

کریں گے ؟

پروفیسر مظفر حنفی: -خوشتر نورانی صاحب! اصل میں میں انتہائی بے توفیقہ آدمی ہوں، کیا عرض کروں؟ پیغام تو بڑے لوگ دیتے ہیں میں تو صرف آپ کی نسل اور اپنے چھوٹے بھائی اور بچوں سے گزارش کرسکتا ہوں کہ اردو کے تئیں انہیں وہ جذباتی فضا تیار کرنی چاہیے جو آج سے پچاس پچپن برس پہلے تھی- اردو مادری زبان ہونے کی حیثیت سے ویسے ہی محبت کی حق دار ہے جیسے ماں سے ہوتی ہے، ماں کے جلد پر ہم ایک خراش نہیں دیکھ سکتے تو مادری زبان کے اوپر جب آنچ آرہی ہو ہمارے دل میں وہی تڑپ ہونی چاہیے جیسے کہ ماں کے اوپر آنچ آگئی ہو- وہ جذبہ مجھے بہت مدھم ہوتا ہوا نظر آرہا ہے، اگر یہ تیز ہوگیا تو اردو زبان کا مستقبل کبھی تاریک نہیں ہوسکتا- اگر ہم اسکول میں اردو نہیں پڑھ سکتے تو ہم گھر پہ دوسری زبانیں با آسانی پڑھ سکتے ہیں تو اردو کیوں نہیں پڑھ سکتے؟ ہم دنیا بھر کی دوسری عیاشی کر سکتے ہیں تو کیا ایک اردو کتاب یا ایک رسالہ مہینے میں خرید نہیں سکتے؟ ☐☐☐

(شمارہ دسمبر ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

استاد: شعبۂ اردو بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور، بہار

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اردو دنیا میں ایک کثیر نویس قلم کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، پروفیسر فردوس خاں رومی کی مرتب کردہ 'مناظر عاشق ہرگانوی: شخصیت' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے جس میں ہرگانوی صاحب کو جہاں سیماب صفت شخصیت، ہمہ پہلوئی شخصیت، نابغہ، ایک سمندر اور ہر صنف کا خالق کہا گیا ہے، وہیں ان کو ایک معمہ، ادب کا جنگل، ایک ادبی دیوزاد، دس مکھی لڑاکو، دیو قامت ہمزاد اور اردو ادب کا بھوت بھی کہا گیا ہے- موصوف یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو چترا ضلع ہزاری باغ جھارکھنڈ میں پیدا ہوئے، بھاگل پور یونیورسٹی سے بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا، ۱۹۶۳ء سے ہی آپ کی نثری اور شعری تخلیقات مختلف اخبارات ورسائل میں چھپنے لگی تھیں، اب تک تقریباً سو کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جبکہ مناظر صاحب اپنی زندگی میں مطبوعہ کتابوں کی تعداد دوسو تک پہنچانے کی آرزو رکھتے ہیں- بھاگلپور فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہوکر لکھی جانے والی ان کی ۶۴ر نظمیں اور ۲۴ر مضامین اور ۶ر دسمبر کے سانحہ کے بعد کا ان کا افسانہ 'کالا اتوار' شاہکار ہیں، جن کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے- ۱۹۶۷ء سے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہیں، اس کے علاوہ سری نگر اور پٹنہ دوردرشن سے بھی وابستگی رہی، ''بلٹز''، بمبئی کے نمائندہ بھی رہ چکے ہیں، جب کہ ان کا خالص ادبی صحافتی سفر 'کوہسار' بھاگل پور، 'توازن' مالیگاؤں اور 'گلبن' احمد آباد کے پلیٹ فارم سے ہوا اور ہنوز جاری ہے- اپنی قلمی خدمات کے اعزاز میں اب تک درجنوں ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں جن میں 'مین آف دی ایئر' یو ایس اے، 'الطاف حسین حالی' لندن، 'بیسویں شتابدی رتن سمان' پانی پت اور 'راشٹریہ شکھر ساہتیہ پرسکار' دہلی بطور خاص قابل ذکر ہیں-

سوال :-اردو کے ایک کثیر التصانیف قلم کار ہونے کے سبب ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں، سب سے پہلے تو آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ناقدین ادب نے آپ کے ساتھ کتنا انصاف کیا ہے؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:- ناقدین ادب کا میں شکر گزار ہوں کہ میری تحریروں پر تقریباً چار سو مضامین انہوں نے لکھے ہیں جو الگ الگ موضوعات کو احاطہ کرتے ہیں، چھوٹے بڑے، معروف وغیر معروف، پرانی نسل اور نئی نسل کے ناقدین ادب نے مجھے سرشار کیا ہے اور لکھتے رہنے کی تحریک دلائی ہے، نظام صدیقی جیسے مستند ناقد نے مجھ پر تنقیدی کتاب لکھی ہے، پروفیسر عبدالمنان طرزی نے مجھ پر منظوم تنقیدی کتاب لکھ کر ایک روایت کی بنیاد ڈالی ہے، ڈاکٹر نوشاد عالم آزاد کی تنقیدی کتاب میرے چھ پہلو کو احاطہ کرتی ہے، منزل لوہاٹیری نے میری سو کتابوں پر منظوم تبصرہ صنف سخن ''تلخیاں'' میں کیا ہے، مضامین کے علاوہ مجھ پر آٹھ کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور کئی رسائل نے نمبر اور گوشہ شائع کیا ہے-

سوال :-کیا آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ اردو تنقید آج فکر وضمیر کی آزادی کی بجائے مطلب پرستی اور زر اندوزی کی بیساکھی کے سہارے چل رہی ہے؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:-کسی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے، کیونکہ بعض شاعر اور افسانہ نگار زر کے سہارے مضامین لکھواتے رہے ہیں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ضیافت کا سامان مہیا کراتے رہے ہیں، اسے مطلب پرستی کا نام بھی دے سکتے ہیں، لیکن اردو تنقید کا نوے فیصد سرمایہ فکر وضمیر سے وابستہ ہے، البتہ تحریک اور رجحان کے تحت نظریہ اور شخصیت کو سامنے رکھ کر جس طرح حاجی بگویم کی جاتی رہی ہے اس کی مثال بھی سامنے ہے، ایسا ہر دور میں ہوتا رہا ہے کہ اپنے گروپ کے تخلیق کاروں کو نمایاں کیا گیا ہے، اب یہ دوسری بات ہے کہ ادب میں وہ تخلیق کار اور وہ ناقد زندہ ہیں یا نہیں یا کیا مقام رکھتے ہیں؟

سوال :-آپ ایک زود نویس اور کثیر نویس قلم کار ہیں، لیکن کیا اپنی سرعت قلم کے باوجود آپ متانت، سنجیدگی، تفکر اور تحقیق کا حق ادا کر رہے ہیں؟ جو کسی بھی قابل قدر تحقیق کا

لازمہ سمجھی جاتی ہیں-

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:-میں زود نویس یا کثیر نویس نہیں ہوں، بس خدا کا کرم ہے جس نے لکھنے کی صلاحیت بخشی ہے اور میں قوت رسا سے کام لے کر خامہ فرسائی کرتا رہتا ہوں، متانت، سنجیدگی اور سوچ کے بغیر کوئی سی تخلیق کیونکر وجود میں آسکتی ہے؟ زندگی کے ہزار پہلو ہیں اور زندگی کی بوقلمونی اور رنگارنگی کی طرح ادب کے سراپا میں بے شمار رنگوں کی ملاوٹ اور آمیزش ہے، ہماری بے ترتیب اور بکھری ہوئی زندگی کی تنظیم و تجسیم کرنے، اسے نکھارنے اور سنوارنے میں ادب کو جو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس کی محرک فکر اور متانت ہی ہے، مجھے لگتا ہے کہ پندرہ سولہ گھنٹہ ضرور ادب سوچتا رہتا ہوں، اسی لیے الگ الگ جہتوں پر لکھتے وقت تخلیق کے ساتھ حق ادا کرنے میں کامیاب رہتا ہوں-

سوال :-آپ کی تصنیفات کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے شاید مذھبیات پر خامہ فرسائی کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، لیکن اس کے علاوہ آپ کا مذہب سے کتنا تعلق رہا ہے؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:-میں مذہبی آدمی ہوں اور سو فیصد مذہب کے دائرے میں خود کو پاتا ہوں، میرا گھرانہ مذہبی رہا ہے، بچپن میں ہی جب ازار بند باندھنا نہیں آتا تھا مجھے قرآن اور حدیث کی تعلیم دی گئی تھی، تین پارہ حفظ بھی کرایا گیا تھا، تب بعض مذہبی رسائل پڑھنے کی تلقین کی جاتی تھی ''مولوی'' اور ''تجلی'' جیسے مذہبی رسائل اسکول کے زمانے میں باقاعدگی سے پڑھتا تھا، آج بھی نصف درجن مذہبی رسائل ہر ماہ پڑھنے کے لیے وقت نکالتا ہوں، ہاں مذہبیات پر میں نے بہت کم لکھا ہے-'' مولوی'' اور'' دین دنیا'' میں مضامین چھپے ہیں اور'' جام نور'' میں بھی شائع ہو چکا ہوں- کئی رسائل کے'' نعت نمبر'' کے لیے الگ الگ پہلو سے مضامین لکھے ہیں، لغت کی درجنوں کتاب پر تبصرے کیے ہیں، ذہنی بصیرتیں جوں جوں زمان و مکان کو توڑتی ہیں فکر وادراک میں وسعت آتی ہے جس کی حد مذہب کی پناہ گاہ ہے، میں نے زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھا کر شاعری یا افسانہ کے ذریعہ سچائی، حسن اور خیر کی دعوت دی ہے-

سوال:-ترقی پسند ادب کی مذہب بیزاری کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں، کیا آپ نے کبھی اس پر مذہب بیزار ادیبوں کا محاسبہ کرنے کی کوشش کی؟ یا آپ بھی ان کے خیال سے اتفاق رکھتے ہیں؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:-میں شخصیت اور تخلیق کو الگ الگ زاویے سے دیکھتا ہوں، بعض شخصیتیں بری ہوسکتی ہیں، ان کے افعال ناپسندیدہ ہوسکتے ہیں، لیکن ان کی تخلیق اعلیٰ پایہ کی ہوسکتی ہے، شاہکار کا درجہ رکھ سکتی ہے، ترقی پسند ادیبوں کی مذہب بیزاری پر ان کے نظریے کا اثر رہا ہے، ذرا پیچھے کی طرف لوٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ الطاف حسین حالی کی قائم کی ہوئی ادب اور اخلاق کی وابستگی دم توڑ رہی تھی، Johan Ruskin کا بھی اثر ہوسکتا ہے، ابیقورس (Epicurus) کے فلسفۂ لذت کو بڑھا گیا اور اس میں نئے مطالب ڈھونڈے گئے کیونکہ ذہن اس طرف رجوع ہو چکا تھا کہ کسب لذت ہی مقصد آفرینش ہے اور یہی ہر ذی حیات و ذی روح مخلوق کی زندگی کا نصب العین ہے، ادب کو Oscarwilde نے زندگی سے الگ ایک جداگانہ حیثیت بخشی، تھکے ہوئے دماغ کسی ساحر الموط کی تلاش میں تھے لہٰذا اس نظریے کو مقبولیت حاصل ہوئی، اس کی کہانی The rose and the night ingale سے ہر کوئی واقف ہے، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری نے ادب کے جمالیاتی دور کی نمائندگی کی، یہ اثرات ترقی پسندوں پر بھی پڑے، یہی وجہ ہے کہ ان پر عریاں نگاری کا الزام لگا، حالانکہ ترقی پسند ادب میں سیاسی پیچیدگیوں، معاشی دشواریوں، اقتصادی مصائب، معاشرتی جکڑ بندی اور تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری جیسے مسائل کا اثر نمایاں ہے، یہی وجہ ہے کہ ادب کو نئی دھڑکنیں ملیں، کارل مارکس کا معاشی نظریہ ۱۹۲۶ء سے ہی اثر انداز ہونے لگا تھا، ۱۹۲۹ء میں جب جواہر لال صدر کانگریس ہوئے تو یہ خیالات سرعت سے پھیلنے لگے، یہاں بتانا چاہتا ہوں کہ بعض ادیبوں کے نزدیک اشتمالیت دنیا کی مصیبتوں کا واحد حل ہوسکتی ہے لیکن ادب کی سب سے بڑی شرط یہی ہے کہ انسانی محسوسات کے تاروں کو چھیڑ سکے نہ کہ پرولتاریہ انقلاب میں مفید ہو، عقائد پرستانہ عصبیت کی وجہ سے ترقی پسند ادیبوں کا محاسبہ کیا گیا اور الزام عائد کیے گئے، حالانکہ پانچ دس پرسنٹ

کو چھوڑ کر مذہب کی روح سے وہ کبھی بیگانہ نہیں رہے، البتہ زمانے کی قناعت پسند ہوا میں بہہ کر عمل پیرا نہیں ہوسکے-محاسبہ کے بعد میں نے یہی سمجھا ہے-

سوال:-آپ نے اردو ادب کے مختلف ادوار دیکھے ہیں، مابعد جدیدیت کے اس دور میں اردو کو کس منزل پر پاتے ہیں؟ اپنی ساخت و ہیئت اور مقصدیت کے لحاظ آج اردو کس مقام پر ہے؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:-اردو ایک ہمہ گیر زبان ہے، اپنے الفاظ، قواعد، ساخت و ہیئت اور مقصدیت کے اعتبار سے ایک مخلوط، عام اور مشترک زبان ہے اور اس نے ہر خرمن سے خوشہ چینی کی ہے، اپنی سرزمین میں اردو نے بہت درد جھیلا ہے اور تعصب کی آندھیوں کا یہ مقابلہ کرتی رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنا مسکن دنیا کی نئی بستیوں میں بنانے پر یہ مجبور ہوئی اور آج اکیسویں صدی اور مابعد جدیدیت کے دور میں اردو زبان دور تک بولی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے، کمپیوٹر اور سیٹلائٹ سے جڑ چکی ہے اور ٹی وی کے لیے اردو چینل تک آچکا ہے، ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی ہر لسانی سسٹم میں کچھ نہ کچھ معاشرتی اور ثقافتی صفات ہوتی ہیں کیونکہ اس میں ساری نشانیات پوشیدہ ہوتی ہیں، اردو کی بھی اپنی نشانیات ہیں، اپنا لہجہ اور تلفظ ہے، اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنی روایت، اپنا تمدن اور اپنی انفرادیت کا تحفظ یقینی طور پر ہے، ہمیں یہ علم ہے کہ آج اکیسویں صدی میں دنیا میں لاطینی رسم الخط کے بعد اردو رسم الخط سب سے زیادہ مستعمل ہے، اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے اعداد وشمار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں چینی اور انگریزی کے بعد تیسری بڑی زبان اردو ہے، اردو کے ساتھ اہم بات ہے کہ یہ کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک کی زبان نہیں ہے، بلکہ یہ عالمی برادری کی زبان ہے، دراصل اردو کا جنم کئی زبانوں کے اتفاقی اختلاط سے ہوا ہے، اس لیے ان زبانوں کے حروف ابجد بھی اس میں آگئے ہیں، اس وقت اردو زبان میں سب سے زیادہ آوازوں اور حروف کا نظام مستعمل ہے، لیکن ان سب کے باوجود اردو کی تیسری بستی برطانیہ کی نئی نسل اردو زبان سے دور ہوتی جارہی ہے، ان کے لیے اردو رسم الخط پسندیدہ نہیں ہے، رومن میں اردو پڑھنا ان کے لیے زیادہ آسان ہے، اعراب کی دقتیں بھی

ہیں، ہاں! اردو کی تفریحی قدر و قیمت ضرور ہے، سقوط سوویت یونین کے بعد اب وہاں اردو ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، بنگلہ دیش میں اردو کا چلن ختم ہوتا جارہا ہے، ۲۰۰۵ء میں راج شاہی یونیورسٹی کی اردو آنرز کی کاپی کے جوابات بنگلہ زبان میں لکھے گئے ہیں، ویسے آج اکیسویں صدی اور مابعد جدیدیت کے دور میں ۴۵ رممالک میں اردو پڑھی پڑھائی جاتی ہے اور ۳۲ رممالک سے اردو میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔

سوال :- آپ اردو ادب کی مختلف تحریکوں میں سب سے بہتر کسے مانتے ہیں اور کیوں؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:- ترقی پسند تحریک میرے خیال میں سب سے بہتر تھی، کیونکہ اس نے زندگی کے نئے زاویے پیش کیے ہیں اور معاشرت کے نئے پہلوؤں کی عکاسی کی ہے، طبقاتی کشمکش کو اس تحریک نے پیش نظر رکھا ہے اور معاشرتی و معاشی پیچیدگیاں تخلیق میں گھل مل کر وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہوئی ہیں، چمنستان ادب میں گلہائے رنگ یہ تحریک رہی ہے۔

سوال :- انور شیخ علامہ اقبال کی شاہین صفت شخصیت پر منفی پہلو تلاش کرنے والے تنہا ناقد ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ نے ''انور شیخ بحیثیت شاعر'' ''علامہ اقبال منفی پہلو'' اور ''انور شیخ مطالعہ در مطالعہ'' جیسی کتابیں لکھ کر کہیں آپ نے انور شیخ کی ہمنوائی کی کوشش تو نہیں کی ہے؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:- انور شیخ کا رسالہ ''لبرٹی'' جب میرے پاس آنے لگا تو ان کی تحریر کی کاٹ نے مجھے متوجہ کیا، پھر بحیثیت شاعر اور افسانہ نگار ان کے تین مجموعے میرے مطالعہ میں آئے، میں نے اخلاقاً اپنی رائے انہیں لکھ بھیجی، تب ان کا فون آیا پھر ہر دوسرے تیسرے روز فون پر گھنٹہ آدھ گھنٹہ باتیں ہونے لگیں، ساری باتیں ادب کے حوالے سے ہوتی تھیں، اقبال کو وہ بڑا شاعر مانتے ہیں لیکن اقبال کی شخصیت اور عملی زندگی کے وہ منکر ہیں، انہیں اس سے بھی اختلاف ہے کہ اقبال کو شاعر اسلام کیوں کہا جاتا ہے، ان ہی دنوں انہوں نے دو ایک اصناف سخن ایجاد کی، اس طرح میری قربت بڑھی، تبھی کسی کا مضمون

پڑھا کہ انور شیخ شاتم رسول ہیں، میں نے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ کبھی وہ دہریہ تھے اور حضور ﷺ کے خلاف بھی دو ایک مضامین انگریزی میں لکھے تھے، جنہیں آج ناگپور اور بمبئی کے بعض گمنام ناشر چھاپ کر انہیں بدنام کر رہے ہیں، پھر بھی میں انہیں برین واش کرتا رہا کہ اسلام سے بہتر کوئی دوسرا مذہب نہیں ہے، اتفاق سے ۲۰۰۰ء میں سیمینار اور مشاعرہ میں شرکت کے لیے مجھے لندن جانا ہوا، چودہ ممالک کے قلم کاروں نے اس میں شرکت کی تھی، انور شیخ اپنی علالت کی وجہ سے سیمینار میں شریک نہیں ہوسکے تھے۔ دو دن تک لندن سے فون پر باتیں ہوتی رہیں، وہ مجھے اپنے گھر کارڈف بلاتے رہے لیکن میں لندن اور لیوٹن سے آگے نہیں گیا، ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ مذہب اسلام، علامہ اقبال اور قادیانیت پر گفتگو کرنی ہے، اس لیے وہی لندن تشریف لائیں، اگلے دو ایک دن میں ان کی طبیعت سنبھلی تو وہ لندن آگئے اور آکسفورڈ روڈ کے پانچ ستارہ ہوٹل میں ٹھہرے، میرے لیے بھی کمرہ بک کرایا، وہاں ہمارے بیچ دیگر موضوع کے ساتھ اقبال پر جم کر باتیں ہوئیں، یہ گفتگو بعد میں برطانیہ سے ہی کتاب کی شکل میں شائع ہوئی۔ ان کی فکر اور نظریے میں میں دخیل نہیں ہوں، البتہ اختلاف کرتا رہا ہوں، وہ غیر عقلی اور تشدد آلود اعتقادات کے شدید مخالف ہیں، لیکن ان میں تنقیدی قوتیں بہت توانا ہیں، ایسا ذی فہم اگر دوست بننا چاہے تو کیا حرج ہے؟ لندن میں ملاقات کے اگلے دن ڈنمارک کے ترغیب بلند بھی ان سے ملنے آگئے، ان کی موجودگی میں انور شیخ نے اعتراف کیا کہ وہ پکے مسلمان ہیں۔ وطن لوٹنے کے بعد میں نے ان سے فون پر کہا کہ مشرف بہ اسلام ہونے کا اعتراف وہ تحریری طور پر کریں تاکہ میرے احباب کی غلط فہمی دور ہو اور انہوں نے ایسا ہی کیا، اپنے لیٹر پیڈ پر مسلمان ہونے کا اقرار کیا اور اس کا بھی اعتراف کی کہ دوسرے مذاہب سے اسلام کی طرف لانے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا بہت بڑا ہاتھ ہے، میں اسے بخشش کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

سوال :- کہا جاتا ہے کہ آپ عالمی ادب میں اردو کو کوئی مقام نہیں دیتے ہیں، لیکن یہ مانتے ہیں کہ عالمی سطح پر اردو کا مستقبل تابندہ ہے، کیا آپ اپنے اس دوہرے نظریے کی وضاحت کریں گے؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:- اردو ادب میں لفظ اور خیال کے حسن کو فوقیت حاصل ہے اور ادب کے صحت مند نئے دھارے بھی اس میں ہیں، لیکن عالمی ادب کے مقابلے میں اردو ادب کہیں پر نہیں ہے، انگریزی، روسی اور بعض دیگر زبانوں میں اردو کا کچھ حصہ ضرور ترجمہ ہوا ہے، مگر اس پر دنیا کی کسی زبان میں بحث نہیں ہوتی ہے، اس ادب کو انعام کے قابل نہیں سمجھا گیا ہے اور اس ادب سے استفادہ کرنے والے کتنے ہیں؟ صرف روایتی ادبی وشعری نشستیں برپا کرنا اور مشاعرہ منعقد کرنا ہی سب کچھ نہیں ہے، اردو کے مستقبل کے سلسلے میں ابھی آپ سے گفتگو ہو چکی ہے، حقیقت سے چشم پوشی نقصان دہ ہے، یہ میں جانتا ہوں-

سوال:- آپ کے تعلق سے پس پشت چہ می گوئیاں کرنے والے کہتے ہیں کہ آپ زیادہ تر شخصیت پر لکھتے ہیں، جس کا مقصد ذاتی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے، اس الزام سے برأت میں آپ کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:- اظہار کی متقاضی حقیقتیں لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی کہ مصداق ہیں، ادب میں فرد یا شخصیت سے زیادہ موضوع تام یا موضوع مکمل دوسرا کچھ بھی نہیں، اسی لیے میری اولیت اس میں ہے، ویسے میں نے اصناف پر بھی بہت لکھا ہے، کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، مسائل پر بھی بہت کچھ لکھا ہے، لیکن کوئی شخصیت جب موقر اور معتبر بن جاتی ہے یا بننے لگتی ہے، دید و دریافت کے فکر ونظر سے مالا مال نظر آتی ہے اور ہمہ جہت تخلیقیت کے امکان سے بھرپور نظر آنے لگتی ہے تب میں کتاب لکھ کر یا لکھوا کر اعتبار بخشتا ہوں، شخصیتوں کے لیے اس طرح کا استحکام بخش کام کتنے لوگ کر رہے ہیں؟ میں پوری دنیا کے قلم کاروں کو ساتھ لے کر چل رہا ہوں، اس میں خوشنودی کا جذبہ کہاں دخیل ہوتا ہے؟ دوسروں کو اعتبار بخش کر خوش ہونے کا جذبہ البتہ کارفرما رہتا ہے، الزام لگانے والوں کو اس لمس کا پتہ ہی نہیں جو میں ذومعنویت، تازگی اور جمالیات ونشانیات کی سائنس سے حاصل کرتا ہوں-

سوال:- کہا جاتا ہے کہ ہر ماہ آپ ایک نئی صنف سخن کی ایجاد کرتے ہیں، کیا اس سے ادب کو کوئی فائدہ پہونچ رہا ہے یا نقصان ہو رہا ہے؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:- ہر ماہ دو ماہ میں میری نئی کتاب ضرور آجاتی ہے، البتہ کوہسار کے ذریعہ متروک اور نئی اصناف کو فروغ دے رہا ہوں، اس کا کریڈٹ صرف مجھے نہیں جاتا بلکہ ان شاعروں کو بھی جاتا ہے جو نیا پن چاہتے ہیں اور میرے ہم خیالی اور ہم قدم ہیں، میرے پاس ہزاروں ناقدوں، قلم کاروں اور قارئین کے خطوط ہیں کہ اس سے ادب کو فائدہ پہنچ رہا ہے، فکری طلاطم سے لہجے کی افزائش ہوتی ہے اور اس سے نیا پن وجود میں آتا ہے، اس نئے پن میں تشخص کا عنصر ہوتا ہے جس سے کسی کو برا نہیں لگ سکتا-

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:- میں ادب کا استاذ ضرور ہوں، لیکن ابھی خود کو ادب کا طالب علم سمجھتا ہوں، اس لیے پیغام وغیرہ نہیں دے سکتا- ''جام نور'' نے اکیسویں صدی میں سمت کی جو دریافت کی ہے، پرانی سمتوں کا جس طرح تعین کیا ہے اور طے شدہ مفہوم کی عمارت جس طرح قائم کی ہے اس میں اور زیادہ استحکام آئے، زمینی، تہذیبی اور ثقافتی سیاق وسباق سے وجود میں نیرنگیاں نمو پذیر ہوں اور نئی نسل میں علمی و مذہبی بصیرت اور شعور پیدا ہو، اس کی دعا کرتا ہوں-□□□

(شمارہ دسمبر ۲۰۰۵ء)

پروفیسر ناز قادری

سابق صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی مظفر پور (بہار)

پروفیسر ناز قادری ان چند نعت گو شعرا میں سے ایک ہیں جن کے لہجے کی انفرادیت، اسلوب کا تیور اور الفاظ کی دل کشی ہندوستان کی روایتی نعت نگاری سے بہت مختلف ہے- یہی فرق انہیں بزم نعت میں امتیاز بخشتا ہے- پروفیسر ناز قادری صاحب کی ابتدائی تعلیم ان کی بستی بروراج میں ہوئی، بہار یونیورسٹی مظفر پور سے ایم، اے- پی، ایچ، ڈی اور ڈی لٹ کی تکمیل کی، پی، ایچ ڈی کی تھیسس ''اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ'' ۱۹۷۹ء میں اور ڈی لٹ کی تھیسس ''صغریٰ ہمایوں مرزا کی ثقافتی و ادبی خدمات'' ۲۰۰۴ء میں طبع ہو چکی ہے- پروفیسر صاحب کو ایم اے کے بعد ۳۱/ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں بھاگل پور یونیورسٹی میں لیکچرر شپ مل گئی، ۱۹۸۲ء میں ریڈر ہوگئے، ۱۹۸۴ء میں بہار یونیورسٹی مظفر پور آ گئے، ۱۹۸۵ء میں پروفیسر ہوئے اور ۲۰۰۱ء میں صدر شعبہ کے اعزاز سے مشرف ہوئے، پھر ۳۱/ جولائی ۲۰۰۴ء کو ریٹائرڈ ہوکر تا ہنوز فکر و قلم سے علم و فن کی آب یاری اور مدحت نبی سے قلب و روح کی سر شاری میں مصروف ہیں- پروفیسر صاحب کے قلمی شہ پاروں میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''دریافت'' (۱۹۸۵ء) شعری مجموعہ ''لمحوں کی صدا'' (۱۹۹۷ء) اردو ناول کی تاریخ پر ''اردو ناول کا سفر'' (۲۰۰۱ء)، تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ''زاویے'' (۲۰۰۹ء) غزلوں کے دو مجموعے ''صحرا میں ایک بوند'' اور ''رنگ شکستہ'' نعتیہ مجموعہ ''چراغ حرا'' (۲۰۰۹ء) اور افسانوں کا مجموعہ ''وہ ایک بات'' اہل علم و ادب سے تحسین حاصل کر چکے ہیں- پروفیسر قادری صاحب بہار اردو اکیڈمی پٹنہ، یوپی اردو اکیڈمی، لکھنو، مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ اور آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ سے مختلف ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں-

سوال:- بہار کی سرزمین سخن دان اردو سے زرخیز رہی ہے، اردو ایک زمانے سے بہار کی دوسری سرکاری زبان رہی ہے پھر بھی بہار میں اس کی حالت ابتر کیوں رہی؟

پروفیسر ناز قادری:- بہار کی سرزمین یقیناً اردو کے حوالہ سے زرخیز رہی ہے، شروع سے یہاں تخلیقی ادب کا سلسلہ جاری ہے، سیاسی سطح پر اسے ثانوی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی، لیکن سیاسی سطح سے ہی وہ افراتفری کی صورت حال پیدا ہوئی جس کی وجہ سے بہار میں اردو زبوں حالی کا شکار ہوئی، اس کے علاوہ اردو کا سب سے زیادہ نقصان نظام تعلیم کی وجہ سے ہوا، نظام تعلیم اس طرح بگڑا ہوا ہے کہ اردو کی طرف اب طلبہ کا رجحان ہی نہیں ہوتا، ایک زمانہ تھا جب ایم اے میں داخلے کے لیے چار سو، پانچ سو درخواستیں آتی تھیں، آج یہ عالم ہے کہ ۵/ سے ۱۰/ تک ان کی تعداد سمٹ جاتی ہے، بی اے کی کلاس میں پہلے ہزاروں لڑکے حاضر ہوتے تھے اور اب بمشکل ۴۵/۵۰ ہی ہوتے ہیں، گریجویشن کے بعد کچھ پروفیشنل کورسیز میں چلے جاتے ہیں، کچھ تعلیم ہی بند کر دیتے ہیں، ایم اے کے لیے مٹھی بھر بچ جاتے ہیں، تو ایسا صرف نظام تعلیم صحیح نہ رہنے کی وجہ سے نیز بے روزگاری کی وجہ سے ہوا، اردو سماج میں ہی اردو اس قدر رانحطاط پذیر ہوگئی، اب اس کی وجہ سے یہ زبان پنپ نہیں پا رہی ہے، ادب کی تخلیق کل بھی ہو رہی تھی آج بھی ہو رہی ہے، اردو رسالے اٹھا کر دیکھیے تو اکثریت بہار کے قلم کاروں کی ہی ملے گی، وہیں کے شاعر ہیں، وہیں کے ادیب ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ صرف تخلیقی ادب سے کچھ ہونے کو نہیں ہے-

سوال:- بہار میں جو اردو کو ثانوی درجہ دیا گیا، تو یہ بس زبان کی حد تک ہی تھا یا اس کے فروغ کے لیے کچھ اقدامات بھی کیے گئے؟

پروفیسر ناز قادری:- اقدامات صحت مندانہ طور پر نہیں کیے گئے، ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ دفتر کا (Name Plate) بدل دینے سے اردو کا فروغ ہو جائے گا حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے، پبلک میں اس طرف رجحان کا ہونا بہت ضروری تھا، جو نہیں پایا گیا، دفتروں میں جو ٹرانسلیٹر پہنچے ان کے پاس اردو میں درخواستیں نہیں آئیں، پھر ہم اردو والے جو دفتروں میں

ٹرانسلیٹر کی حیثیت سے پہنچے، ہمیں عوام میں اس کی ترغیب دلانی چاہیے تھی کہ وہ اردو میں درخواستیں لکھیں، مگر ہم نے ترغیب نہیں دلائی، اس لیے کہ ہماری توجہ وہاں دوسری فائلوں کی طرف ہوگئی، وہاں آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا ہوئے، ہماری مصروفیت بڑھی اور ہم انہی کی طرف مائل ہوگئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنے آپ کو جنرل کلرک کے ساتھ ضم کرگئے، جس کی وجہ سے اس کا دائرہ بھی سمٹتا چلا گیا، آج بہت سی جگہوں پر ٹرانسلیٹر نہیں ہیں، ٹائپسٹ نہیں ہیں، جو ہیں وہ بھی اس طرح ضم ہوگئے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ اردو والے ہیں-

سوال:-بہار سے اچھے اخبارات کیوں نہیں نکلتے، کیا اس راہ میں کچھ دشواریاں ہیں؟

پروفیسر ناز قادری:-ضرور نکل سکتے ہیں، ایک اخبار نکلا بھی لیکن نہیں چلا، ابھی جو اخبار نکلتا ہے اس میں تو کوئی جان ہی نہیں ہوتی، لیکن اردو کے نام پر ہم اسے لینے پر مجبور ہیں، جہاں ہم ہندی اور انگلش کے اخبار لیتے ہیں، اردو کے اخبار بھی لے لیتے ہیں، لیکن اردو کا آج کوئی اچھا اخبار نہیں نکل رہا ہے" آثار" نام کا ایک اچھا اخبار نکلا تھا، مگر اس کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکا- اردو والے اگر اس کے لیے مخلصانہ کوشش کرتے ہیں تو یہ سلسلہ پھر سے شروع ہوسکتا ہے-

سوال:-اساطین اردو سے جب اردو کے مستقبل کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو وہ اس کے تابناک مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں، حالاں کہ اردو سے نئی نسل بالکل نا آشنا ہوتی جارہی ہے، ایسے میں اس پیش گوئی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

پروفیسر ناز قادری:-اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے، مایوس میں بھی ہوں، اس لیے کہ جو لوگ اس کا دعویٰ کرتے ہیں خود ان کے بچے اردو نہیں پڑھتے، اور یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اردو کے اساتذہ تو اردو کے اخبار تک نہیں پڑھتے، انگریزی کے اخبار پڑھتے ہیں یا ہندی کے، بچے انگلش میڈیم سے پڑھ رہے ہیں، اردو سے نابلد ہیں، اس کے باوجود بھی اگر ہم اس کے دعویدار ہیں کہ اردو کا مستقبل روشن ہے تو......ع

دل کو بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

سوال:-تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو کا مستقبل تابناک نہیں ہے؟

پروفیسر ناز قادری:-ابھی جو موجودہ صورت حال ہے، اس تناظر میں تو تابناک نہیں کہا جاسکتا، تخلیقی ادب سے تو کچھ ہونے کو نہیں ہے، آج جو تخلیقی ادب سامنے آرہا ہے اس کے بارے میں سچی بات یہی ہے کہ جو لوگ تخلیق کار ہیں وہی ریڈر بھی ہیں، افسانہ نگار وہی ہیں، شاعر وہی ہیں اور قاری بھی وہی ہیں تو ایسی صورت حال میں یہ کیسے سمجھا جائے کہ اس کا دائرہ وسیع ہورہا ہے یا اس کا مستقبل بہت تابناک ہے-

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس پر غور کریں کہ بنیادی سطح پر سماج میں ہم اردو کے لیے کیا کررہے ہیں؟ ہم لوگ جب تک سرکار کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے رہیں گے ہماری زبان فروغ نہیں پاسکتی ہے، انجمن ترقی اردو، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو یا اردو کی دوسری اکیڈمیوں میں آپ جاکر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں کنبہ پروری اور دوست نوازی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، جڑ میں صرف پانی ڈالنے سے کام نہیں چل سکتا، اس میں کھاد بھی تو ڈالنا ہوگا، اس کی طرف عوام کو متوجہ کرانا پڑے گا، انہیں یہ باور کرانا ہوگا کہ اردو زبان سے ہماری تہذیب وابستہ ہے، اور یہ صرف زبان و ادب کی ہی جہت سے نہیں، دین ومذہب کے لحاظ سے بھی ہماری تہذیب اس سے وابستہ ہے، یہ احساس ہم جب تک (Mass) بنیاد میں نہیں جگا دیتے نہ ہماری زبان کا فروغ ہوسکتا ہے اور نہ ہماری تہذیب وثقافت، ہمارے تمدن اور ہمارے مذہب کا تحفظ ہوسکتا ہے-

سوال:-لالو پرساد یادو کے ۱۵/سالہ دور اقتدار کے خاتمہ کے بعد کیا آپ امید کرتے ہیں کہ اب نئی حکومت اردو کے حوالے سے کوئی پیش رفت کرے گی؟

پروفیسر ناز قادری:-نئی حکومت نے جو وعدے کیے ہیں، اگر یہ اپنے وعدوں کی ۱۰/ فیصد یا ۲۰/فیصد باتیں بھی پوری کردکھاتی ہے تو بہار کے فروغ کے سلسلے میں امیدیں بندھ سکتی ہیں اور جہاں تک اردو زبان کی بات ہے تو اس حوالے سے ان کے کچھ وعدے الیکشن کے بعد سامنے آئے ہیں، لیکن فی الحال ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا، ابھی تو ان کی چھٹی بھی نہیں ہوئی-

سوال:-ویسے آپ پر امید کتنے ہیں؟

پروفیسر ناز قادری:-ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا، دیکھیے سامنے کیا آتا ہے-

سوال:-اور لالو نے اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں کے حوالے سے یا اردو زبان کے حوالے سے کتنا کام کیا؟

پروفیسر ناز قادری:-لالو نے تو ہمیشہ فریب ہی دیا، ہم لوگ صرف اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے ان کے ساتھ رہے، کہا جاتا ہے کہ کسی بھی ملک یا کسی بھی قوم کو اگر تباہ و برباد کرنا ہے تو اس کے اقتصادیات کو تباہ کردو، لالو نے اس فارمولے کے تناظر میں بڑی زبردست کامیابی حاصل کی ہے، صرف ۶/انچ کی گردن بچانے کی بات کر کے اس نے پورا جسم ہم سے چھین لیا، چند لوگوں کو اپنے ساتھ رکھ کر اس نے جو ہماری قوم کا استحصال کیا ہے وہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے- لالو نے صرف سبز باغ دکھایا، مجموعی طور پر مسلمانوں کے روزگار یا اقتصادیات کے بارے میں سوچیے تو پچھلے پندرہ سالوں میں ان کی حالت بہت اچھی نہیں ہوئی، شروع میں انہوں نے کچھ روزگار ضرور دیے، مگر آخری ۵/سالوں میں تو وہ Adjustment ہی کر کے رہ گئے، بحالی تو نہیں کی، یا اس نے خود ایسے فارمولے بنا دیے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ خود اس نے اپنی برادری کے لوگوں کو زیادہ شامل کر دیا، انہوں نے تحفظ کیا صرف اپنی برادری کا، نام رکھا My کا لیکن My نہیں رہا، صرف y ہی رہا، ہماری گفتگو صرف کسی ایک پہلو پر نہیں، ہم پورے کینوس پر بات کر رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہماری مجبوری تھی کہ ہم اب تک ان کے ساتھ رہے، لیکن ابھی جو اس کی زبردست شکست ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم سماج اس سے اندر اندر بیزار ہو چکا تھا، بیزاری کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں نے یہ طے کر لیا کہ کسی طرح بھی لالو کی حکومت ختم ہو، اس کی جگہ کون سی حکومت آرہی ہے، سیکولر لوگ اقتدار پر آرہے ہیں یا فرقہ پرست عناصر آرہے ہیں، اس کا انہیں احساس تک نہیں رہا، اسی لیے اس بار مسلم سماج مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گیا، جس کو جہاں دل ملا، جس نے جس کو چاہا، اس کا سپورٹ کر دیا، اگر یہ متحد ہو کر کام کرتے ، کچھ دور اندیشی سے کام لیتے تو شاید وہ صورت حال سامنے نہیں آتی جو آج ہے کہ آج ہم نتیش کو جیت دلا کر بی جے پی کا ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں-

سوال:-اردو میں مفت خوانی کا رواج عام ہے، بڑے بڑے اساتذہ جو اردو کے

استاذ ہونے کی حیثیت سے خطیر تنخواہیں پاتے ہیں مگر وہ بھی صرف اعزازی اخبارات و رسائل پڑھنے کے عادی ہیں، اس روایت کو کیسے توڑا جائے؟

پروفیسر ناز قادری:-یہ تو احساس کی بات ہے، مثال کے طور پر ایم اے کے ہمارے دو طالب علموں نے مل کر ایک رسالہ بہ عنوان ''صدف'' نکالا، اس کو اپنے شعبے میں تقسیم کیا، طلبہ کو بھی دیا اور ان سے اس شمارے کی قیمت لی، طلبہ نے اس کی قیمت دے دی، لیکن جب اساتذہ کے سامنے یہ کاسہ پھیلایا گیا، (ابھی جو صورت حال ہے اس کے پیش نظر اسے کاسہ ہی کہا جاسکتا ہے) تو ان لوگوں نے پرچہ واپس کر دیا، یہی معاملہ ہر جگہ ہے، کسی ایک جگہ کی یہ بات نہیں، آپ حیرت کریں گے کہ جب اس رسالے کا جشن اجراء منایا گیا تو اس میں اردو کا ایک ٹیچر بھی شامل نہیں ہوا، تو اردو کے اساتذہ مفت خوانی کے واقعی عادی ہیں، ممکن ہے کہ اس طرح کے کچھ علماء بھی ہوں، لیکن میرا رابطہ ان سے بہت زیادہ گہرا نہیں ہے اس لیے ان کے بارے میں میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا-لیکن اردو کے اساتذہ کا حال تو واقعی قابل ماتم ہے، اردو اخبار تو یہ خرید ہی نہیں سکتے، بہت ہوگا تو چائے خانے میں بیٹھ کر اردو اخبار پڑھ لیں گے اور آپ کو بتادوں ۵۰/فیصد اردو کے اساتذہ تو رسالے تک نہیں پڑھتے ، اس لیے کہ پہلے جو اعزازی رسالے بھیجنے کا رواج تھا اب وہ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے، تو اب جو لوگ مفت پڑھنے کے عادی ہیں ان تک مفت کی چیزیں پہنچ نہیں پا رہی ہیں، اس لیے اب وہ پڑھتے بھی نہیں، تو جب تک اردو کے تعلق سے ہمارے اندر مثبت احساس پیدا نہیں ہوگا، ہم یہ محسوس نہیں کریں گے کہ بچوں کو اردو کی تعلیم دلانا بھی ضروری ہے اور اردو کی بقا کے لیے اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنا بھی ضروری ہے، تب تک نہ تو اس زبان کا فروغ ہوسکتا ہے اور نہ یہ مفت خوانی کا رواج ختم ہوسکتا ہے، لیکن یہ احساس آسانی سے پیدا نہیں ہوسکتا، لوگ عذر لنگ پیش کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو اردو پڑھا کر کیا ہوگا، اس میں تو روزگار کے مواقع ہی نہیں ہیں، بمشکل ۳۳/فیصد ہی ہمارے بچے اردو پڑھتے ہیں، اس سے میری مراد اردو کی اعلیٰ تعلیم ہے، تھوڑی بہت تو سب پڑھ لیتے ہیں، بہر حال! میرا مطلب ہے کہ اردو کے تعلق سے جو ہمارے اندر احساس ہمدردی ہونا چاہیے وہ نہیں ہو پا رہا ہے،

آپ مفت خوان اساتذہ کو مفت رسالہ بھیج کر بھی ان کے اندر یہ احساس بیدار نہیں کر سکتے -

سوال:- پھر ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

پروفیسر ناز قادری:- اس کے لیے مختلف مقامات پر سیمینار و سمپوزیم کا انعقاد کرنا چاہیے، جس میں اردو زبان، اردو تہذیب اور اسلامی تہذیب پر تبادلۂ خیال کیا جائے، اردو تعلیم کی کیا اہمیت ہے، ہمارے بچے اردو پڑھ کر بھی برسر روزگار ہو سکتے ہیں، ان باتوں کو پیش کیا جائے، اس طرح ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگے-

سوال:- سید صبیح رحمانی نے ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ''نعت رنگ'' کا فاضل بریلوی پر خصوصی شمارہ شائع کر دیا، یہ اپنی نوعیت کا پہلا شمارہ ہے، کیا آپ بتائیں گے کہ ''رضویات'' کے باب میں اس کا کتنا مثبت کردار ہو سکتا ہے؟

پروفیسر ناز قادری:- ''نعت رنگ'' کے جو شمارے اب تک سامنے آئے ہیں، ان کی روشنی میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ رزلٹ اچھا ہی رہے گا، ویسے قبل از وقت ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس کی نوعیت کیا ہے، تاہم اتنا ہے کہ ''نعت رنگ'' کی یہ پیش کش حسب روایت بہتر ہی ہوگی اور اگر اس میں بھی رضویات کے سلسلے میں انتہا پسندی ہوگی تب تو اس کے تعلق سے ہم صحت مند رجحان نہیں پیش کر سکتے -

سوال:- کیا آپ اس کے قائل ہیں کہ نعت کو تنقیدی رویوں سے گزارنا چاہیے؟ جیسا کہ ''نعت رنگ'' اس روایت کو فروغ دے رہا ہے-

پروفیسر ناز قادری:- ضرور گزارنا چاہیے، ہم ایک مدت تک نعت شریف نہیں لکھتے تھے، اس میں لغزش کا ڈر لگتا تھا، اس لیے کہ اس میں تغزل کا ایسا رنگ آ جاتا ہے جو ہم کو قبول نہیں ہوتا ہے، آپ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زلفوں کی تعریف کیجیے، حسن کی تعریف کیجیے، لباس کی تعریف کیجیے، مگر ادب اور وقار کی جو حدود ہیں ان کا لحاظ رکھیے، اس لیے کہ مثنویوں میں جس طرح ہیرو اور ہیروئن کی تعریف کی جاتی ہے، اگر اس طرح کی بات نعت شریف میں آئے تو ہم اسے گستاخی سمجھتے ہیں، اس حوالے سے بھی ''نعت رنگ'' میں کچھ تحقیقی و تنقیدی مضامین آئے، وہ ہمیں بہت اچھے لگے، ''نعت'' کی لغوی جہت سے بھی

تراش خراش ہو رہی ہے، لفظیات پر گرفت ہو رہی ہے اور بعض پر روک لگ رہا ہے، یہ بہت اچھی بات ہے-

سوال:- نعتیہ ادب پہ لکھنے والوں کی کمی اپنے ہندوستان میں بھی نہیں ہے، مگر اپنے یہاں سے اس نوعیت کا کوئی کام نہیں ہو رہا ہے، اس کی شکایت اہل پاکستان کو بھی ہے، تو کیا ایسے میں آپ جیسے علم دوست، لغت گو و نعت فہم شخصیات سے ہم کسی پیش قدمی کی توقع رکھ سکتے ہیں؟

پروفیسر ناز قادری:- بالکل توقع رکھ سکتے ہیں، یہی دیکھیے کہ آپ کا جام نور جب سامنے آیا تو بہت سے لوگ لکھنے لگے، جو اس سے پہلے نہیں لکھ رہے تھے، نعت، آداب نعت اور نعت گو بزرگ شعرا کے حوالے سے مضامین آ رہے ہیں اور دوسرے رسالے بھی سامنے آ رہے ہیں، ابھی کلکتہ سے ایک پرچہ نکلنا شروع ہوا ہے جس میں نعت کے حوالے سے اس قسم کی چیزیں بھی آ رہی ہیں-

سوال:- مگر نعت کے حوالے سے پاکستان میں جس طرح نعت ریسرچ سینٹرز قائم ہیں اور اس پر جس طرح کام ہو رہا ہے، اس طرح کا اپنے ملک میں نہیں ہو رہا ہے-

پروفیسر ناز قادری:- ہماری نظر میں اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ وہاں اپنے ہی مسلک کے لوگوں میں بہت زیادہ توڑ یا انتشار نہیں ہے، ہمارے یہاں بہت زیادہ انتہا پسندی ہے، یہاں تو ایک ہی گھر میں مختلف خیمے لگے ہوئے ہیں، آپس میں متصادم بھی ہیں، ایک دوسرے پر کیچڑ بھی اچھال رہے ہیں، ایک گھرانے کا یہ حال ہے، اس سے اور آگے بڑھ کر دیکھیے تو خود اپنے مسلک کے خلاف بہت سی ہماری عصبیتیں کام کر رہی ہیں، ایسی صورت میں ہم کوئی مثبت کام نہیں کر سکتے ہیں، پہلے ہمیں اپنے دل و دماغ کو پاک صاف کرنا ہوگا، بے جا عصبیت سے اٹھ کر سوچنا ہوگا، تبھی ہم مثبت اور تعمیری کام کر سکتے ہیں-

سوال:- نعتیہ شاعری پاکستان میں نئی نئی جہتوں سے متعارف ہو رہا ہے، اسلوب میں نکھار اور جدت آتی جا رہی ہے، لیکن ہندوستان میں ایک جمود ہے، آپ ایک منفرد اسلوب کے مالک ہونے کی حیثیت سے بتائیں اس جمود کو کیسے توڑا جائے؟

پروفیسر ناز قادری:- سب سے پہلے تو آپ اس چیز کو ملحوظ رکھیں کہ دونوں ملک کا

ماحول اور فضا الگ الگ ہے، نعت ہی کی بات نہیں، دیگر تخلیقی ادب کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے، پاکستان میں جو غزلیں کہی جا رہی ہیں ان کا رنگ و آہنگ بالکل الگ اور منفرد ہے، لیکن پاکستانی غزلوں سے متاثر ہو کر ہمارے ہندوستانی شعرا بھی غزلیں لکھ رہے ہیں اور اس میں رنگ بدل رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ پاکستانی غزلیں، پاکستانی ادبیات جتنی زیادہ مقدار میں ہمارے ملک میں آئیں گی ان کا اتنا ہی زیادہ اثر ہوگا اور ہمارا ادب بھی جدید رجحانات سے آشنا ہوگا، اور یہی حال نعت کا بھی ہے، لیکن نعت کے حوالے سے دیکھیے کہ پاکستانی مجلّہ ''نعت رنگ'' بہت کم لوگوں تک پہنچ پاتا ہے، آپ نے جیسا کہ اعلان کیا تھا کہ ''نعت رنگ'' کے شمارے آپ کے یہاں دستیاب ہوتے ہیں، یہ اچھی بات ہے، یہ شمارے ہمارے علما، ادبا اور عام قارئین تک پہنچیں، اسی طرح رسائل میں پاکستانی نعتیں چھپیں تو میرا خیال ہے کہ رفتہ رفتہ نعت کے حوالے سے پیدا شدہ جمود کا رجحان توڑا جا سکتا ہے، خود میرا اپنا تجربہ ہے کہ پہلے رنگ تغزل کے خوف سے میں نعت نہیں کہتا تھا، ڈرتا تھا، لیکن ''نعت رنگ'' کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ ''نعت'' ہم کس طرح سے کہہ سکتے ہیں اور ہمارے اندر یہ اعتماد پیدا ہوا کہ ہم بھی نعت کہہ سکتے ہیں، خصوصاً لفظیات کے حوالے سے جو تنقیدی مضامین اس میں چھپے ان سے مجھے بہت روشنی ملی اور بہت حوصلہ ملا، اس لیے میں اپنے تجربہ کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ شعرا جو نعت نہیں کہتے، مگر ان کے اندر بھی اس کی خواہش ہوتی ہے، وہ غزلیں اور نظمیں اچھی لکھتے ہیں اور نعت بھی اچھی کہنا چاہتے ہیں مگر میری طرح وہ بھی ڈرتے ہیں، اگر یہ تنقیدی بصیرت افروز مضامین ان تک پہنچیں تو یہ بھی نعت لکھنا شروع کر دیں گے اور پھر نعتیہ ادب میں نئے اسالیب کا اضافہ ہوگا-

سوال :-اہل سنت و جماعت کے علمی و تبلیغی سرگرمیوں سے آپ کتنا مطمئن ہیں؟ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ مستقبل میں کچھ روشن آثار ہیں؟

پروفیسر ناز قادری:-ادھر پچھلے چند برسوں سے تو سرگرمیاں بڑھی ہیں، کئی ایک اچھے رسالے بھی نکل رہے ہیں، اشرفیہ ہے، ماہ نور ہے، فیضان ہے، حیدرآباد سے ایک بہت اچھا پرچہ ''الانصار'' نکل رہا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ بھی اپنے اہل سنت و جماعت ہی کی فکر کو

عام کر رہا ہے، حالاں کہ اس میں ہر چیز ہے، افسانے بھی ہیں، مضامین بھی ہیں، تنقیدی و تحقیقی مقالات بھی ہیں، ایک ساتھ دس دس بیس بیس نعتیں اور دس پندرہ حمد و مناجات بھی چھپتیں ہیں، بزرگان دین پر بھی اس میں مضامین چھپ رہے ہیں، ان کے مسلک و فکر پر بھی تجزیے ہو رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ایک پرچہ تو ہر جگہ پہنچ نہیں سکتا، اس طرح کے اور پرچے نکلیں تو تزکیۂ نفس اور اصلاح فکر و نظر کا کام بہتر طور پر ہو سکے گا، ایسے ہی دوسرے میدانوں میں بھی اب کام ہو رہا ہے، مجموعی طور پر ہم مستقبل کے تعلق سے پُر امید ہو سکتے ہیں-

سوال:-ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

پروفیسر ناز قادری:-قارئین کے لیے میرا مشورہ یا تجویز کہہ لیں یہ ہے کہ ''جام نور'' جس مشن کو لے کر چل رہا ہے اس کی ترویج و اشاعت کے لیے وہ عملی اقدام کریں، اپنے احباب اور رشتہ داروں کے بیچ اس کی تبلیغ کریں، اس کی ممبر شپ کو بڑھانے کی کوشش کریں، اس سے نہ صرف یہ پرچہ اقتصادی طور پر مضبوط ہوگا بلکہ دینی و علمی سطح پر اس کے اچھے نتائج سامنے آئیں گے-رہی ''جام نور'' کی بات تو یہ رسالہ جو کام کر رہا ہے یہ مجھے کافی پسند ہے، جس ٹریک پر یہ ابھی چل رہا ہے وہ بہت ہی بہتر ہے، اس سے ہٹ کر کوئی الگ سا نکتہ تو میرے ذہن میں نہیں ہے، آپ آئے دن نئے نئے کالمز کا اضافہ کر رہے ہیں، جس سے اس کے حسن میں اضافہ ہو رہا ہے، اب تک میری نظر میں اس کی کوئی کمی سامنے نہیں آئی ہے، مستقبل میں جب بھی آئے گی میں برملا آپ کو خط لکھ کر مطلع کروں گا- اس رسالہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اعتدال پسند ہے اور ہمارے مسلک کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے، یہ میرا اپنا احساس ہے کہ جو صحت مند معیار اس نے اپنا بنایا ہے یہ دوسرے اسلامی پرچوں میں نہیں ملتا، ویسے ان کی بھی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے، اپنے اسی خیال کی بنا پر اپنے مسلک کے جو پرچے بھی سامنے آتے ہیں انہیں تخلیقی تعاون دیتا ہوں، کیوں کہ اگر ہم تعاون نہ دیں تو وہ پرچے بند ہو جائیں گے اور جب پرچے بند ہو جائیں گے تو جو ہمارے نظریات ہیں، جو ہمارا نصب العین ہے وہ عوام تک نہیں پہنچ سکے گا-□□□

(شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء)

پروفیسر نثار احمد فاروقی

سابق صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی بین الاقوامی شہرت یافتہ ایک عظیم دانشور، محقق، ناقد اور اسکالر تھے، آپ کی علوم دینیہ بالخصوص تصوف پر گہری نظر تھی نیز عربی و انگریزی زبان وادب میں بھی غیر معمولی صلاحیت تھی- آپ نے ۲۹ر جون ۱۹۳۴ء کو امروہہ یوپی کے ایک علمی، مذہبی اور صوفیانہ گھرانے میں آنکھ کھولی اور اپنے اباء واجداد سے اسلامی علوم وفنون حاصل کیا، مالی تنگی کی وجہ سے دہلی کا رخ کیا جہاں آپ نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا اور دہلی یونیورسٹی سے عربی زبان و ادب میں B.A اور M.A کرنے کے بعد ۱۹۷۷ء میں پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر دہلی یونیورسٹی میں ہی بحیثیت لیکچرار مقرر ہوگئے اور ترقی کرتے ہوئے ۱۹۸۵ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے- آپ کی علمی صلاحیت کے مد نظر یونیورسٹی نے آپ کو ۱۹۸۴ء سے لے کر ۱۹۹۶ء تک تین مرتبہ شعبۂ عربی ادب کا صدر مقرر کیا- آپ نے اردو اور عربی زبان وادب نیز تصوف کے موضوعات پر عربی، اردو اور انگریزی میں تقریباً ساڑھے چار سو مقالات اور پچاس کتابیں تحریر فرمائی ہیں، جن میں ''میر کی آپ بیتی، دید و دریافت، طبقات الشعرا، کلیات مصحفی (دو جلدوں میں) مقالات الشعرا، تاریخ طبری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، چشتی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتوبات اہم ہیں- آپ کی علمی خدمات سے متأثر ہو کر مختلف تنظیموں، یونیورسٹیوں اور ملکوں نے آپ کو ایوارڈ سے نوازا جن میں سابق صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کے ہاتھوں ۱۹۸۵ء میں علمی ایوارڈ اور پاکستان سے ۱۹۸۷ء میں نقوش ایوارڈ قابل ذکر ہے- آپ کا وصال ۲۸ر نومبر ۲۰۰۴ء کو دہلی میں ہوا-

سوال:- عام طور سے مدارس کے طلبہ فراغت کے بعد تدریسی خدمات میں سرگرم ہوجاتے ہیں، لیکن آپ نے یونیورسٹی کا رخ کیا، کوئی خاص وجہ؟

پروفیسر نثار احمد فاروقی:- اس سلسلے میں عرض ہے کہ میری عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم تو میرے گھر پر ہوئی - میرے چچا مولانا مفتی محمد نسیم احمد فریدی اور میرے نانا حضرت شاہ سلیمان احمد شاہ صاحب (جو حضرت شاہ ابوالهادی کے سجادہ نشین تھے) نے پڑھایا اور پھر ہم نے وہاں کے عربی مدرسے میں بھی داخلہ لیا - دو تین سال تک پڑھا لیکن فراغت نہیں ہوئی - اس کے بعد ہوا یہ کہ اس زمانے میں مجاہدوں کا خاتمہ ہوگیا جس کی وجہ سے مسائل سامنے آنے لگے کیوں کہ ہمارے ننھیال اور ددھیال کے اقتصادی معاملات بھی سامراج ہی سے جڑے ہوئے تھے اس لیے میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر دلی آگیا اور یہاں میں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھی اور بی اے پاس کرلیا، اس کے بعد ایم اے کیا اور پھر پی ایچ ڈی کی تکمیل کی، اس طرح جو کچھ بھی ہوا کسی پلاننگ کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ حالات نے جدھر بہادیا ادھر چل پڑے-

سوال:- یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ملک کے بیشتر مدارس میں بطور زبان عربی ادب کی تعلیم مفقود ہے، آپ کی نظر میں کوئی ایسی تجویز جس سے اس خلا کو پر کیا جاسکے؟

پروفیسر نثار احمد فاروقی:- ہم اس کا الزام مدارس کو نہیں دے سکتے اس لیے کہ مدارس کا مقصد عربی زبان سکھانا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد دین و مذہب اور قرآن وحدیث کو سکھانا ہے، زبان کو وہ اس حد تک سکھاتے ہیں کہ آپ اس کی گرامر سے واقف ہوں- عربی زبان میں کس لفظ کا کیا مطلب ہے، اس کے معنی کتنے ہیں اور اس کے کیا کیا مطالب ہیں یہ معلوم ہوجائیں تاکہ آپ کسی آیت کی غلط تاویل نہ کریں- کسی حدیث کا غلط مفہوم نہ سمجھیں- اب اس زمانے میں عربی کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپ اس کو بے تکلف بول اور لکھ سکیں لیکن جدید مدارس میں اس کے لیے الگ شعبے ہیں اور یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ وہاں سے اچھے عربی جاننے والے نکلیں- یہاں اس بات کی وضاحت بھی بہت ضروری ہے کہ زبان کی دو قسمیں

ہوتی ہیں-ان میں سے ایک ہے فنکشنل لینگوتج (اللغة الوظیفیه) جس کو آپ روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں اور جس طرح آپ اردو بولتے ہیں اسی طرح عربی کو بولنا ہوتو یہ بہت ضروری ہے،اس لیے کہ اس کے بغیر آپ کامیاب نہیں ہوسکتے -یہ تو ایسا ہی کہ اگر آپ صبح سے شام تک عربی بولتے رہیں تو کتنے لوگ آپ کی بات سمجھیں گے؟ بلکہ مزاق اڑانے لگیں گے کہ ان کو دیکھیے ایسی زبان میں بات کرتے ہیں جو کسی کے سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں- یہ ایسی صورت میں صحیح ہوگا جب آپ ایسے ماحول میں ہوں جہاں اس زبان کو بولے بغیر آپ کا کام ہی نہ چلے-

مدارس اپنے نصاب میں عربی زبان کو مقصود نہیں بلکہ ذریعہ سمجھتے ہیں،اس زبان کو بطور مقصود پڑھانے کے لیے آپ مدرسے میں ایک سیکشن یا ایک شعبہ خاص کردیں تاکہ جو لوگ عربی بولنا اور لکھنا سیکھنا چاہیں وہ اس شعبے میں رہیں-

سوال:- عام تأثر یہ ہے کہ عالم عرب کے جامعات میں عربی زبان وادب کی طرف زیادہ رجحان ہے جب کہ ہندوستانی مدارس میں علوم وفنون کی تعلیم زیادہ اچھی طرح ہوتی ہے؟ یہ نظریہ کہاں تک درست ہے؟

پروفیسر نثار احمد فاروقی:- سارے عرب ممالک کے بارے میں میں نہیں جانتا تاہم چند عرب ممالک کے دورے میں جو میرا مشاہدہ ہے اس کے مطابق یہ ہے کہ وہاں تمام موضوعات میں دل چسپی پائی جاتی ہے-ان کا میڈیم (زبان) چونکہ عربی ہے،اس لیے اگر ان کو طب پڑھانا ہوتو بھی عربی میں ہی پڑھاتے ہیں اور دیگر موضوعات کو بھی اسی میں پڑھاتے ہیں-وہاں جاکر ایسا محسوس نہیں ہوا کہ وہ علوم وفنون کی تعلیم اچھی نہیں دیتے-

اب رہا سوال ہندوستانی مدارس کی تعلیم کا تو چونکہ ان کے تعلق سے میری معلومات سطحی ہیں اس لیے میں یہ کہنا مناسب نہیں سمجھتا کہ صاحب یہ اچھا ہے اور وہ برا ہے،کیونکہ یہ ناانصافی ہوگی،لیکن جہاں تک میرا تأثر ہے وہ یہ ہے کہ کچھ مدارس مثلاً جامعہ اشرفیہ مبارکپور،جامعہ نظامیہ حیدرآباد اور ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ وغیرہ اعلیٰ پیمانے کے ہیں جن میں مختلف علوم وفنون میں اختصاص ہے اور وہاں سے بڑی بڑی شخصیتیں بھی نکلی ہیں-ہاں!

اب ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ علم کے بارے میں جو تصور پہلے تھا وہ آج نہیں ہے- پہلے لوگ علم کو اس لیے حاصل کرتے تھے کہ یہ ایک علم ہے اور اب علم کو ملازمت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے-اب ہر کوئی یہ سوچتا ہے کہ میں اپنے بچے کو ایسی تعلیم دوں کہ نکلتے ہی ملازمت مل جائے-اس فکر میں بہت سے لوگوں کی صلاحیتیں ضائع بھی ہوجاتی ہوں گی- فرض کیجیے کہ کسی بچے میں اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا فلسفی بننے کی صلاحیت رکھی ہے،اگر وہ صحیح راستے پر چلتا ہے اور اپنے فطری انداز سے اس کا ارتقا ہوتا ہے تو وہ بہت بڑا فلسفی بن جائے گا،لیکن اگر وہ تعلیم کو ملازمت کی نیت سے حاصل کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں وہ امتیاز نہیں ہوگا جو فلسفہ پڑھنے سے ہوسکتا تھا-پہلے زمانے کے لوگوں میں Job Oriented کورسیز کا تصور نہیں تھا،اس لیے ان مدارس سے بڑے بڑے علما نکل کر آئے،جیسے حضرت شاہ ولی اللہ،شاہ عبد العزیز اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی وغیرہ جنہوں نے چند روپے ماہانہ کے عوض چٹائی پر بیٹھ کر علم کی اشاعت اور اسلام کی تبلیغ کی،یہی وجہ ہے کہ ان سے پڑھ کر نکلنے والے طلبہ پر ان عظیم المرتبت شخصیتوں کی چھاپ ہوتی تھی اور ان میں اعلیٰ درجے کے مصنفین،خطبا،مدرسین اور مبلغین پیدا ہوتے تھے-

سوال:- ملک کے دانشوران کی جانب سے مدارس کے قدیم نصاب تعلیم میں ترمیم واضافے کی رائے سامنے آتی رہتی ہے،اس سلسلے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟

پروفیسر نثار احمد فاروقی:- میری نظر میں مدارس کے نصاب میں ترمیم واضافے کی نہ صرف ضرورت ہے بلکہ مدارس کے طریقۂ تعلیم پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے-اب دیکھیے کہ طریقۂ تعلیم خود ایک پورا سبجیکٹ بن چکا ہے کہ تعلیم کس طرح دی جائے اور علوم کا تحفظ اور ان کی توسیع کیسے ہو-مثال کے طور پر ریاضی کس قدر ضروری علم ہے،اگر آپ اس پر غور کریں تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ ہر چیز کی بنیادی اینٹ ریاضی ہی ہے کہ یہ نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا اور ماہرین نے تو اب اس کو ترقی دے کر منطق میں تبدیل کردیا ہے،اس لیے وقت اور تقاضے کے ساتھ ہر علم میں توسیع اور تبدیلی ہوتی رہنی چاہیے،مثلاً مدارس میں گرامر پڑھانے کے لیے میزان ومنشعب،کافیہ اور شرح جامی وغیرہ اس ڈھنگ سے

پڑھاتے ہیں کہ طلبہ صرف انہیں کتابوں تک محدود رہ جاتے ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ یہ پرانی کتابیں اس طریقے سے ترتیب دی گئی ہیں جو عصری تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں- یہ ایسے ہی ہے جیسے اندھے کی لاٹھی کہ جب تک اس کے ہاتھ میں رہتی ہے وہ ٹھوک ٹھوک کر چلتا ہے اور جیسے ہی لاٹھی چھین لی اس کے لیے چند قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے- لہذا نصاب میں یقیناً ترمیم ہونی چاہیے اور ہوتی رہنی چاہیے- یہ نہیں ہے کہ ہمیں درس نظامی سے یا اس کی کتابوں سے کوئی ضد ہے- اب مثلاً آج تک مدارس میں ہیئت اور فلکیات کی کتابیں پڑھائی جارہی ہیں، لیکن بطلیموس کا نظام اب تک پڑھا رہے ہیں، آخر اس کا کیا فائدہ؟ کیوں اپنا اور طلبہ کا وقت ضائع کر رہے ہیں؟ طلبہ کی صلاحیتوں کو کیوں برباد کر رہے ہیں؟ یا تو اس کو نہ پڑھایے، اور اگر پڑھا رہے ہیں تو فلکیات سے متعلق جو نئی تحقیقات اور جدید نظریات سامنے آچکے ہیں ان سے طلبہ کو روشناس کرایے-

یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے: پاکستان کا ایک بہت مشہور اخبار جس میں ہفتے میں ایک دن کوئی مولوی صاحب سے کچھ مذہبی سوالوں کے جواب بھی فتوے کی شکل میں پوچھے جاتے تھے، اس میں کسی شخص نے سوال کیا کہ صاحب چاند پر اگر آبادی ہو جائے گی اور مسلمان وہاں جائیں گے تو وہ نمازوں اور عیدین وغیرہ کا تعین کیسے کریں گے؟ کیوں کہ یہاں یہ فیصلے رویت ہلال سے کرتے ہیں، وہاں جا کر کیسے کریں گے؟ وہ مولوی صاحب پرانا نصاب پڑھے ہوئے تھے اور انہیں کچھ خبر نہیں تھی تو جواب میں یہ لکھ دیا کہ مسلمانوں کو چاند پہ جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ دیکھیں کہ آپ کا نصاب اور طریقۂ تعلیم زمانے کی ضرورت کے تحت ہے یا نہیں؟ متعلقہ کورس عصری تقاضوں کو پورا کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کر رہا ہے تو اس کو ختم کر دیجیے- ہاں! اگر وہ کورس آسمان سے نازل ہوا ہوتا یا اس کو قرآن کریم میں یا حدیث میں درج کر دیا گیا ہوتا کہ یہ ضرور پڑھانا ہے تو میں اس کی مخالفت نہیں کرتا کہ بھئی یہ تو اللہ کا حکم یا اس کے رسول کا حکم ہے-

سوال:- کہا جاتا ہے کہ آپ کی علم تصوف پر گہری نظر ہے اس سلسلے میں ایک عام مسلمان کو تصوف سے آشنائی کی کتنی ضرورت ہے اور مخالفین تصوف کے لیے آپ کیا کہیں

گے؟

پروفیسر نثار احمد فاروقی:- سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مجھے تصوف سے گہری واقفیت ہے- بس اتنا ہے کہ میں نے اپنے استاد (جو کہ میرے پیر و مرشد بھی تھے، میرے نانا بھی تھے اور چشتی، صابری سلسلے کے بڑے بزرگ حضرت شاہ ابو الہادی چشتی کے پانچویں سجادہ نشین بھی تھے) کو دیکھا اور ان کی زندگی کا مطالعہ کیا اور ان کے اندر میں نے سب کو پڑھ لیا اور اب جس بزرگ کے بارے میں پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں انہی کا حال پڑھ رہا ہوں- اب رہی یہ بات کہ عام مسلمانوں کے لیے تصوف سے واقفیت ضروری ہے یا نہیں تو اس سلسلے میں اتنا عرض ہے کہ تصوف قطعاً کوئی ضروری چیز نہیں ہے، یہ کوئی ریسرچ کی چیز نہیں ہے، یہ تو ایک عملی تجربہ ہے- ہاں! یہ ضرور ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ جاہلانہ برتاؤ نہ ہو- اس کی بے حرمتی نہ ہو- اب رہا سوال ان مخالفین تصوف کے بارے میں جو تصوف کو افیون بتاتے ہیں تو بس ان کو اتنا جواب کافی ہے کہ ہم تو یہ افیون کھا کر برباد ہو گئے آپ نے تو یہ افیون نہیں کھائی ہے، اس لیے آپ ہی کچھ کر کے دکھائیں؟ میں آپ کو یہ بات بتادوں کہ دراصل یہ شوشہ مولانا مودودی کا چھوڑا ہوا ہے- میں تو ان متصوفین کے بارے میں جتنا جانتا ہوں اتنا کوئی نہیں جانتا اس لیے کہ میں گھر کا بھیدی ہوں اور مثل مشہور ہے ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے'' میری نظر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت امیر خسرو، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور ان جیسے دیگر بزرگوں کی زندگی ہے جسے ہم تصوف سمجھتے ہیں-

سوال:- کیا مدارس کے نصاب میں علم تصوف کی شمولیت ضروری ہے؟

پروفیسر نثار احمد فاروقی:- دیکھیے! تصوف کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس طرح پولیس کی کوئی ٹریننگ ہوتی ہے اس طرح اس کی بھی ٹریننگ دی جائے یہ تو آدمی کے اندر باطنی تجسس ہوتا ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کے جو روحانی تقاضے ہیں ان کو کسی شیخ یا کتابوں کے مطالعہ یا کسی اور ذریعہ سے پورا کرے- ہاں! آپ اتنا کر سکتے ہیں کہ سماجی علوم کے تحت باقاعدہ اسے ایک سبجیکٹ بنادیں کہ یہ جغرافیہ ہے، یہ تاریخ ہے اور یہ تصوف ہے تاکہ اس

سے معلوم ہو کہ صوفیہ کون ہیں، ان کی تاریخ کیا ہے، سماج میں ان کا رول کیا ہے، ان کے اثرات کیا ہیں، ان کا فلسفہ اور ان کا نظریہ حیات و کائنات کیا ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن اس طرح سے تصوف کو نصاب میں داخل کر کے اور طلبہ کو مدرسے سے پڑھا کر آپ درویش یا صوفی پیدا کر لیں گے، ایسا ممکن نہیں ہے-

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

پروفیسر نثار احمد فاروقی:- آج عام طور سے رسائل و جرائد کی نظر ماضی پر ہے، مستقبل کی طرف کوئی نہیں دیکھ رہا ہے، مجھے خوشی ہے کہ ماہنامہ جام نور ان رسائل سے مختلف ہے اس لیے میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ اس طرف مزید توجہ دیں اور ماضی کی بجائے مستقبل پر نظر رکھیں کہ موجودہ حالات کیا ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے- آپ اس قول کو نظر میں رکھیں جیسا کہ کسی عربی شاعر نے کہا ہے کہ:

وَكَيْفَ تَنَامُ الطُّيُوْرُ فِيْ وُكُنَاتِهَا
وَقَدْ نُصِبَتْ بِالْفَرْقَدَيْنِ الْحَبَائِلُ

(جب چاروں کھونٹ پہ جال بچھا دیے گئے ہیں تو پرندے اپنے گھونسلوں میں کیسے سو سکتے ہیں-) لہٰذا آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کہاں کہاں جال بچھے ہوئے ہیں، خواب غفلت میں نہیں رہنا چاہیے- □□□

(شمارہ ستمبر ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر نزہت فاطمہ

برصغیر کے مقتدر خانوادہ فرنگی محل لکھنو کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون

دارالعلم والعمل فرنگی محل لکھنو ایسا فقید المثال خانوادہ ہے جس کا فیضان علم و روحانیت پچھلی پانچ صدیوں سے برصغیر کے چپے چپے پر سحاب رحمت کی طرح برس رہا ہے- پچھلی پانچ صدیوں میں متحدہ ہندوستان کے اندر جتنے بھی علما پیدا ہوئے ان کی اکثریت براہ راست یا بالواسطہ اسی خاندان کی فیض یافتہ رہی ہے- فرنگی محل لکھنو علم معقولات کی اشاعت کے حوالے سے معروف رہا ہے، لیکن سچائی یہ ہے کہ معقولات اور روحانیت میں بھی اس درس گاہ علم و عمل اور خانوادے کو یکتائی حاصل رہی ہے- اسی مقتدر خانوادے کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ڈاکٹر نزہت فاطمہ ہیں جو امام وقت علامہ قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے، داماد اور جانشین مولانا قطب الدین عبدالوالی کی پوتی ہیں- موصوفہ نے ابتدائی دینی تعلیم گھر کے بزرگوں سے ہی لی، فارسی اور اردو زبانوں میں عبور حاصل کیا اور پھر اعلیٰ عصری تعلیم کے لیے معاصر درسگاہوں کا رخ کیا، جس کے نتیجے میں لکھنو یونیورسٹی سے انھیں فارسی ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ کی گئی- اب تک وہ متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کر چکی ہیں، جن میں چند کے نام یہ ہیں: مولانا عبدالباری فرنگی محلی: حیات و خدمات، لبیک اللّٰھم لبیک (سفرنامہ حج)، صالحہ عابد حسین: بحیثیت ناول نگار، دبے پاؤں (سوانحی خاکے)، چلمنوں کی بستی (افسانوں کا مجموعہ) اور خواجہ حیدر علی آتش: حیات اور ادبی خدمات- ان کے علاوہ متعدد فارسی کتابوں کا ترجمہ بھی آپ نے کیا ہے، ان میں الاسرار العالیہ فی مناقب الوالیہ اور انوار حق اہم ہیں-

سوال:-آپ کا خاندانی اور تعلیمی پس منظر کیا ہے؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-میاں! اس کے لیے تو صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ:

نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

ہمارا خاندان انصار کے مشہور بزرگ حضرت عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد ہے، وہ ''پیر مہران'' کے نام سے مشہور ہیں، اس کے بعد یہ خاندان ہندوستان آیا اور کئی حصوں میں بٹ گیا- بہر حال طویل عرصہ کے بعد ملا قطب الدین شہید کے اجداد نے سہالی میں سکونت اختیار کی- قطب شہید کو بچپن میں ان کے نانا حضرت شاہ حمید ابدال کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے تو حضرت نے فرمایا ''افوہ! اس بچے کے پیٹ میں اتنا علم بھرا ہے کہ تا قیامت اس کی اولاد میں یہ علم باقی رہے گا-''

حضرت حمید ابدال کی دعا کی برکت اور ان کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی، ملا قطب پڑھ لکھ کر عالم و فاضل یگانہ ہوئے- ملا قطب کے اجداد کو بادشاہ اکبر نے سہالی میں کچھ زمین دی تھی، جس سے وہاں پڑھائی کا کام جاری رہے اور طالب علموں کی روزی روٹی کا سبب بھی بنے- اس فرمان کی کاپی ہمارے یہاں محفوظ ہے- ملا قطب شہید بھی خاندانی روایت کے طور پر سہالی میں مدرسہ چلاتے تھے اور درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے- ان کی علمی قابلیت اتنی زیادہ تھی کہ دور دور سے طلبہ آ کر درس میں شرکت کرتے تھے، یہ بات دوسرے خاندانوں کے حسد کا سبب ثابت ہوئی اور عثمانی خاندان کے لوگوں نے ملا قطب شہید کے گھر پر اس وقت دھاوا بولا، جب وہ درس میں مشغول تھے- خود ملا صاحب شہید ہوئے ساتھ ہی ان کے خالہ زاد بھائی اور کچھ طالب علم بھی ان کے ساتھ شہید ہو گئے- ظالموں نے ملا صاحب کے گھر میں آگ لگا دی، کتب خانہ جلا دیا، ملا نظام الدین کو پکڑ کر لے گئے- ملا نظام الدین اس وقت بہت ہی کم سن تھے- بہر حال بڑی مشکل سے ملا نظام الدین کو چھوڑ دیا اور ملا قطب شہید کی لاش لے کر فرار ہو گئے، بعد میں ان کی لاش ملی جسے سہالی میں دفن کیا گیا-

ملا قطب صاحب کے چار صاحبزادے تھے- بڑے بیٹے ملا اسعد، دوسرے بیٹے ملا سعید، تیسرے بیٹے ملا رضا اور چوتھے بیٹے ملا نظام الدین تھے- بڑے دونوں صاحبزادے ملا اسعد اور ملا سعید اورنگ زیب سے وابستہ تھے- کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں ابدال تھے- اورنگ زیب ان کو اپنے ساتھ شامل رکھنا باعث برکت سمجھتا تھا- قطب الدین شہید کے قتل کی خبر جب ان دونوں بڑے بھائیوں کو ہوئی، اس وقت اورنگ زیب دکن کی مہم پر تھا- بہر حال ملا سعید وہاں سے واپس ہوئے اور انہوں نے ایک محضر لکھا جس پر اکابرین عالم کے دستخط تھے اور شہادت کا واقعہ بیان کیا (یہ محضر ہمارے یہاں موجود ہے) اس کے بعد اورنگ زیب نے ایک فرمان جاری کیا، جس کی رو سے لکھنؤ کے محلّہ ''چراغ بیگ'' میں ایک حویلی جو فرانسیسی تاجروں کے قبضہ میں تھی، جہاں پر رہ کر وہ لوگ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے- چونکہ اس زمانے میں ہر گورے کو فرنگی کہتے تھے، اس وجہ سے یہ حویلی فرنگی کی حویلی کے نام سے مشہور ہوئی، بعد میں اس کو فرنگی محل کہا گیا-

اس ''چراغ بیگ'' محلے میں ملا قطب شہید کی اولاد نے کیسے کیسے چراغ روشن کیے یہ دنیا جانتی ہے-

ملا قطب شہید خود ملا صدر الدین قاضی گھانسی کے خلیفہ خاص اور مرید تھے- یہ قاضی گھانسی مرید اور خلیفہ تھے حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی کے- ملا قطب شہید کے بڑے دونوں بیٹے ملا اسعد اور ملا سعید خود اپنے والد محترم ملا قطب کے مرید اور خلیفہ تھے-

ملا سعید نے محضر جو بادشاہ کو پیش کیا، اس کے بعد ان کا خاندان وہاں سے منتقل ہو کر یہاں آباد ہو گیا- اورنگ زیب کا فرمان جو فرنگی محل کے سلسلے میں ملا تھا، وہ ہمارے گھر میں آج تک موجود ہے-

ہمارا تعلق ملا سعید سے اس طرح ہے کہ ان کے بیٹے ملا احمد عبدالحق تھے جو ملا نظام الدین کے سگے بھتیجے اور ملا بحر العلوم کے سگے چچازاد بھائی تھے- ملا سعید کے بیٹے ملا احمد عبدالحق حضرت سید السادات سید شاہ عبدالرزاق بانسوی قبلہ کے مرید اور خلیفہ تھے- حضرت ملا نظام الدین انہیں سید السادات کے حلقہ بدوش ہوئے- خلافت و اجازت سے سرفراز

فرمائے گئے- سیدالسادات خود بانسہ شریف ہی رہتے تھے- جب ملا نظام الدین صاحب وہاں جانے کا ارادہ کرتے تو سید صاحب قبلہ فرماتے تھے "وہ لوگ آرہے ہیں جو مومن ہیں اور انہوں نے نیک کام کیے ہیں- ملا نظام الدین کے بارے میں خود اندازہ کیا جاسکتا ہے جن کے پیر اپنے مرید پر اس قدر کرم فرما ہوں- کبھی کبھی سید صاحب فرماتے تھے ولی خدا دیوار کے پاس بیٹھا ہے- دیکھا جاتا تو ملا نظام وہاں بیٹھے نظر آتے- ملا نظام الدین اور ملا احمد عبدالحق متبحر عالم و فاضل ہونے کے باوجود ایک ایسے شیخ سے وابستہ ہوئے جنھوں نے ظاہری طور پر ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا، اس وجہ سے لوگ حیران ہوگئے- ملا صاحب فرماتے تھے کہ میں کیا بتاؤں میں نے ان میں کیا دیکھا-

ملا عبدالحق کے بیٹے مولوی انوارالحق تھے، جن کے نام سے باغ مولوی انوار موسوم ہے- یہ ہمارا خاندانی قبرستان ہے، اس کے لیے حسرت موہانی نے کہا تھا:

تا قیامت رہے قائم میری سرکار کا باغ
وہ جسے کہتے ہیں سب حضرت انوار کا باغ

ان مولوی انوارالحق کے کئی بیٹے تھے، ہمارا تعلق ان کے بیٹے ملا علاءالدین سے ملا- علاءالدین کے بیٹے ملا جمال الدین ہوئے (ان دونوں کے مزار مدراس میں ہیں) ان کے بیٹے مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی تھے- ان کے بیٹے مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی تھے- مولانا عبدالوہاب کے دو بیٹے تھے، بڑے بیٹے مولانا عبدالرؤف اور چھوٹے بیٹے مولانا عبدالباری تھے-

مولانا عبدالرؤف کا انتقال عین جوانی میں ہوا، ان کی دو اولادہوئیں ایک بیٹی اور صاحبزادے مولانا قطب میاں تھے- یہ میرے دادا تھے-

مولانا عبدالباری کے سترہ اولادیں ہوئیں، ان میں سے صرف تین اولادیں زندہ رہیں، ایک بڑی بیٹی فاطمہ کبریٰ چھوٹی بیٹی فاطمہ صغریٰ اور ایک صاحبزادے مولانا جمال الدین عبدالوہاب ہوئے جو اس وقت کراچی میں سکونت پذیر ہوئے- میرے دادا مولانا قطب میاں کی شادی ان کے چچا حضرت مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی صاحبزادی

فاطمہ کبریٰ بی بی سے ہوئی- فاطمہ صغریٰ بی بی کی شادی بھی خاندان میں ہوئی- وہ انتہائی قابل تھیں، انہوں نے تعلیم گھر میں حاصل کی، ان کی یادگار ان کی کتاب "کلام صغریٰ" ہے جسے ان کے سگے بھائی مولانا جمال میاں نے شائع کیا- مولانا جمال میاں کے چار صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہیں جو سب دینی معلومات کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں-

میری دادی فاطمہ کبریٰ بی بی تھیں (جو مولانا عبدالباری کی بڑی بیٹی تھیں) اور میرے دادا حضرت مولانا قطب الدین عبدالوالی تھے جو مولانا عبدالباری کے سگے بھتیجے اور داماد تھے- ان دونوں کے یہاں دولڑکے پیدا ہوئے مولانا محمد سعید عبدالرزاق اور مولانا محمد نور عبدالعلی- یہی مولانا نور عبدالعلی میرے والد تھے، ان کا انتقال جوانی میں ہوگیا- میں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا، میری ایک سگی بہن لندن میں ہیں، ان کے دو بچے ہیں، ایک لڑکی ارم فاطمہ جس نے لندن میں پڑھائی پوری کی پھر اسے جامعہ ازہر سے وظیفہ ملا اور وہ وہاں عربی کا کورس کرنے گئی اور میرا بھانجا لندن میں چارٹرا کاؤنٹنٹ ہے، اس نے وہاں سے C.A کیا ہے-

مولانا محمد سعید عبدالرزاق کی دو بیٹیاں ہوئیں: نزہت فاطمہ جو لندن میں ہیں اور دوسری رفعت فاطمہ علی گڑھ میں ہے-

حضرت مولانا عبدالباری نے اپنی بیٹی کے انتقال کے بعد اپنے داماد اور سگے بھتیجے مولانا قطب میاں کی شادی مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی کی بیٹی سے کی، ان بیوی صاحبہ سے اولادیں ہوئیں، لیکن صرف ایک لڑکے مولانا محمد جلال الدین عبدالمتین ہوئے جو میرے چھوٹے چچا ہیں-

مولانا عبدالباری نے اپنے بعد اپنا جانشین قطب میاں کو بنایا، ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے مولانا محمد سعید عبدالرزاق ان کے سجادہ ہوئے- مولانا محمد سعید عبدالرزاق عرف عام میں محمد میاں کہلائے، ان کے وصال کے بعد میرے چھوٹے چچا مولانا جلال الدین عبدالمتین صاحب سجادہ ہیں، وہ درس نظامی کے فارغ ہیں- چونکہ وہ اپنے بڑے بھائیوں سے کافی چھوٹے ہیں، اس لیے انہوں نے اپنے بھائیوں اور دیگر لوگوں سے تعلیم حاصل کی،

میرے چچا جان فارغ درس نظامی ہیں اور جدید تعلیم سے آراستہ بھی- اس وقت مولانا عبدالباری اور مولانا عبدالرؤف کی اولاد میں میرے چچا جان مولانا متین میاں ہی خود اور میری بہن رفعت فاطمہ ہی صرف ہندوستان میں ہیں- میں اور چچا جان دونوں اپنے آبائی گھر فرنگی محل میں ہی مقیم ہیں-

سوال:-آپ اپنی علمی اور قلمی خدمات کے بارے میں کچھ فرمائیں؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-میاں! آپ نے تعلیم کے بارے میں پوچھا ہے- میں کیا اور میری اوقات کیا؟ اصلی طور پر تعلیم کہاں سے ہوئی یہ بتانا مشکل ہے، یاد کرنا پڑے گا، مجھے یاد نہیں کہ کب مجھے قرآن شریف پڑھایا گیا، ہاں جب قرآن شریف ختم ہوا تو خوب روپے ملے، لچکے کے کپڑے پہنے یہ یاد ہے- میری دوسری دادی یعنی متین میاں صاحب قبلہ کی والدہ نے ہم بہنوں کو اردو اور قرآن شریف کی تعلیم دی-ختم قرآن کے بعد فرمایا تھا ''قرآن کبھی ختم نہیں ہوتا ہے-'' میری دوسری دادی کافی تعلیم یافتہ تھیں- عالم کی بیٹی عالم کی بہن عالم کی بہو عالم کی بیوی اور عالم کی ماں تھیں- اس وجہ سے عربی فارسی کی بہت اچھی معلومات رکھتی تھیں- منکسر المزاج، سادگی پسند اور عبادت گزار تھیں- علمی ذوق ان کا اپنا تھا کہ ہم ان کے پاس دوپہر کو لیٹے ہوتے تھے اور وہ گنگناتی تھیں ''بشنو از نے چوں حکایت می کند'' ہماری سمجھ میں نہیں آتا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ پاتے تھے، مگر ان کی لے بہت اچھی لگتی تھی، میری دادی کو ان کی سگی پھوپھی اور ساس یعنی مولانا قطب میاں کی والدہ نے عربی فارسی اور اردو پڑھائی تھی- مولانا قطب میاں کی والدہ نے عربی اور فارسی کتب کا ترجمہ بھی کیا تھا- اس دور میں یہ بات ناممکن تھی-

ہمارے گھر کی عجیب بات رہی، جسے میں شکوہ یا شکایت نہیں سمجھتی لیکن افسوس ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی گئی، جس نے خود سے پڑھ لیا پڑھ لیا، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ تم نے پڑھا یا نہیں پڑھا- ہم کافی چھوٹے تھے، تب دادی صاحبہ نے ہم لوگوں سے میلاد شریف پڑھوایا، اس وقت صرف ''**طلع البدر علینا**'' زبانی یاد تھا- وہ پڑھتے تھے اور ہماری دادی مٹھائی بانٹنے کے بعد اس کے بارے میں سمجھاتی تھیں-

تھوڑے دن کے بعد انہوں نے مسدس حالی نکال کر دی اور کہا میلاد شریف میں پڑھو، ہم لوگوں نے کہا روایت کہاں سے پڑھیں- انہوں نے فرمایا مسدس ہی کافی ہے- پھر بعد میں سمجھایا کہ مسدس پڑھنا اور اگر اس پر عمل کر سکو تو یہی اصلی اسوۂ حسنیٰ ہے-

۱۹۵۴ء میں ہمارا نام کشمیری محلّہ گرلس انٹر کالج میں پہلے درجہ میں لکھوایا گیا، جہاں آٹھویں جماعت تک اردو کی تعلیم کا کوئی بند و بست نہیں تھا- لکھنؤ میں تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج بھی تھا، جہاں پہلے درجہ سے اردو پڑھائی جاتی تھی، لیکن وہاں ہمارے خاندان کے مریدوں کی لڑکیاں خاص کر خواجگان کی صاحبزادیاں پڑھاتی تھیں- ہماری دادی کا خیال تھا کہ وہ ہم لوگوں کے ساتھ بیجا مروت کریں گی اور ہم لوگ پڑھنے کے بجائے آرام سے بیٹھیں گے-

کشمیری محلّہ میں جب ہم نویں درجہ میں آئے تب ہم نے اردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لی، ہماری ساری تعلیم ہندی میڈیم سے ہوئی- اس وقت ہمارے ساتھ کی مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں نے اردو کے بجائے سنسکرت لی، کیوں کہ وہ لوگ ا-ب-بھی نہیں پڑھی تھیں اور امتحان میں اچھے نمبر لانا چاہتی تھیں- اس وجہ سے اردو میں بہت کم ایڈمیشن ہوئے- ہمارا معاملہ یہ تھا کہ اس وقت تک ہم گھر میں مرأۃ العروس، شریف زادہ، مسدس حالی، امراؤ جان، آمنہ کا لال اور میلاد اکبر پڑھ چکے تھے، اس وجہ سے کوئی مشکل نہیں پیش آئی، بہت معمولی کورس تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، جگرؔ، حسرتؔ، مجذوبؔ وغیرہ کا کلام کسی نہ کسی کی زبان پر رہتا تھا، جس کے نتیجے میں اشعار بہت اچھے یاد ہو گئے جو آگے بہت کام آئے-

بیت بازی کی وجہ سے بہت فائدہ ہوا، اس کے علاوہ ہماری دادی نے ہم لوگوں کو رجب، شب برأت، رمضان ان سب کی اہمیت بتائی، رجب کی نمازیں، شعبان کی نمازیں، عاشورہ کی نمازیں، رمضان کی نمازیں، شب قدر کی اہمیت، شب معراج کی تفصیل یہ ہم نے بعد میں بڑے ہونے کے بعد پڑھی، یہ سب ہم اپنی دادی سے سیکھ چکے تھے-

ہماری دادی نے تمام مذہبی مسائل جو ایک لڑکی کو معلوم ہونا چاہیے وہ سمجھائے-

بقرعید کا چاند ہوتے ہی وہ فرماتی تھیں کہ اب ناخن قربانی کے بعد ہی کاٹنا یہ باتیں بچپن سے ذہن نشین ہوگئی- احادیث سناتی تھیں، یہ فرمایا کہ بے دھڑک حضور کا فرمان مبارک نہ بیان کر دینا نہیں تو تہمت کا الزام لگے گا-

بہر حال ہائی اسکول اور انٹر کشمیری محلّہ سے کیا- اس زمانے میں سینٹ جانسن ایمونس بریگیڈ کے کمپٹیشن ہوتے تھے، جس میں ہوم سائنس اور فرسٹ ایڈ سکھائی جاتی تھی، یہ کمپٹیشن ہم نے کئی بار جیتے، ایک بار اسٹیٹ کمپٹیشن میں ٹاپ کیا- اس میں گولڈ میڈل ملا اور میرٹ سرٹیفکیٹ ملا- کشمیری محلّہ انٹر تک ہی تھا اس کے بعد ہمارا داخلہ کرامت کالج میں ہوا، وہاں سے ہم نے ۱۹۶۸ء میں بی اے کیا، جس میں ہماری فرسٹ ڈویژن اور پانچویں پوزیشن آئی اور تینوں سبجیکٹ میں ڈسٹنگ شن ملا اور یوپی سی بھی ملا- خوشی تو بہت ہوئی مگر یہ ڈر بھی تھا کہ ہم پردہ کرتے تھے یونیورسٹی کیسے جاتے؟

ہمارے والد کا بچپن میں انتقال ہوگیا تھا ہم نے ان کو دیکھا بھی نہیں تھا- ہمارے چچا جان گارجین تھے- امی یونیورسٹی جانے کی سخت مخالف تھیں- انہوں نے کہا بھائی صاحب آپ کیا کر رہے ہیں- سخت بدنامی ہوگی، مگر جب ہم نے آنسو بھری آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے ہم کو لپٹا لیا- پیار کیے اور کہا تم ضرور پڑھنے یونیورسٹی جاؤ اور ہما ری امی سے کہا علم کی راہ میں روڑہ نہیں اٹکانا چاہیے- اس طرح ہم نے ۱۹۷۰ میں ایم اے کیا- اس میں ہماری فرسٹ پوزیشن اور فرسٹ ڈویژن آئی -لکھنا لکھانا آج تک نہیں آیا صرف اتنا تھا کہ کرامت حسین کالج میں میلاد شریف ہوتا تھا، اس میں لڑکیوں کو خود مضمون لکھ کر پڑھنا ہوتا تھا- ہم کو جو ٹاپک ملا تھا وہ تھا 'روز جزا' اس مضمون کے لیے ہم نے کئی کتابیں پڑھ کر مضمون تو تیار کرلیا، کالج میں پڑھ بھی دیا- تعریف بھی ہوئی، مگر ہم دو راتیں سو نہیں سکے، قیامت کے بارے میں سوچتی تھی تو بیدار ہو جاتی تھی-

اس کے بعد میری شادی ۱۹۷۲ء میں سندیلہ کے جناب عبدالرب عرفان سے ہوئی- وہ خود ایم اے آنرس اور ایل ایل بی ہیں- انہوں نے کتابوں کے سلسلے میں بہت مدد کی، کتابیں چھپوائیں اور سب سے مشکل کام پروف ریڈنگ تھا، وہ کیا-

یوں الٹا سیدھا لکھنے لگے، میں نے فارسی کی باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی، لیکن عرس میں قوالیاں ہوتی ہیں، جس میں:

''جہاں روشن است از جمال محمدؐ''

وغیرہ سن کر شد بد ہوگئی-

میں نے باقاعدہ فارسی کی تعلیم نہیں حاصل کی، لیکن چچا جان قبلہ کی بدولت تھوڑی سی سمجھ میں آجاتی ہے، اس کی برکت سے دو فارسی کتابوں کے ترجمے کیے، ایک اسرار العالیہ فی مناقب الوالیہ اور ''اعفان العربیہ'' ان دونوں کتابوں کا ترجمہ کرتے وقت چچا جان صاحب نے مشکلات سلجھائیں اور بہت مدد کی، ہم نے افسانے، خاکے اور دیگر مضامین لکھے ہیں جو مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں-

ڈھائی سال پیشتر کراچی میں حسرت موہانی سیمینار ہوا تھا، اس میں ہم کو مدعو کیا گیا تھا- حسرت صاحب میرے خاندان میں مرید تھے- ان کا مزار باغ مولوی انوار میں ہے- ہندوستان سے پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر خلیق انجم، شاعر شاد صاحب اور یہ ناچیز بلائی گئی- میرے مضمون کا عنوان تھا ''حاصل ہے مجھ کو فضل نمایان اولیا'' (جو خود میں نے چنا تھا) وہاں ہمیں ایوارڈ دیا گیا اور کتابیں بھی انعام میں ملیں-

چند سال پیشتر میں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا- کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، صرف ایک بچکانا شوق تھا- اپنے نام کے آگے ڈاکٹر لکھنے کا سو وہ پورا ہوگیا- علم کے نام پر کشکول خالی ہے-

سوال:- فرنگی محل کی عظمت رفتہ اور علمائے فرنگی محل کے امتیازات کے حوالہ سے گفتگو پسند فرمائیں گی؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:- یہ بڑا تکلیف دہ سوال ہے- ہمارا تو برا حال ہے کہ.....ع

تھے تو آباء وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو؟

فرنگی محل کے بارے میں پروفیسر رابن نے ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے، وہ پڑھ لیجیے-

سوال :-اسلام اور سنیت کی اشاعت میں علمائے فرنگی محل کی خاص خدمات کیا رہی ہیں؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-مولانا عبدالباری کے دادا حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی نے یہاں با قاعدہ میلاد شریف کی بنیاد ڈالی، اس سے پہلے لکھنؤ میں میلاد شریف نہیں کے برابر ہوتے تھے-مولانا عبدالرزاق سلام و قیام کے پابند تھے-وہ جب کسی کو مرید کرتے تھے تو اس سے پوچھ لیتے تھے کہ وہ اہل سنت و جماعت میں سے ہے اور حنفی ہے یا نہیں؟ ان کے یہاں سنت کا پابند ہونا لازمی شرط تھی-

لکھنؤ میں شیعہ حکومت کی طرف سے کئی بار پریشان کیا گیا-اکثر قصبات میں تفضیلی پیدا ہو گئے مگر ہمارا خاندان خدا کا شکر ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولیت اور فضیلت کا قائل ہے- مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی نے مختلف رسالے لکھے جو قلمی ہیں-ایک رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بہت تفصیل کے ساتھ لکھا جس کو ربیع الاول میں بارہ دن ہمارے یہاں پڑھا جاتا تھا اور اس طرح پڑھا جاتا تھا کہ ولادت شریف کا بیان گیارہویں تاریخ میں ہوتا تھا-

اس کے علاوہ انھوں نے صحابۂ کرام کے بارے میں رسالے لکھے- پہلا رسالہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ہے دوسرا رسالہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ہے-تیسرا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ہے چوتھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں ہے اب تک ان بزرگوں کی وفات یا شہادت کے دن یہ رسالہ پڑھا جاتا ہے-لوگ تشریف لاتے ہیں اور شیرینی تقسیم ہوتی ہے-

اس کے علاوہ حضرات حسنین کے بارے میں دو رسالے ہیں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن ان کے بارے میں اس رسالے سے بیان ہوتا ہے-

محرم میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بیان دس دن ہوتا ہے-ساتویں تاریخ کو شربت پر فاتحہ ہوتا ہے اور ایک گلاس دودھ پر حضرت علی اصغر رضی اللہ عنہ کا فاتحہ ہوتا ہے-عاشورہ کے روزے رکھے جاتے ہیں-دعائے عاشورہ اور نمازِ عاشورہ پڑھی جاتی ہے-

ربیع الثانی میں حضرت مولانا عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کے لکھے ہوئے گیارہ رسالے ہیں جو گیارہ دن پڑھے جاتے ہیں-شیرینی تقسیم ہوتی ہے-ہم لوگ جب کسی مشکل میں پڑ جاتے ہیں تو پیرانِ پیر دستگیر کا توشہ مانتے ہیں، منت پوری ہو جانے پر توشہ کرتے ہیں-

گیارہ ربیع الثانی کو ہمارے یہاں توشہ بنتا ہے اس پر حضرت پیرانِ پیر کا فاتحہ ہوتا ہے ساتھ ہی ''یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ'' پڑھنے کی تاکید ہے-یہ سب ابھی تک اسی طرح ہوتا ہے جیسا پہلے ہوتا تھا-اب عقائد میں ہی لوگوں کی کمی ہو گئی ہے لیکن خدا کا شکر ہے ہمارا گھر اپنے عقائد پر قائم ہے-ہم لوگ چشتی قادری ہیں اور بزرگوں کی روحانیت کے توسل پر یقین رکھتے ہیں-خود ہمارے گھر میں دو عرس ہوتے ہیں جن میں اندور، اجین، اجمیر شریف، حیدرآباد وغیرہ کے لوگ آتے ہیں- اجمیر شریف کے بہت سے خدام ہمارے یہاں کے مرید ہیں-

خود ہم لوگ بانسہ شریف عرس میں حاضر ہوتے ہیں اور حضرت سید السادات سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت کے طفیل بہت سی چیزوں سے سرفراز ہوتے ہیں-اس کے علاوہ ردولی شریف حاضر ہوتے ہیں اور اجمیر شریف حاضر ہوتے ہیں وہاں باطنی طور پر کیا حاصل ہوتا ہے اس کا علم خداوند قدوس کو ہوگا لیکن ظاہری طور پر سکون قلب کی دولت اور اپنے اندر ایک نئی تازگی محسوس کرتے ہیں- یہاں جو کچھ لکھا ہے اپنے گھر کے بارے میں لکھا ہے پورا فرنگی محل ضروری نہیں کہ ان باتوں کا پابند ہو-

سوال :-مولانا محمد علی جوہر اور ان کے شیخ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے درمیان بعض نظریاتی اختلاف تھے، اس کی حقیقت کیا ہے؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حضرت عبدالباری رحمۃ اللہ علیہما میں عقائد کے سلسلے میں کبھی کوئی اختلاف نہیں تھا-اختلاف اس وقت پیدا ہوا جب سعودی حکومت نے اس کا اظہار کیا اور کہا کہ سعودی موتمر عالم اسلامی کے ماتحت حجاز میں حکومت قائم کریں گے ایسے وقت میں محمد علی نے ان کا ساتھ دیا تھا-مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ سمجھتے تھے کہ سعودی حکومت کے عقائد بالکل الگ ہیں جنہیں وہ یہاں پھیلا رہی ہے اور اس

وقت کی مولانا عبدالباری کی پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی -مولانا محمد علی جب مکہ شریف گئے تو سعودی حکومت اس خیال کو تو رد کر دیا کہ کوئی عالمی حکومت قائم کرے اس سے محمد علی کو اندازہ ہوا کہ مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کا موقف بالکل صحیح تھا- حجاز سے مولانا محمد علی جب واپس آئے ان کے لکھنؤ آنے سے پہلے اچانک باری میاں کا وصال ہو گیا تو سیدھے اسٹیشن سے باغ مولوی انوار گئے جہاں حضرت کا مزار شریف ہے، وہاں روتے روتے بے ہوش ہو گئے اور یہ بھی عرض کیا کہ حضور آپ کا مجرم حاضر ہے- پھر گھر آ کر باری میاں کے سجادہ نشیں مولانا قطب میاں کو نذر پیش کی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا-

سوال :-فرنگی محل کے کھنڈرات میں جو چنگاریاں دبی ہیں وہ دوبارا شعلہ زن ہو سکیں گی؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-اس کا جواب یہ ناچیز یوں پیش کر رہی ہے-

تدبیر سنبھلنے کی نہیں کوئی ہمارے
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

سوال:-فرنگی محل کی علمی و دینی قیادت کن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور ان کی موجودہ سرگرمیوں سے آپ کہاں تک متفق و مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-میاں! میں ایک جاہل عورت ہوں- یہ سوال آپ علمائے فرنگی محل سے پوچھیے مجھ سے نہ پوچھیے، مجھے شہادت کا شوق نہیں ہے-

سوال:-اپنے ماضی کے مطالعہ سے آپ کن کیفیتوں سے نبرد آزما ہوتی ہیں؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-اس کے بارے میں کافی تفصیل سے تحریر کر چکی ہوں-

سوال :-آج اہل سنت کے کینوس پر علمائے فرنگی محل کی تصویریں بہت مدھم نظر آتی ہیں، آخر اس کی وجوہات کیا ہیں؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:- دنیا میں خاندان کا نام مشہور ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہر آنے والی نسل کے سر پر تاج رکھ دیا جائے-

میں تصدیق سے کہتی ہوں کہ خاندان فرنگی محل کے گریجویٹ لڑکے بھی اردو نہیں پڑھ

سکتے ہیں، لکھنا تو دور کی بات ہے-

''آج کچھ دل میں مرے درد سوا ہوتا ہے''

سوال :-فرنگی محل کی موجودہ نسل اپنے اسلاف کی گراں قدر علمی خدمات کو منظر عام پر لانے اور ان کے علوم و معارف کی اشاعت کے سلسلہ میں کتنی فکر مند ہے اور اس کے لیے کیا اقدامات کیے جا رہے ہیں؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-جب تک کوئی ٹھوس کام سامنے نہیں آئے گا تب تک دوسرے لوگ کہاں تک برداشت کریں گے-

سوال :-فرنگی محل مرکز معقول و منقول کے علاوہ مرکز روحانیت بھی رہا ہے اور یہاں سے باقاعدہ کئی سو سال تک سلسلۂ بیعت و ارشاد جاری رہا، مگر کیا وجہ ہے کہ اس کی شہرت صرف معقولی درس و تدریس کے حوالے سے باقی رہ گئی اور اس کی خانقاہی حیثیت پس پردہ چلی گئی؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-روحانیت کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کا فیض اللہ کے کچھ خاص بندوں پر ہوتا ہے-

سوال:-قارئین جام نور کو آپ کا کوئی پیغام یا مجلس ادارت کو کوئی مشورہ؟

ڈاکٹر نزہت فاطمہ:-میں بہت عاجزی کے ساتھ عرض کرتی ہوں کہ آپ لوگ کوشش کریں کہ مسلمان لڑکے لڑکیاں اردو ضرور پڑھیں- اردو نہیں پڑھیں گے تو انھیں اپنے خاندانی، مذہبی اور مسلکی سرمائے کے بارے میں کیسے معلوم ہوگا-□□□

(شمارہ اگست ۲۰۱۰ء)

پروفیسر وہاب اشرفی

تاریخ ادبیات عالم کے مصنف، اردو کے ممتاز اسکالر

پروفیسر وہاب اشرفی (۱۹۳۶ء) کا اصل نام سید عبدالوہاب اشرفی ہے- آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے آبائی قصبہ بی بی پور کاکو، جہان آباد بہار کے ایک مدرسہ سے کیا- آپ نے اردو، فارسی اور انگلش تین زبانوں میں ایم اے کیا اور ایم اے اردو اور فارسی میں گولڈ میڈل حاصل کیا، جبکہ پی ایچ ڈی کی تکمیل اردو میں کی مزید یہ کہ آپ ایل ایل بی بھی ہیں- آپ سے قبل آپ کا خانوادہ تصوف و خانقاہ سے منسلک و مربوط رہا ہے، جس کا سلسلہ آپ کے والد کے بعد منقطع ہوگیا- آپ رانچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے پروفیسر، بہار یونیورسٹی سروس کمیشن اور بہار انٹر میڈیٹ کونسل پٹنہ کے چیرمین اور عالمی ترقی پسند مصنفین کے نائب صدر رہ چکے ہیں- آپ کی تین درجن سے زائد اہم تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں- جن میں بالخصوص تاریخ ادبیات عالم، تاریخ ادب اردو، مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات، تیسری آنکھ، تفہیم البلاغت وغیرہ قابل ذکر ہیں- آپ مورخ و ناقد کے ساتھ افسانہ نگار و شاعر بھی ہیں گویا آپ کی ذات مجموعہ کمالات ہے- موصوف کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، بھارتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ بدست شنکر دیال شرما صدر جمہوریہ، صدر جمہوریہ ایوارڈ کے علاوہ دیگر مختلف اردو اکادمی ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے- آپ قومی و بین الاقوامی سطح پر اردو کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی کانفرنسیز، سمپوزیم، سیمینار میں مقرر، مہمان خصوصی اور صدر کی حیثیت سے شریک ہوتے رہے ہیں- موصوف درازی عمر اور خرابی صحت کے باوجود علم وادب، تحقیق وتنقید کی آبیاری میں اب بھی مصروف ہیں-

سوال:- آپ کا خاندانی، علمی اور فکری پس منظر کیا ہے؟

پروفیسر وہاب اشرفی:- میں نے ان امور کی تفصیل اپنی کتاب جو میری سرگزشت ہے ''قصہ بے سمت زندگی کا'' میں درج کردی ہے- دراصل ہمارے اسلاف تصوف کے عوامل سے بہرہ ور ہوکر اپنی زندگی گزارتے رہے تھے- میرے یہاں پیری مریدی کا سلسلہ میرے والد شاہ حاجی امام الدین اشرف تک قائم رہا، لیکن میرے بڑے بھائی عبدالجبار اشرفی نے انگریزی کی راہ اختیار کرلی اور مجھے بھی اس راستے پر رواں دواں کردیا- تقسیم کے بعد حالات ایسے ہوگئے کہ پرانی وضع موقوف ہونے لگی- دراصل میرے یہاں انگریزی تعلیم کا سلسلہ میرے بھائی جان مرحوم ہی سے شروع ہوا- پہلے اردو، فارسی اور عربی کے مطالعے کی صورت مرکزی تھی- میرا رابطہ عربی سے قطعی نہیں رہا بس قرآن کی تلاوت تک محدود رہا- عربی کی اہم کتابیں اردو، فارسی اور انگریزی ترجمے سے پڑھتا- میرے پاس مذہبی کتابوں کا اچھا خاصا سرمایہ ہے، جن کا مطالعہ میرے لیے بڑا خوشگوار ہوتا ہے- پھر نئے حالات نے تصوف کی راہ سے بھی دور کردیا، یہ اور بات ہے کہ میرے یہاں مشرف بہ حج ہونے والے لوگوں میں سبھی تھے- بھائی صاحب بھی اور مجھ جیسا گناہگار بھی، لیکن میں اپنے اسلاف کی راہ سے خاصا بعد رکھتا ہوں جس کا مجھے بہت ملال ہے، لیکن میں نئے حالات کو بدل نہیں سکتا- مجھ سے اور میرے بھائی صاحب سے جو نئی پود سامنے آئی ہے، وہ سب کی سب عربی اور فارسی سے دور ہوگئی ہے- یہ حالات کا جبر ہے- ویسے میں اس کا اظہار کردوں کہ جو روایتی خانقاہی سلسلہ آج بھی ہے وہ تو میرے یہاں کب کا ختم ہو چکا تھا، یہ اور بات ہے کہ میرے والد محترم کے مریدوں کی تعداد کثیر تھی، ان میں پسماندہ طبقے کے لوگ زیادہ تھے، جن کا سلسلہ آج کے چھوٹا ناگپور کے بہت سے علاقے تک پھیلا ہوا تھا-

سوال:- اردو ادب پچھلے سو سالوں میں کتنے مراحل اور تحریکات سے گزرا ہے؟ اور کیا آج مذہبی تحریروں کے لیے ادب میں کوئی جگہ موجود ہے؟

پروفیسر وہاب اشرفی:- پچھلے سو سال کے ادبی حالات کیا رہے ہیں، اس کی تفصیل

پوری ایک کتاب کی متقاضی ہے- کلاسیکیت اور رومانیت کا سلسلہ ایک عرصے تک رہا ہے، جن کے اثرات دور رس رہے ہیں- اردو کے قدیم ادب میں کتنے مراحل اور تحریکات کا گزر ہوا ہے، وہ تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں، میری ''تاریخ ادب اردو'' میں بھی- یہاں مجھے کہنا یہ ہے کہ نئے حالات ترقی پسندی سے شروع ہوئے- مارکسی اثرات نے جڑ پکڑنا شروع کیا اور روس کا عظیم انقلاب پوری دنیا کے ادب پر اثر انداز ہوا- مارکس، لینن اور اینگلز کے فلسفیانہ فکر و نظر نے نئی صورتیں پیدا کیں- استحصال کرنے والی طاقتوں کو کچلنے کے لیے ادیبوں کو بھی ایک پس منظر مل گیا- طبقاتی نظام پیدا کرنے والے اور مذہب کے راستے سے استحصال کرنے والے بھی زد میں آئے- نچلے طبقے کی بے سرو سامانی دانشوروں کی نظر کا مرکز بن گئی- اجتماعی زندگی پر زور دیا جانے لگا اور استحصال کے خلاف عمومی نعرے کو ادب میں بھی جگہ دی جانے لگی- اسے عوام تک لے جانے کے لیے ادب کے امور کو بھی قدرے سطحی بنانے کی از خود صورت پیدا ہوگئی جو بعد میں پروپیگنڈے کی شکل اختیار کرنے لگی- کانفرنسوں اور منشوروں کے تحت ادیب اور شاعر اپنی تخلیق کو ویسی ہی جہت دینے لگے جو عوام پسند تھی- اردو میں کچھ زیادہ ہی غوغا کی کیفیت پیدا ہوگئی- داخلیت سے رشتہ توڑ لیا گیا ہے- جمالیات کے بہت سے رخ پر بعضوں نے پہرہ بٹھانے کی کوشش کی، لیکن جو پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہوئے، پھر بھی مارکسی یا ترقی پسند رہے، وہ معتدل بھی رہے اور ادبی کاوشوں کو ایک خاص رنگ میں پیش کرنے کی سعی مستحسن کرتے رہے- گویا ترقی پسند تحریک کو بھی کئی طرح کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے واسطہ رہا، یہاں نام گنوانے کی ضرورت نہیں- سارے امور لوگوں پر روشن ہیں، لیکن ہوا یہ کہ ترقی پسند تحریک کی بھیمڑی کانفرنس کے بعد خود ترقی پسندوں کے کئی حلقے بن گئے اور تنازعات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا- تب وہ گروہ پیدا ہوگیا جس نے ترقی پسندی کی تمام راہوں پر قدغن لگانے کی سعی کی اور جدیدیت کا فروغ ہونے لگا- فرانس کے زوال پسند ماڈل بن گئے- بودیر، ملارمے اور کئی دوسرے فرانسیسی شاعروں کے انداز پر اردو میں تخلیق کا نیا سفر شروع ہوا- یہاں یہ کہنے کی شاید ضرورت ہے کہ جدیدیت کا وجودیت سے گہرا رشتہ ہے- وجود افکار میں زندگی کی

لایعنیت پر بڑا زور دیا جاتا رہا ہے- ہائی ڈیگر، پیرس، مارسل، کیکرے گارد، ژاں پال ساترے، البرکامیو اور کئی دوسرے فلسفیوں اور ادبا کے افکار اردو میں داخل ہونے لگے، حالانکہ بنیادی طور پر یہ یوروپی فلسفہ تھا لیکن دوسرے علاقوں میں بھی اس کی توسیع ہوتی چلی گئی- سارترے کی Being and Nothingness بیشتر لوگوں کی نگاہ میں رہی- اس کی کتاب ''نوشیا'' کا بھی ذکر ہوتا رہا- کامیو کی ''Outsider'' نے بھی اثرات ڈالے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے علاوہ کتنے ہی وجودی افکار کے سوتے اردو میں داخل ہوگئے- اس طرح جدیدیت کی تحریک زور پکڑتی چلی گئی- ابہام کی وکالت کی جانے لگی- دروں بینی یا داخلیت کے نام پر انسانی بے بسی کو اور اس کی تنہائی کو مرکزیت حاصل ہوگئی- ابہام اہمال تک پہنچا یہاں تک کہ ادب میں لایعنیت بھی کافی اہم بن کر سامنے آئی- کافکا کی نگارشات نے الگ سے اثرات ڈالنے شروع کیے- سیموئل بیکٹ کی ''Naiting for Yodot'' کے رموز سے بھی آگہی جدیدیت کا مقصد ٹھہری- اس طرح کہ ایڈورڈ البی، ژاژینے، ہیرولڈ پنٹر وغیرہ کی نگارشات اردو شعرا اور ادبا کا مزاج بنانے لگیں- تنہائی کے تصور نے موت کے فلسفے کو بھی مرکزیت دے دی، نتیجے میں اردو ادب عوامی تو نہیں رہا بعض خواص کے لیے بھی اس کی تفہیم مشکل ٹھہری- اس حد تک کہ ۳۰-۳۵ سال گزرنے کے بعد لوگ جس طرح ترقی پسند سے نالاں ہوئے تھے جدیدیت بھی زد میں آنے لگی- حالانکہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آج ترقی پسند کوئی نہیں یا جدیدیت کے ہم نوا موجود نہیں، جس طرح عروج کے بعد زوال ایک لازمی صورت ہے جو یہاں بھی پیدا ہو رہی ہے اور لوگ مابعد جدیدیت سے ہم کنار ہونے کی سعی کر رہے ہیں-

میں یہاں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ترقی پسندی نے بہت سے شعرا اور ادبا کو Icon یا Legend بنا دیا ہے- اسی طرح جدیدیت بھی قد آور شعرا، ادبا اور نقاد سے خالی نہیں، لیکن اب لازماً ان دونوں کا دور ختم ہو چکا ہے-

اب رہا یہ کہ مذہبی تحریروں کے لیے ادب میں کوئی جگہ ہے کہ نہیں- کوئی زمانہ ایسا نہیں رہا ہے کہ ادب میں مذہب کا دخل عمل نہ ہو- چاہے اس کے اظہار کے راستے الگ کیوں نہ

ہوں- ترقی پسند دور میں بھی متصوفانہ افکار کی بازآفرینی کی جاتی رہی ہے اور جدیدیت میں بھی- مذہبی تحریروں کا دخل عمل آج تو کچھ زیادہ ہی ہے- میں اپنے رسالے ''مباحثہ'' میں کچھ خالص مذہبی افکار نعت، حمد یا مناجات کی صورت میں پیش کرتا رہا ہوں- بعض مضامین، افسانوں یا کہانیوں کے بعض عناصر مذہبی افکار سے مملو ہوتے ہیں، اکثر رمزیہ انداز میں- اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مذہبی تحریروں کے لیے ادب میں جگہ نہیں ہے- میں بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ انگریزی کے پہلے شاعر ''کاڈما'' سے لے کر ''ملٹن'' تک اور پھر اس کے آگے بھی- خود ٹی ایس ایلیٹ نہ صرف مذہبی افکار سے متاثر رہا ہے بلکہ اپنی تحریروں میں اس کے ''Fatches'' پیش کرتا رہا ہے- دنیا کے بڑے بڑے رزمیے اور ایپکس میں کتنے ہی مذہبی حوالے ملتے ہیں- اردو میں تصوف کے رموز شاعری کے کل بھی موضوع تھے اور آج بھی ہیں تو کیسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی تحریریں ادب میں جگہ نہیں پا سکتی ہیں- بہت سے خالص مذہبی رسالے نکلتے ہیں جن میں ادبی چاشنی عنقا نہیں- ایسے میں اس شق کی اہمیت کو کبھی کم نہیں کیا جا سکتا-

سوال :- مابعد جدیدیت کی تفہیم کا پیمانہ کیا ہے اور کیا یہ خدا بیزاریت و لاادریت کی ہی ایک قسم ہے؟

پروفیسر وہاب اشرفی :- مابعد جدیدیت دراصل نئی ترقی پسندی ہے- اس کے اکثر مفکر ترقی پسند رہے ہیں، لیکن اس کا پس منظر انسان دوستی، امن اور سکون کی تلاش ہے- نئی مارکسیت میں خدا بیزاری کا کوئی ایسا عنصر نہیں جسے الحاد کی صف میں رکھا جائے- یہاں زور اس بات پر ہے کہ افتراق مٹایا جائے- سکون، چین اور آرام سب کا مقدر ہو- ادب ایسے افکار کی تبلیغ و اشاعت کرے- بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ Absense سے گریز یا لامرکزیت کا تصور غیر مذہبی ہے- اگر ایسا ہے بھی تو اس کی یہ حقیقی فکر نہیں- دراصل اس کا موقف اس سچائی کی تلاش ہے کہ انسان اور انسان کی سطح برابر ہو اور کوئی ایسی صورت نہ ابھرے جس کی آڑ میں استحصال سر اٹھانے لگے- لوگ مابعد جدیدیت کو Capitalism کی نئی صورت کہنے سے گریز نہیں کرتے- اگر ایسا ہوتا تو نو مارکسی ہرگز اس

کے ساتھ نہ ہوتے- پھر ایسا بھی ہے کہ لوگوں نے طاقت اور نئی کالونی کے سلسلے میں استحصالی کارروائی کرنی شروع کر دی ہے- مابعد جدیدیت نوآبادیات کے خلاف ہے- ''سب الٹرن'' کو حاشیے پر رکھنے کے لیے تیار نہیں- لہٰذا یہ کہنا کہ اس کا رشتہ خدا بیزاریت سے ہے، درست نہیں- ہاں اگر مذہب کے نام پر استحصال کیا جائے تو مابعد جدیدیت ضرور اس کی مخالفت کرے گی- لامرکزیت کا تصور بس اتنا ہی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں-

سوال :- مغربی و مشرقی شعریات کی اصطلاحات میں کچھ قدر مشترک بھی ہے؟

پروفیسر وہاب اشرفی :- اس موضوع پر تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل میری یہ کتاب ''مغربی و مشرقی شعریات'' شائع ہو چکی ہے- ناشر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ہے- میں صرف اتنا کہوں گا کہ شعریات میں وہ تمام نظم موجود ہے جسے ہم بلاغت وغیرہ کا نام دیتے رہے ہیں- تشبیہ، استعارے اور دوسری اصطلاحیں جو شعریات کا حصہ ہیں وہ مغرب و مشرق میں موجود ہیں- میری کتاب ''تفہیم البلاغت'' میں اردو کی اکثر اصطلاحوں کا انگریزی بدل تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے- اس کے علاوہ کتنے ہی قدیم اور جدید شعریات کی اصطلاحیں اور افکار ایسے ہیں جو ہر زبان کا اثاثہ ہیں- ہمارے قدیم فن کاروں نے عربی اور فارسی میں جس طرح شعریات کی بحثیں کی ہیں وہ سب مغرب کا حصہ ہو چکی ہیں، اگر میں یہاں یہ کہہ دوں کہ سنسکرت کی بوطیقائی کیفیت پر زبان و ادب کا حصہ ہے تو شاید غلط بات نہ ہوگی- میں طوالت کے خوف سے مثالیں پیش نہیں کر سکتا، لیکن حیرت وہاں ہوتی ہے، جہاں ٹی ایس ایلیٹ کی بعض نئی اصطلاحیں سنسکرت، عربی اور فارسی اصطلاحوں کی شبیہ پیش کرتی ہیں- تفصیل کے لیے میری متعلقہ کتاب دیکھیے-

سوال :- کیا آپ بھی ادب میں گروہ بندی کے قائل ہیں، مختلف ادبی فرقوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

پروفیسر وہاب اشرفی :- میں ادب میں گروہ بندی کی مذمت کرتا رہا ہوں اور کرتا رہوں گا- ادب میں مختلف الخیال لوگ ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے گروہ بندی کا کوئی تعلق نہیں- آج جو صورت حال ہے وہ میرے لیے بہت ناپسندیدہ ہے اور میں نے اس کے تعلق

سے اپنی حالیہ کتاب ''تفہیم فکر و معنی'' میں ایک مضمون قلم بند کیا ہے ''عصری اردو تنقید میں گروہ بندی اور غیر ادبی رویوں کا ارتقاء'' اس مضمون کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، میں نے ایسی فضا کو بے حد سنگین کہا ہے اور بیمار بتایا ہے- یہ مضمون ''شاعر'' میں بھی شائع ہو چکا ہے-

سوال :- کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی طرح ہی آپ کے صاحب زادہ افروز اشرفی بھی انگریزی سے اردو کی طرف رجوع کر لیں گے؟

پروفیسر وہاب اشرفی:- اس کا صحیح جواب تو افروز ہی دے سکتے ہیں- ویسے انہوں نے کئی اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو زیر اشاعت ہے- ان کی انگریزی کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور فی الحال وہ انگریزی میں کوئی ناول لکھ رہے ہیں- اگر وہ اردو کی طرف رجوع کریں اور اس زبان میں کچھ لکھیں تو مزید خوشی ہوگی-

سوال:- کیا آپ اس کی حمایت کرتے ہیں کہ مذہبی تحریروں میں ادبی رنگ اور ادبی تحریروں میں مذہبی روح ہو؟ اگر ہاں تو کیوں؟

پروفیسر وہاب اشرفی:- میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر اچھی، معیاری ادبی تحریروں میں کہیں نہ کہیں مذہبی روح ہوتی ہے- اس لیے کہ مذہب مثبت قدروں کا نام ہے- ایسی قدر سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اگر خالص مذہبی تحریر میں ادبی لوازمات ہوں تو اسے کون ناپسند کرے گا؟ ہاں ادب کے تقاضے میں جمالیاتی احساس کی کارفرمائی یا جسے تخلیقیت کہتے ہیں وہ ہر جگہ ناگزیر ہے- اس لیے اس سوال کے دونوں حصوں کا تعلق مثبت پہلوؤں سے ہے، جن کا انکار کرنے والا ادب کی حقیقی روح سے واقف نہیں اور نہ مذہب کی قدروں سے-

سوال :- ادبیات عالم کے مطالعہ میں آپ کو کیا دقتیں اور دشواریاں پیش آئیں؟ تمام ادبیات کے مطالعے کے بعد اردو ادب کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

پروفیسر وہاب اشرفی:- میرے عزیز! آپ ایک مضمون لکھیں گے یا اس سلسلے میں مطالعہ کریں گے تو آپ کو بہت سی دشواریوں اور دقتوں کا سامنا ہوگا- ادبیات عالم لکھتے وقت جو مشکلیں پیش آئیں اگر ان کی تفصیل میں جاؤں تو پوری ایک کتاب لکھنی پڑے گی- مطالعات کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے بس یہ سمجھئے کہ اللہ نے میری مدد کی اور تمام دشواریاں

سہل ہو گئیں- اب رہی یہ بات کہ تمام ادبیات میں اردو کی پوزیشن کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا بس ہلکا سا اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے، کئی بین الاقوامی زبانیں ہیں، اردو بھی اس راہ پر لگی ہوئی ہے- لیکن ممانعات بہت ہیں- ابھی تو یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں اس کی حقیقی پوزیشن کیا ہے؟ اس کے ساتھ تو مسلسل ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں- میں پہلی بار لندن گیا تھا تو ''ہیتھرو ایئرپورٹ'' پر خالص اردو زبان میں بعض نشریات کو سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا تھا- ویسے اب اردو ہر جگہ بولی اور سمجھی جانے لگی ہے- پھر بھی اسے عالمی ادبی مقام حاصل کرنے میں خاصا وقت لگے گا-

سوال :- کیا واقعی اردو مابعد جدیدیت عالمی مابعد جدیدیت سے پوری طرح خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکتی؟ اگر یہ سچ ہے تو موانع کیا ہیں؟

پروفیسر وہاب اشرفی:- میں نے مابعد جدیدیت کے جواب میں بعض باتوں کے سلسلوں میں پہلے ہی وضاحت کر دی ہے، لیکن یہ سچ ہے کہ ہر تحریک اپنی زبان اور ملک کی ثقافت سے کسی نہ کسی حد تک ہم آہنگ ہوتی ہے- مابعد جدیدیت کے جو غیر مفید پہلو ہو سکتے ہیں یا ہیں وہ ہمارے کام کے نہیں ہیں- اس لیے کہ اخذ و استفادہ کے وقت ہم اپنی زبان کے مطالبات کو پیش نظر رکھیں گے- چاہے وہ عالمی مابعد جدیدیت کے امور ہی کیوں نہ ہوں- میرے خیال میں عالمی صورت واقعہ لسانی و ثقافتی مطالبات کے تقاضے کے تحت نیا مزاج بنا لیتی ہے- مابعد جدیدیت کے ساتھ اردو میں بھی یہ صورت دیکھی جا سکتی ہے-

سوال :- وہ کیا اسباب و عوامل رہے جنہوں نے آپ کو جدیدیت سے نکال کر مابعد جدیدیت کے ائمہ میں شامل کر لیا؟

پروفیسر وہاب اشرفی:- میں نے اپنی مختلف کتابوں میں اس کا اظہار کیا ہے کہ میں ہمیشہ ادب کے حوالے سے نئی روشنی اور نئے آفاق کی تلاش میں رہتا ہوں اور اگر میں کسی ایک دائرے سے دوسرے دائرے کی طرف رخ کرتا ہوں تو وہ میرے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے- مجھے مابعد جدیدیت اور اسلام کے مطالعات میں بھی بڑی یکسانیت نظر آئی- ہاں تصور لامرکزیت نے ہیجانی کیفیت میں مبتلا کیا تھا، لیکن میں اسے منہا کر کے دوسرے

موافق پہلوؤں کی طرف راجع ہوتے ہوئے محسوس کیا کہ مارکسی لادینیت اس نئی مارکسی فیلو سوفی میں منہا ہوسکتی ہے اورلوگوں نے کی بھی ہے- میں جدیدیت کے ان نکات کا علمبردار رہا تھا جنہیں ترقی پسند رد کرکے ادب کی روح سلب کرنے پر اصرار کررہے تھے-مثلاً زندگی کے داخلی امور وغیرہ- ویسے میں جدیدیت کے عروج کے زمانے میں بعض موضوعات کے حوالے سے اس کے ائمہ سے برسرِ پیکار رہا تھا- جو معرکے کی صورت میں چھپ چکا ہے-

سوال: -جمیل جالبی، رام بابو سکسینہ، گیان چند جین کی تاریخ ادب اردو کی موجودگی میں آپ نے اس کی مزید ضرورت کیوں محسوس کی؟

پروفیسر وہاب اشرفی: -جمیل جالبی، رام بابو سکسینہ یا گیان چند جین یا دوسرے ادبی تاریخ لکھنے والوں کی میں قدر کرتا ہوں اوران کی کتابوں سے استفادہ کرتا رہا ہوں، پھر بھی مجھے محسوس ہوا کہ ان کتابوں میں اردو کے کئی عظیم ادبا اور شعرا کا ذکر نہیں ہو سکا- پھر کوئی بھی ادبی تاریخ ایک معینہ مدت پر رک جاتی ہے، آگے نہیں بڑھتی- یہ بُعد سو سال کا بھی ہوسکتا ہے-بعض مورخ ادب قابلِ لحاظ نئے و پرانے شعرا اور ادبا کے اندراج سے گریز کرتے ہیں- علاقائی تعصب بھی بعض جگہ نمایاں ہوتا ہے-لہٰذا میں نے اپنی کتاب کو Update کرنے کی کوشش کی اور نئے لکھنے والوں کو جگہ دینے کا موقف اپنایا ہے- ایسے اندراجات پر اعتراض بھی ہوتا ہے لیکن مجھے اس کی فکر نہیں-

سوال: -ساختیات، پس ساختیات اور متونیت کے پیچ در پیچ مباحث کی حقیقت کیا ہے؟

پروفیسر وہاب اشرفی: -ساختیات ہو یا پس ساختیات یا متونیت یہ سب اصطلاحیں ہیں، جب کوئی نئی اصطلاح سامنے آتی ہے تو اسے قبول کرنے یا رد کرنے میں مباحثے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ لازمی امر ہے، اگر ایسا نہ ہو تو تفہیم کی صورت کیا ہو؟ یہ سب اصطلاحیں ہیں اوران کی حقیقت بس اتنی ہی ہے-

سوال: -مابعد جدید دور کی شاعری ممتاز ہے یا نثر نگاری، موجودہ اردو دنیا کے چند اہم مابعد جدید اہلِ فن کا ذکر کرنا پسند کریں گے؟

پروفیسر وہاب اشرفی: -دیکھیے مابعد جدیدیت بہت عرصے کی ادبی تحریک نہیں ہے- اس کے امتیازات پر روشنی ڈالنے کے لیے بہت سے نکات کو زیر بحث لانا ناگزیر ہوگا- یہاں اس کا موقع نہیں- میں نے ''تاریخ ادب اردو'' میں بعض فن کاروں اور تحریروں کا ذکر کیا ہے- ان کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے- پھر میری کتاب ''مابعد جدیدیت: ممکنات و مضمرات'' بھی دیکھی جاسکتی ہے- لہٰذا میں کوشش کروں گا کہ آپ کے اس سوال کی روشنی میں کوئی تازہ مضمون رقم کروں-

سوال: -قارئین ''جام نور'' کو آپ کا کوئی پیغام یا مجلس ادارت کو کوئی مشورہ؟

پروفیسر وہاب اشرفی: - رسالہ ''جام نور'' مجھے بہت پسند ہے اور میں اسے ایک ہی نشست میں پڑھ لیتا ہوں-گزشتہ شمارے میں پروفیسر حسین الحق کے انٹرویو سے مجھے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں- رسالے میں ایسی کئی چیزیں پڑھنے کے لائق ہیں، جن سے میں استفادہ کرتا ہوں- میں کوئی پیغام یا مجلس ادارت کو کوئی مشورہ دوں، میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا- زیادہ باوقار لوگ اس کام کو سرانجام دے سکتے ہیں-□□□

(شمارہ جولائی ۲۰۱۰ء)